باسمہٖ تعالیٰ

اشاعت خصوصی

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ مطابق اپریل، مئی، جون ۱۹۹۳ء ٭ قیمت شمارہ ہذا =/۲۵

جلد ۷۷
شمارہ ۴ و ۵، ۶

سالانہ بدل اشتراک غیر ممالک سے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کنیڈا وغیرہ سے سالانہ ‎-/۲۵۰ روپے
پاکستان میں ‎-/۱۰۰ "
بنگلہ دیش سے ہندوستانی رقم ‎-/۸۰ "

سالانہ ‎-/۶۰ روپے
فی شمارہ ‎-/۶

فہرست

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرف آغاز	مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی	۳
۲	تصوف ایک تعارف	" اعجاز احمد اعظمی مدرس شیخ العلوم شیخوپورہ اعظم گڈھ	۸
۳	صوفیت ایک تعارف	" اختر امام عادل، دارالعلوم حیدرآباد	۶۶
۴	سلفی تصوف کتاب و سنت کی روشنی میں	" صبغۃ اللہ صاحب بختیاری	۹۲
۵	احسان و سلوک میں حضرت مدنیؒ کا مقام رفیع	" زاہد الحسینی صاحب پاکستان	۱۳۱
۶	باطن کی پاکیزگی اور اسکے اثرات	" مفتی ظفیرالدین صاحب مفتاحی	۱۶۲
۷	سماع، صوفیاء کرام کی نظر میں	" مفتی محمد شفیع صاحبؒ دیوبندی	۱۶۹
۸	تصوف اور صوفیاء کا مقصد حیات	پروفیسر خلیق نظامی صاحب	۱۷۷
۹	بیعت کا مقصد	" " "	۱۹۰
۱۰	ہندوستان کے قدیم اولیاء مشائخ	مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارکپوری	۱۹۳
۱۱	حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ تاریخ کی روشنی میں	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۲۱۸

ختم خریداری کی اطلاع

ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہو گیا ہے اسلئے وی پی نہیں کی جائے گی
پاکستانی حضرات مولانا عبدالستار صاحب مہتمم جامعہ عربیہ داؤ والا
براہ شجاع آباد ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں
ہندوستان اور پاکستان کے تمام خریداران کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے

منیجر

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی

احسان یا بالفاظ متعارف تصوف کیا ہے؟ انسانی روح کا اپنے مطلوب حقیقی سے ملنے کا شدید اشتیاق ؟، تصوف کیا ہے ؟ اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال، شریعت اسلامی اس کی اساس اور قرآن وحدیث اس کا سرچشمہ، چنانچہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی کا بڑے واضح الفاظ میں اعلان ہے کہ:

"ایں راہ کسے یابد کہ کتاب بردست راست گرفتہ باشد وسنت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بردست چپ ودر روشنائی ایں دو شمع می رود تا نہ در مغاک شبہت افتد نہ در ظلمت بدعت"

اس راہ کو وہی پا سکتا ہے جو کتاب اللہ کو داہنے ہاتھ میں اور سنت رسول کو بائیں ہاتھ میں لئے ہو اور ان دونوں چراغوں کی روشنی میں راہ سلوک طے کرے تاکہ گمراہی اور بدعت کی تاریکی میں نہ گرے

حضرت سہل بن عبداللہ تستری جو متقدمین صوفیاء میں امتیازی مقام ومرتبہ کے حامل تھے فرماتے ہیں "اصولنا سبعة اشياء، التمسك بكتاب الله والاقتداء بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم واكل الحلال وكف الاذى واجتناب المعاصي والتوبة واداء الحقوق (التاج المكلل) ہمارے سات اصول ہیں کتاب اللہ پر مکمل عمل، سنت رسول کی پیروی اپنی

ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہونچنے دینا، گناہوں سے بچنا، توبہ و استغفار، اور حقوق کی ادائگی۔

سلطان الہند شیخ معین الدین اجمیری رہ کا یہ مقولہ تاریخ اجمیر میں درج ہے۔

"اے لوگو تم میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ترک کرے گا وہ شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم رہے گا"

حضرت میر سید اشرف سمنانی مدفون کچھوچھا ضلع فیض آباد فرماتے ہیں،

یکے از ہم شرائط ولی است کہ تابع رسول علیہ السلام قولاً و فعلاً و اعتقاداً بود (لطائف اشرفی)

ولی کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے قول، فعل اور اعتقاد میں پیرو ہو

تصوف دراصل وہ رہنما ہے جو سالک کو ہر آن باخبر رکھتا ہے کہ دیکھنا کہیں مقصود نگاہ سے اوجھل نہ ہوجائے وہ ہدایت کرتا ہے کہ جب تو بارگاہ خداوندی میں نماز کے لئے کھڑا ہو اور یہ دیکھے کہ قبلہ رو ہے یا نہیں، جائے نماز اور کپڑے پاک ہیں یا نہیں، تو اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھ کہ تیرا تصور پاک ہے یا نہیں، دل مالک کائنات کی طرف ہے یا نہیں، غرض تصوف ہر ہر قدم پر سالک کو خبردار رکھتا ہے کہ مقصود اصلی خدائے ذوالجلال والاکرام کے خیال سے دل غافل نہ ہونے پائے، ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے تلامذہ نے ان سے سوال کیا کہ آپ بشر حافی رہ کے پاس کیوں جاتے ہیں وہ تو عالم و محدث نہیں ہیں؟ تو امام صاحب نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے واقف ہوں مگر بشر اللہ سے واقف ہیں - عارف ہندی اکبر الہ آبادی مرحوم نے بہت خوب کہا ہے۔

قرآن رہے پیش نظر یہ ہے شریعت ؛ اللہ رہے پیش نظر یہ ہے طریقت

اس حقیقت کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ فقیہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ اے بندے اللہ کا نام لے، اور صوفی بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ کا نام لے مگر اس طرح کہ وہ تیرے دل میں اتر جائے، یعنی صوفی کا کہنا یہ ہے کہ صرف زبان سے اللہ کا نام لینا کافی نہیں ہے، زبان کے ساتھ تیرا دل بھی ذاکر ہونا چاہیے، حاصل کلام یہ نکلا کہ تصوف یا احسان دل کی نگہبانی کا اصطلاحی نام ہے، حدیث جبرئیل میں "ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک" کا جملہ اسی دل کی نگہبانی کی انتہائی بلیغ اور پیغمبرانہ تعبیر ہے، امام العرفا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر جملے سے

احسان یا تصوف کی پوری حقیقت بیان فرمادی ہے کیونکہ راہِ تصوف کے تمام جہد و عمل ذکر و فکر محاسبہ و مراقبہ وغیرہ کا منشاء و مقصد یہی ہے کہ دل مشاہدہ و حضور کی متاعِ عزیز سے ہم کنار ہو جائے

تصوف کی مستند کتابوں مثلاً قوت القلوب از شیخ ابوطالب مکی، طبقات الصوفیہ از شیخ عبدالرحمن سلمی، حلیۃ الاولیاء از ابونعیم اصفہانی، الرسالۃ القشیریۃ از امام قشیری — کشف المحجوب از شیخ علی بن عثمان ہجویری مدفون لاہور، تذکرۃ الاولیاء از شیخ فریدالدین عطارؒ عوارف المعارف از شیخ سہروردی، فوائد الفواد ملفوظات شیخ نظام الدین اولیا، خیرالمجالس ملفوظات شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی، انسان کامل از شیخ عبدالکریم جیلی وغیرہ کے صفحے کے صفحے الٹ جائیے صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملاً بھی کتاب و سنت کی تلقین ملے گی، اور بادثوق ذرائع سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اکابر صوفیاء کے مجاہدات، ریاضات اور مراقبات کی اساس و بنیاد قرآن و حدیث کی تعلیمات ہی ہیں، اور ان کی پاکیزہ زندگیاں اسلام کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں۔

اسلامی تعلیمات میں محبت الٰہی، مکارم اخلاق اور خدمت خلق کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، تصوف کی تعلیمات بھی انھیں ارکان ثلثہ پر مبنی ہیں، تاریخی شواہد کی بنیاد پر بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرات صوفیاء ہی نے اپنی عملی جدوجہد کے ذریعہ ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی و روحانی نظام کو زندہ رکھا، صوفیاء سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا، متکلمین معتزلہ اور حکماء نے صرف دماغ کی آبیاری کی جبکہ صوفیاء نے دماغ کے ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کی اہم ترین خدمت بھی انجام دی اور یہ بات کسی بیان و تشریح کی محتاج نہیں ہے کہ اسلام میں اصلی چیز دل ہے نہ کہ دماغ اگر دل فاسد ہو جائے تو دماغ کا فاسد ہو جانا یقینی ہے، چنانچہ نبی صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ وھو القلب" انسان کے جسم ایک عضو ہے اگر وہ صالح ہو جائے تو سارا جسم صالح ہو جائے اور اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جائے۔ آگاہ ہو جاؤ وہ قلب ہے۔

حضرات علماء کرام نے علمی و نظری دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جبکہ حضرات صوفیاء نے اپنے اعمال و اخلاق اور سیرت و کردار سے اسلام کی صداقت کو مبرہن اور آشکارا کیا اسلئے

تصوف یا طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں تصوف اسلام کا عطر اور اس کی روح ہے۔ لیکن کوئی انسانی تحریک خواہ وہ کتنی اچھی کیوں نہ ہو جب افراط و تفریط عمل و ردعمل کا بازیچہ بنتی ہے تو اس کی شکل مسخ ہوئے بغیر نہیں رہتی، چنانچہ متکلمین نے اسلام کو یونانی فلسفہ کی زد سے بچانے میں بڑی قابل قدر خدمت انجام دی ہیں، لیکن آگے چل کر جب علم کلام کو شکوک و شبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا تو یہی علم کلام مسلمانوں میں ذہنی انتشار برپا کرنے کا سبب بن گیا، یہی حال تصوف کا بھی ہوا کہ تصوف کی ہمہ گیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی دیکھ کر جاہل یا نقلی ارباب غرض صوفیوں کے بھیس میں اس جماعت صوفیہ صافیہ میں در آئے اور اپنی مقصد براری کے لئے شریعت و طریقت میں تفریق کا نظریہ شائع کر دیا، مجاز پرستی قبر پرستی، نغمہ و سرود کو روحانی ترقی کا لازمی جزو بنا دیا اور دنیا پرستی سے گریز کو رہبانیت کی شکل دیدی مگر ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ محققین صوفیاء نے ہمیشہ ان گمراہیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے، اور ان فاسد عناصر کو تصوف سے خارج کرنے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

اس جعلی اور غیر اسلامی تصوف کی بنا پر سرے ہی سے تصوف کا انکار کر دیا جائے اور اسے نوع انسانی کیلئے بمنزلہ افیون بتایا جائے اور الزام عائد کیا جائے کہ تصوف زندگی کے حقائق سے گریز کی تعلیم دیتا ہے اور اس نے مسلمانوں کے قوائے عمل کو مضمحل یا مردہ بنا دیا تو یہ سراسر ناانصافی اور اسلامی تصوف پر ظلم ہوگا۔

بدقسمتی سے خود مسلمانوں کا ایک طبقہ جو براہ راست اسلام اور اسلامی مآثر کا مطالعہ کرنے کی بجائے مستشرقین اور عیسائی مصنفین کے واسطہ اور انھیں کی مستعار عینک سے اسلامی علوم و معارف کو دیکھنے کا عادی ہے، اسلامی تصوف پر اسی قسم کے بیجا اور غلط اعتراضات کرتا رہتا ہے۔ یہ بات حق و صداقت اور انصاف و عدالت سے کس قدر بعید ہے کہ ہدف ملامت تو بنایا جائے اسلامی تصوف کو اور نتائج مدنظر رکھی جائیں غیر اسلامی تصوف کی اسلام کے ان نادان دوستوں نے اپنے اس رویہ سے نہ صرف علم و تحقیق کا خون کیا بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا کو تصوف کی حسنات و برکات سے محروم کر دیا۔

امید ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم کا یہ خصوصی شمارہ مخالفین تصوف کے اڑائے ہوئے گرد کو تصوف کے چہرے سے صاف کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا، ہم نے حتی الوسع اس بات کی کوشش کی ہے کہ مضامین مفید اور معیاری ہوں، ہم اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ تو ناظرین ہی کریں گے، ہمارا ارادہ یہ بھی تھا کہ اس نمبر میں اکابر دیوبند رحمہم اللہ کے احسان وسلوک پر خصوصیت کے ساتھ بحث وتحقیق پیش کی جائے، مگر اپنے ارادہ میں ہمیں کامیابی نہ مل سکی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے علاوہ اکابر کے تصوف پر مقالات فراہم نہ ہو سکے جس کا ہمیں افسوس ہے۔ انشاء اللہ کسی اور موقع پر یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

ظلمت کدۂ ہند میں اسلام کی ضیا پاشیاں

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کرنے والوں میں صوفیا اپنی مرتاضانہ تربیت کے باعث علماء کے مقابلہ میں عوام الناس سے زیادہ قریب تھے، صوفیا اپنے گرد مریدوں کا ایک حلقہ قائم کر لیتے تھے جس میں غیر مسلم بھی شامل ہوتے تھے جنھیں وہ اپنی روحانیت اور انسانیت سے اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے رفتہ رفتہ یہ گرویدگی اسلام قبول کرنے کا سبب بن جاتی تھی، چنانچہ جنوبی ساحل کے موپلوں کو مالک بن دینار کے متوسلین نے اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، گجرات کے بنجاروں کو الحلاج نے، ترچناپلی کے لبیوں کو نثار شاہ نے، کچھ کے میمنوں کو یوسف سندھی نے گجرات کے بوہروں کو عبداللہ خرازی نے، آفریدی پٹھانوں کو ناصر خسرو نے مشرف بہ اسلام کیا، نیز پورے کشمیر کو شرف بہ اسلام کرنے کا سہرا شیخ سید علی ہمدانی کے سر ہے جنھوں نے اپنے ساتھ سات سو مشائخ کو لے کر یہ کارنامہ انجام دیا۔

(ہند و پاک میں اسلامی کلچر ۱۳۲)

ایک تعارف

مولانا اعجاز احمد اعظمی مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپورہ اعظم گڈھ

تمہید شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی نے اپنی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے باب اشراط الساعۃ میں سنن ترمذی کے حوالے سے ایک طویل حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند خاص خاص برائیاں ذکر کی ہیں، جن کے عموم وشیوع کے نتیجے میں دنیا کو سرخ آندھیوں، زلزلوں زمین میں دھنسا دیئے جانے، آسمان سے سنگباری، اور مسلسل حوادث ومصائب کا انتظار کرنا چاہئے یہ کل چودہ امور ہیں، جن میں سے آخری بات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے، ولعن آخر ھذہ الامۃ اولہا امت کے پچھلے لوگ اگلوں کو مورد لعن قرار دیں، گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک امت کے سابقین اولین کو لعنت وملامت کرنا جب کہ بعد والوں کو دین کا علم اور دین کا عمل انھیں اگلوں سے ملا ہے، ایسا ہولناک گناہ ہے جس پر سرخ آندھیاں آسکتی ہیں، زلزلہ آسکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور لوگ اس میں دھنسا دیئے جائیں، یہ بھی اندیشہ ہے کہ صورتیں بگاڑ دی جائیں، حد یہ ہے کہ آسمان سے پتھر بھی برس سکتے ہیں۔

آج قلم و کاغذ اور طباعت واشاعت کے بحرانی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر روز بازار میں نئی نئی کتابیں اور نئے نئے مضامین، نئے نئے افکار سے مالا مال گوناگوں مؤلفین واہل قلم کے قلم سے نکل نکل کر بازار میں آرہے ہیں، غیر مسلموں کی بات نہیں، خود مسلمانوں میں زبان و قلم کی جو بہتات ہے کسی پڑھے لکھے پر مخفی نہیں ہے، یہ کتابیں اور یہ مضامین اگر حقائق پر

مشتمل کتاب وسنت کے ترجمان ہوتے، اسلامی مسائل واحکام کی تشریح وتوضیح کرتے، تب تو کچھ شکایت نہ ہوتی مگر مصیبت یہ ہے کہ جس نے چند حروف پڑھ لئے اور اس کے دماغ میں کچھ سوچنے کی صلاحیت ہے وہ بیتاب ہے کہ کسی طرح اپنے نتائج افکار کو، خواہ وہ بالکل بودے اور عقل وفہم سے بعید ہوں منظر عام پر پیش کرے، ان افکار میں اگر کوئی خوبی ہوتی ہے تو بس یہ کہ وہ نئی تحقیقات سامنے لاتے ہیں جن کا سلف میں ذکر بھی نہ ہو۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ قرآن شریف لوگوں میں عام ہوجائیگا اسے عورتیں بھی پڑھیں گی، مرد اور بچے بھی پڑھیں گے، اس وقت کوئی آدمی سوچے گا کہ میں نے قرآن پڑھ لیا لیکن میری پیروی نہیں کی جاتی، پھر اس پر عمل کا اہتمام کرے گا، تب بھی اس کی پیروی نہیں کی جائے گی، پھر وہ اپنے گھر میں مسجد بنا کر عبادت میں لگ جائے گا، پھر بھی اس کی پیروی نہ کی جائے گی، اب وہ اپنے دل میں کہے گا کہ میں نے قرآن پڑھا اور کسی نے مجھے اہمیت نہ دی کہ میرا اتباع کرتا، میں نے اس پر عمل کیا، پھر بھی میں مقتدیٰ نہ بنا، پھر میں نے اپنے گھر کو مسجد بنا ڈالا تب بھی کوئی میرے پیچھے چلنے والا نہ نکلا، اچھا اب میں نئی تحقیقات اور نئی باتیں پیش کروں گا، ایسی تحقیقات اور ایسی باتیں جو نہ اللہ کی کتاب میں ہوں گی اور نہ انھوں نے اللہ کے رسول سے سنا ہوگا، شاید اس سے میری اہمیت ہو، اور میری پیروی کی جائے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خبردار اس کی باتوں پر دھیان نہ دینا گمراہی ہے۔ (جمع الفوائد ج۱ ص۶۲ بحوالہ دارمی)

ہم دیکھتے ہیں کہ آج یہی جذبۂ تجدد اور ہوسِ مقتدائیت ہے، جو لوگوں کی زبان وقلم سے نئی نئی تحقیقات اور نئی نئی باتیں نکلواتی رہتی ہے۔

پھر یہ بھی بکثرت ہوتا ہے کہ لوگ سرسری طور پر کتب احادیث وتفسیر کی ورق گردانی کرکے ہمہ دانی کے زعم میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ان سے جو کچھ اپنی استعداد کے مطابق الٹے سیدھے مطالب اخذ کرلیتے ہیں ان کو اسلاف کی کتابوں اور ان کی زندگیوں میں تلاش کرنے لگتے ہیں اور جب وہ اپنی فہم کے لحاظ سے ان کے مطابق نہیں پاتے یا کچھ کم وبیش دیکھتے ہیں تو ان پر زبان طعن دراز کرنے لگتے ہیں۔

یہ بات ہم علم و عمل کے ہر شعبے میں بہت عرصے سے دیکھ رہے ہیں لیکن اس باب میں مطعون تر اور مظلوم تر جو شعبہ ہے وہ احسان و سلوک کا شعبہ ہے جس کا اصطلاحی نام "تصوف" ہے، اور جس گروہ پر سب سے زیادہ مشق ستم کی جاتی ہے وہ صوفیہ کا گروہ ہے، تصوف سے بڑھ کر کوئی بدعت نہیں اور صوفیہ سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں، یہ نے ادھر چند برسوں سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ جن حلقوں میں تصوف کل تک سرمایۂ افتخار اور وجہ سعادت تھا، جس کے حصول کے بغیر آدمی کی دینی شخصیت ناتمام اور ادھوری سمجھی جاتی تھی، آج انھیں حلقوں کے افراد اس کے نام اور نسبت سے شرمانے لگے ہیں، کل تک جن بڑوں نے تصوف کے ذریعہ اپنی شناخت پیدا کی تھی آج انھیں کے چھوٹے اسے باعث ننگ سمجھنے لگے ہیں، اولین سابقین کو تو چھوڑیے قرون متاخرہ میں کون نہیں جانتا کہ کم از کم اسی برصغیر ہند و پاک میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی اور ان کی اولاد و احفاد حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد، نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے نامور صاحبزادگان اور روحانی و معنوی اخلاف یہ سب حضرات نہ صرف یہ کہ تصوف اور صوفیہ کے علم و عمل کے ذوق آشنا تھے بلکہ اس کے زبردست داعی اور وکیل بھی تھے، ان کی زندگیوں سے تصوف نکال لیجئے تو ان کے کمالات کی روح فنا ہو جائے گی، پھر ان کے بعد علماء دیوبند کے اساطین مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کی ساری زندگی تصوف ہی کے محور پر گردش کرتی رہی، ان کے کمالات کا ہر معقول شخص کو اعتراف ہے، لیکن ستم ظریفی کی حد ہے کہ جن ذرائع سے یہ اکابر کمالات کو پہونچے اور جس کو انھوں نے ہمیشہ اپنے لئے باعث سعادت سمجھا اور جس سے ایک لمحہ کے لئے جدا ہونا پسند نہیں کیا اسی کو ان کے بہت سے اخلاف مٹانے پر تلے ہوئے ہیں

غلط فہمیاں تصوف کے سلسلے میں غلط فہمیوں کی لمبی زنجیر ہے جس میں وہ لوگ بھی گرفتار ہیں جو اس کے منکر ہیں، اور وہ لوگ بھی جو اس کے قائل و معترف ہیں، جو لوگ تصوف کے قائل ہیں ان کی غلطی یہ ہے کہ بہت سے وہ امور جو اس فن میں مطلوب و مقصود نہیں ہیں انھیں عین امور و مقصود سمجھ رکھا ہے، اور ان میں ایسا غلو کئے ہوئے ہیں کہ گویا اگر انھیں ترک کر دیا گیا یا کسی دینی مصلحت کی خاطر ان میں تغیر و تبدل کر دیا جائے تو تصوف ہی کا خاتمہ ہو جائے گا، اور بعضوں نے تو حد ہی کر رکھی ہے کہ اس کو شریعت سے الگ کوئی چیز

سمجھتے ہیں، اور منکرین کی غلط فہمی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی نے خواہ وہ کتنا ہی ناتمام شخص ہو تصوف کے نام سے پیش کردی اسے تصوف سمجھ کر قرآن وسنت کے معیار پر پرکھنے لگے اور انھیں مطابق نہ پاکر پورے تصوف ہی کا انکار کردیا، حالانکہ جس طرح ہر جماعت میں معتبر اور غیر معتبر افراد ہوتے ہیں اسی طرح صوفیہ میں بھی دونوں طرح کے افراد ہیں، پس اس باب میں ہمیشہ انھیں کا ارشاد معتبر ہوگا جو تصوف کے محققین ہوئے ہیں، ہر وہ شخص جو اپنا شمار صوفیہ میں کرتا ہو اس کی بات معتبر نہ ہوگی، خود محققین صوفیہ نے ان کا رد کیا ہے اسلئے یہ کسی طرح مناسب نہیں غیر محققین افراد کے اقوال کو تصوف اور صوفیہ کے سر تھوپ کر تصوف کا انکار کیا جائے۔ اور بعض لوگوں نے —— اور ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے) —— تصوف کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا، حقائق کو پہچانا نہیں، رسوم کو تصوف سمجھ لیا اور غلط فہمیوں میں پڑ گئے۔

اس مقالہ میں قصد یہ ہے کہ تصوف کی حقیقت، اس کے مقاصد، اس کے مبادی و ثمرات، نیز احوال صوفیہ پر اس طرح روشنی ڈالی جائے کہ اصل حقیقت واضح ہوجائے غلط فہمیاں دور ہوجائیں اور کام کرنے والوں کی ہمتیں تازہ ہوجائیں، دلوں سے افسردگی دور ہوجائے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کے آغاز میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی ایک عبارت نقل کردی جائے، جس میں انھوں نے نہایت ایجاز وبلاغت کے ساتھ شریعت اسلامی کا مکمل تعارف پیش کردیا ہے، شاہ صاحب کی مشہور تالیف تفہیمات الٰہیہ ہے اس کے پہلے حصہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

ومعظم مادعت الیٰ اقامته الرسل امور ثلٰثة تصحيح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازاة وغيرها وقد تكفل بهذا الفن اهل الاصول من علماء الامة شكر الله مساعيهم وتصحيح العمل فی الطاعات المقربة والارتفاقات الضرورية على وفق السنة وقد تكفل بهذا الفن فقهاء الامة فهدى الله بهم كثيرين واقام بهم فرقة عوجاء۔

وتصحيح الاخلاص والاحسان الذين هما اصلا الدين الحنيفی الذی ارتضاه

الله لعباده. قال تبارك وتعالى وما امروا الا ليعبدوا الله مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلوٰة ويؤتوا الزكوٰة وذلك دين القيمة. وقال، ان المتقين فى جنٰت وعيون اٰخذين ما آتاهم ربهم انهم كانوا قبل ذلك محسنين كانوا قليلا من الليل ما يهجعون وبالاسحار هم يستغفرون وفى اموالهم حق للسائل والمحروم وفى الارض آيات للموقنين وفى انفسكم افلا تبصرون

وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم انما الاعمال بالنيات وقال فى جواب جبرئيل الاحسان ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔

والذى نفسى بيده هذا الثالث ادق المقاصد الشرعية ماخذا واعمقها محتدا وهو بالنسبة الى سائر الشرائع بمنزلة الروح من الجسد وبمنزلة المعنى من اللفظ وقد تكفل به الصوفية رضوان الله عليهم فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوى وحازوا السهم الاعلى فلله درهم ما اعم نفعهم واتم نورهم (تفهيمات الٰهيه ص ۱۷)

ترجمہ:۔ اور حضرات انبیاء نے جن امور کی اقامت کی جانب دعوت دی ہے ان میں اہم اور بنیادی تین باتیں ہیں۔

(۱) مبداء اور معاد نیز جزا و سزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا اس فن کی ذمہ داری علماء امت میں سے اہل اصول یعنی متکلمین پر ہے اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی مشکور فرمائے۔

(۲) خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرانے والی طاعات اور ضروری معاملات و ارتفاقات کے سلسلے میں سنت کے مطابق عملدرآمد کی تصحیح اس فن کی ذمہ داری فقہاء امت نے لی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی اور ان کے واسطے سے بہت سے کجرو فرقوں کو درست کیا۔

(۳) اخلاص اور احسان کی تصحیح کہ یہی دونوں اس دین حنیف کی بنیاد ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا، حق تعالیٰ فرماتے ہیں، اور نہیں حکم دیا ان لوگوں کو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اس طرح کہ عبادت کو خاص اسی کے لئے کرنے والے ہوں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی طریقہ ہے ان درست مضامین کا۔

اور فرمایا کہ بیشک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے، ان کے رب نے ان کو جو کچھ عطا کیا ہوگا وہ اس کو لے رہے ہوں گے، وہ لوگ اس کے قبل نیکوکار تھے، وہ لوگ رات کو بہت

کم سوتے تھے، اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے اور ان کے مال میں سائل اور غیر سائل کا حق تھا۔ اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، اور خود تمہاری ذات میں بھی تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا۔ اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے، اور حضرت جبرئیل کے سوال کے جواب میں کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان اس کو کہتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اور قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ تیسری قسم از روئے ماخذ کے تمام مقاصد شرعیہ میں دقیق اور باعتبار اصل کے سب سے زیادہ گہری ہے، اور شریعت کے تمام احکام کے مقابلہ میں ایسی ہے، جیسی روح جسم کے مقابلہ میں اور اس فن کی کفالت حضرات صوفیہ صافیہ رحمہم اللہ نے فرمائی، چنانچہ یہ حضرات پہلے خود ہدایت یاب ہوئے، پھر ہادی بنے، خود ہدایت حاصل کی اور دوسروں کو ہدایت دی، خود پیا اور دوسروں کو پلایا، اور سعادت بلند پر فائز ہوئے اور بڑا نصیبہ پایا۔ اللہ ہی کے لئے ان کی خوبیاں ہیں۔ اللہ اکبر ان کی افادیت کتنی عام ہے اور ان کا نور کتنا تام ہے۔

تصوف ایک اصطلاحی لفظ

تصوف کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ تصوف، ایک شرعی مقصد جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے دینی احکام کے لئے بمنزلہ روح کے قرار دیا ہے، اصطلاحی عنوان ہے، عنوان سے بدکنا، اس کو ہدف اعتراض بنانا معقولیت سے بعید ہے۔

بات یہ ہے کہ دور رسالت میں تمام علوم وفنون دینیہ اور تمام اعمال شرعیہ کا سرچشمہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ تھی۔ آپ سے حضرات صحابہ نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق کمالات علمیہ وعملیہ کی تحصیل کی، اور مختلف علوم میں امتیاز پیدا کیا، لیکن اس وقت تک علوم کے لئے الگ الگ عنوانات اور ان کے حاملین کے لئے الگ الگ نام متعین نہ ہوئے تھے۔ آپ کے تمام شاگردوں اور متوسلین کا ایک لقب تھا، یعنی صحابہ، ان کے بعد جو لوگ آئے وہ تابعین ہوئے۔ پھر علوم میں امتیاز اور اس کے واسطے سے ان کے متخصصین میں امتیاز پیدا ہونے لگا، چنانچہ علم حدیث، علم تفسیر، علم فقہ، علم الانساب، پھر علم اسماء الرجال، علم اصول، علم کلام اور مختلف علوم الگ الگ عنوانات سے

ظاہر ہونے لگے، ظاہر ہے کہ یہ تمام علوم سادہ اور ابتدائی شکل میں عہد نبوت میں موجود تھے مگر جوں جوں ان کی تفصیلات مرتب ہوتی گئیں، ان کی تدوین ہوتی گئی۔ ان کے الگ الگ نام متعین ہوتے گئے۔ اور ان کے لحاظ سے ان کے ماہرین کے نام معروف ہوتے گئے۔ تو کیا چونکہ عہد نبوت میں یا عہد صحابہ میں یہ نام اور یہ القاب نہ تھے، اس لئے ان کو بدعت اور محدث قرار دے دیا جائے گا۔ اگر نہیں تو پھر اسم تصوف ہی سے وحشت کیوں ہے؟ ہاں یہ دیکھ لینا چاہئے، اور بغور سمجھ لینا چاہئے کہ جس علم یا جس عمل کا یہ عنوان مقرر ہوا ہے اس کی اصل قرآن وسنت، عہد نبوی اور صحابہ میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر دین کے اس معیار پر تصوف کا مصداق کھرا نہیں ثابت ہوتا تو بے شک یہ لائق رد اور قابل انکار ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اس کے مقاصد واغراض کتاب وسنت سے ماخوذ اور اس کے وسائل وذرائع حد جواز کے اندر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اس بنا پر انکار کر دیا جائے کہ کتاب وسنت میں اس نام کا پتہ نہیں، اگر ایسا وطیرہ عام کر دیا جائے تو بہت سے علوم کو شریعت کے دائرے سے خارج کرنا پڑے گا۔

اس حقیقت کے مان لینے کے بعد اس بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ تصوف کی وجہ تسمیہ کیا ہے، اور اس کا ماخذ اشتقاق کیا ہے؟ خواہ یہ صوف سے مشتق ہو کہ بیشتر اہل تصوف اپنے زہد وقناعت کی وجہ سے موٹے جھوٹے اور سادہ لباس پر اکتفا کرتے تھے، یا صفو سے اسے مشتق مانا جائے کہ تصوف میں صفائے قلب کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ بس اس کے مفہوم اور معنوں پر نگاہ کرنی چاہئے، پھر یہ بھی نہیں ہے کہ اس فن کا بس یہی ایک نام ہو، اہل تصوف نے اسے احسان سے بھی تعبیر کیا ہے، جو خالص حدیث کا لفظ ہے، اسے طریقت بھی کہا ہے، جو شریعت کی پیروی کا راستہ ہے۔ اسے سلوک بھی کہتے ہیں کہ یہ درحقیقت مرضیات الٰہی اور احکام شرع کی رہ نوردی ہے۔

تصوف کی حقیقت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب — تم کہدو کہ بالیقین میری نماز، اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، یہ سب خالص

العالمین لاشریک لہ و بذلک امرت و انااول المسلمین۔ (سورہ انعام)

اللہ ہی کے لئے ہے، جو مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے، اور میں سب ماننے والوں میں پہلا ہوں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

و ماامروا الا لیعبدوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ و ذلک دین القیمہ۔ (سورہ بینہ)

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ اسی کے لئے خالص رکھیں دین کو یکسو ہو کر، اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں، اور یہی طریقہ ہے درست مضامین کا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون۔ (سورہ ذاریات)

میں نے جن وانس کو محض اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

یاایہا الذین اٰمنوا اذکروا اللّٰہ ذکراکثیرا وسبحوہ بکرۃ واصیلا۔ (سورہ احزاب)

اے ایمان والو! اللہ کو بہت کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بیان کرو۔

اس نوع کے مضامین قرآن پاک میں جابجا بیان ہوئے ہیں۔ ان آیات پر غور کرنے سے حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) انسان اور جنات کی تخلیق کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت ہے۔

(۲) عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہونی چاہئے، اس میں کسی غیر کی شرکت نہیں ہونی چاہئے۔ حتیٰ کہ حظ نفس کے بھی شائبہ سے پاک ہونی چاہئے۔

(۳) عبادت اور بندگی کا یہ خلوص ساری زندگی میں جاری وساری رہنا چاہئے، عبادت کے جو متعینہ طریقے اور اوقات ہیں، وہ تو ہیں ہی، ان کے علاوہ زندگی کا ہر ہر لمحہ ہر

حرکت وسکون، اور ہر قول وفعل للّٰہیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہونا چاہئے۔ زندگی بھی اسی ذاتِ برحق کے لئے، اور موت بھی اسی محبوب حقیقی کے لئے ؎

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم وبزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم واز برائے تو زیم (۱)

میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کی محبت میں زندہ رہوں، مٹی ہو جاؤں، اور آپ کے پاؤں کے نیچے زندگی بسر کروں، مجھ خستہ کا مقصود ساری کائنات میں بس آپ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے لئے مروں اور آپ کے لئے جیوں۔

آپ تصوف کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں جو معتبر ائمہ صوفیہ نے لکھی ہیں، پڑھ جائیے۔ ان کے اقوال وفرمودات پر نظر ڈال لیجئے، ان کی زندگیوں کا مطالعہ کر لیجئے، سب کا حاصل اور خلاصہ یہی نکلے گا کہ اللہ کی عبادت ہو، خلوص اور یکسوئی کے ساتھ ہو، اور پوری زندگی اس کی بندگی وطاعت کے سانچے میں ڈھل جائے، بس بندہ کی تمام تر کوشش یہی ہو۔

اس جگہ حضرات صوفیہ کی تالیفات سے ایسے اقوال وعبارات نقل کئے جا سکتے ہیں، جو مذکورۂ بالا مضمون کی دلیل ہوں، مگر اس کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ بات ایسی عیاں اور معروف ہے کہ اس کے لئے کسی حوالے کی ضرورت نہیں۔ تصوف کا ماحصل اور صوفیہ کی ساری تگ ودو کا حاصل بس یہی ہے کہ زندگی وموت کا محور رضاء باری تعالیٰ ہو جائے۔

یہاں ایک لمحہ غور کیجئے، جو کچھ تصوف کا مقصود ذکر کیا گیا ہے، جس پر تمام صوفیہ کا اتفاق

---

(۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء راوی ہیں کہ ان کے شیخ، شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ، ایک رات خاص حال اور خاص کیفیت میں حجرۂ عبادت میں ٹہلتے تھے، اور یہ رباعی نہایت درد وسوز کے ساتھ پڑھتے اور سجدے کرتے تھے۔ کم وبیش ایک ہزار سجدے کئے تھے۔ ان اللہ والوں کے دلوں میں محبت کی وہ آگ لگی رہتی تھی کہ ان کے پورے وجود کو پھونک کر رکھ دیتی تھی ؎ میں رقص کرتا ہوں مست ہو کر، مجھے وہ اپنا بنا رہے ہیں ۔ جلے گی ان کے سوا ہر اک شے وہ آگ دل میں لگا رہے ہیں ۔ آج ستم ظریف، ان کی نیتوں پر شبہ کرتے ہیں۔ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون۔ (مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی)

ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اصل ایمان سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ درحقیقت یہی ایمان ہے البتہ ایمان میں کبھی اضمحلال آجاتا ہے، اس پر نفسیات کی کدورتیں، اور غفلت کے گرد و غبار چھا جاتے ہیں، معصیت کے امراض اسے ضعیف اور بے جان بنا دیتے ہیں، تو کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کدورتیں، یہ گرد و غبار، اور یہ ضعف و اضمحلال دور کرکے اسے صاف ستھرا، قوی اور جاندار بنا دیا جائے، اسی کوشش اور جد وجہد کو عام اصطلاح میں تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اتباع سنت

یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ ایمان کی دولت ہمیں نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے حاصل ہوئی ہے، ان پر ایمان لانا، ان کو واجب الطاعت ماننا، ان سے قلبی محبت ولگاؤ رکھنا، اور ان سے نقوشِ قدم پر چلنا، ایمان میں داخل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کے اتباع کے بغیر اگر کوئی شخص چاہے کہ رضاء باری تعالیٰ کو اپنی زندگی کا محور بنائے تو یہ ناممکن ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم۔ (سورہ آل عمران)

تم کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا، اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کر دیگا، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں۔

ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیرا۔ (سورہ احزاب)

تمہارے واسطے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے اس شخص کے لئے جو اللہ کی اور یوم آخرت کی توقع رکھتا ہے، اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی رضاء و محبت ہے، لیکن اس کا طریقہ سرکار نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اطاعت ہے۔ پس انسان کی ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اپنے کو نبی کے نقش قدم پر ڈال دے، اقوال و اعمال، افکار و نظریات،

اعتقادات وجذبات، سیرت وکردار، ہر اعتبار سے ٹھیک ٹھیک نبی کا پیرو ہو، اس کے ساتھ یگانگت اور اتحاد پیدا کرے ورنہ کچھ نہ حاصل ہوگا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا توان رفت جز بر پئے مصطفٰے

سعدی! یہ بات محال ہے کہ حق کا راستہ بجز مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے اور کسی طرح چلا جا سکتا ہو۔

سعدی علیہ الرحمہ صوفیہ کے مستند ترجمان ہیں، تمام صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیوی واخروی تمام سعادات دامن مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہیں۔ اس کے بغیر سب ہیچ ہے۔

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ جن کا مقام جماعت صوفیہ میں بہت بلند ہے، وہ اپنے مکتوبات میں بار بار نہایت تاکید اور شد ومد کے ساتھ اتباع سنت کی ترغیب دیتے ہیں، اپنے ایک مکتوب میں اپنے مرشد گرامی خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ کے فرزند خواجہ محمد عبداللہ کو تحریر فرماتے ہیں کہ

نصیحتے کہ بہ فرزندی اعزی ولسائر احبہ نمودہ می آید اتباع سنت سنیہ است علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ واجتناب از بدعت نامرضیہ . . . سعادتمند کسے است کہ دریں غربت احیائے سنتے از سنن متروکہ نماید واماتت بدعتے از بدع مستعملہ فرماید۔ ایں آں وقت است کہ ہزار سال از بعثت خیر البشر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام گزشتہ است، علامات قیامت پرتو انداختہ است وسنت بواسطۂ بعد عہد نبوت مستور شدہ است وبدعت بعلت انتشار کذب جلوہ گر گشتہ شاہبانے باید کہ نصرت فرماید وہزیمت بدعت نماید..... ہمگی ہمت وتمامی نہمت متوجہ آں باید کہ ترویج سنتے از سنن نمودہ آید ورفع بدعتے از بدع کردہ شود۔ (مکتوب ۲۳ دفتر دوم ص۵۸)

ترجمہ: نصیحت جو فرزند عزیز اور تمام دوستوں کو بطور خاص کی جاتی ہے، وہ سنت سنیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تابعداری، اور بدعات ناپسندیدہ سے کلی اجتناب کی ہے۔۔۔ وہی شخص سعادت مند ہے، جو اسلام کی غربت کے اس دور میں، متروکہ سنتوں میں سے کسی

سنت کو زندہ کرے، اور جاری بدعات میں سے کسی بدعت کو ختم کرے۔ یہ وہ وقت ہے کہ حضرت خیر البشر علیہ الصلوۃ والسلام کی بعثت پر ایک ہزار برس گذر چکے ہیں، قیامت اپنا سایہ ڈال رہی ہے، عہد نبوت سے بعد کی وجہ سے سنتیں پوشیدہ ہو رہی ہیں، اور کذب کی شیوع کی وجہ سے بدعات جلوہ گر ہو رہی ہیں، کوئی شاہباز چاہیئے جو سنت کی نصرت کرے، اور بدعات کو شکست دے، پوری توجہ اور اہتمام سے اس پر متوجہ ہونا چاہیئے کہ کسی سنت کی ترویج ہو اور کسی بدعت کا خاتمہ ہو۔

خلاصہ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات صوفیۂ کاملین اور مشائخ محققین کے نزدیک تصوف کا حاصل یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کامل، اس کے واسطے سے حق تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو، یہی تصوف کی روح ہے، اور اس کی غایت ہے، اگر یہ بات کسی کو حاصل ہو تو اس نے تصوف کی روح پالی، خواہ وہ اس نام سے آشنا نہ ہو، اور جو اس سے محروم رہا اس کو تصوف سے کوئی تعلق نہیں، خواہ اس کو تصوف کی تمام اصطلاحیں ازبر ہوں، خواہ وہ تمام رسوم تصوف کو ادا کرتا ہو، اور خواہ وہ خود کو زمرۂ صوفیہ میں شمار کرتا ہو۔

یہاں تک تصوف کی حقیقت اور اس کے مقاصد کے سلسلے میں اجمالی گفتگو کی گئی ہے اب مناسب یہ ہے کہ اس سلسلے میں قدرے تفصیلی بات بھی ہو جائے، تاکہ تصوف کے متعلق لاعلمی یا غلط فہمی کی وجہ سے جو شکوک و شبہات عموماً دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا تصفیہ ہو جائے، نیز اس باب میں علماء دیوبند۔ جو سلسلۂ تصوف کے مجدد ہوئے ہیں۔ کا موقف بھی واضح ہو جائے۔

دین میں تصوف کا مقام

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو انسانی زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کی رہنمائی کرتا ہے، ولادت سے لے کر موت تک، جتنے اور جن احوال سے آدمی گزرتا یا گزر سکتا ہے، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، خرید و فروخت، معاملات و اخلاق، دوستی و دشمنی، نکاح و طلاق، سیاست و حکومت، عبادت و اطاعت، غرض ہر شعبۂ حیات کو اپنی کامل گرفت میں رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ شریعت اپنے

آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔ اس طریقۂ حیات کے علاوہ اور کوئی دستورالعمل معتبر اور لائق قبول نہیں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين. (سورہ آل عمران)	اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا طالب ہوگا، تو وہ مقبول نہ ہوگا، اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

پوری شریعت اور پورے دین پر غائرانہ نظر ڈالئے تو اصولی طور پر شریعت پانچ اجزا پر مشتمل نظر آتی ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ارشاد فرماتے ہیں کہ

"غور سے سن لیجئے، دین کے پانچ اجزا ہیں، ایک جز تو عقائد کا ہے کہ دل سے اور زبان سے یہ اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے، وہی حق ہے۔

دوسرا جز عبادات ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔

تیسرا جز معاملات ہیں، یعنی احکام نکاح وطلاق، حدود وکفارات، بیع وشرا، اجارۂ وزراعت وغیرہ، اور ان کے جز دین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت یہ سکھلاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں فلاں چیز کی کرو، بلکہ ان میں شریعت یہ بتاتی ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرو، زیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع اور جھگڑے کا اندیشہ ہو غرض جواز و عدم جواز کا بیان کیا جاتا ہے

چوتھا جز معاشرت ہے، یعنی اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا، مہمان بننا، کسی کے گھر پر جانا کیونکر چاہئے اس کے کیا آداب ہیں، بیوی، بچوں، عزیزوں، اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیونکر برتاؤ چاہئے۔

پانچواں جز تصوف ہے جس کو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں۔ آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کے لئے بیوی بچوں (اور دوسرے دنیاوی اور معاشرتی امور) کو چھوڑنا پڑتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے، جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے۔

غرض دین کے پانچ اجزا ہیں، ان پانچوں کے مجموعے کا نام دین ہے، اگر کسی میں ایک جزو بھی ان میں سے کم ہو، تو وہ ناقص دین ہے"(۱)

جس طرح جسم انسانی میں اگر کوئی ایک عضو نہ ہو، یا ناقص ہو تو ایسا شخص حسن وجمال کے معیار پر پورا نہ اترے گا، اسی طرح اگر کسی شخص کی دین داری مذکورہ پانچ اجزا میں سے کسی ایک سے خالی ہو، تو اس میں نقص کا رہ جانا ناگزیر ہے۔

اصلاح نفس کی اہمیت

پھر غور کیجئے، اصلاح نفس یا تصوف، جسے دین کا ایک جز بتایا گیا ہے، بلاشبہ یہ پانچ اجزا میں سے ایک جزہی ہے، مکمل دین نہیں ہے، لیکن اس میں بھی ذرا تردد نہیں کہ یہ ایسا جز ہے، جو باقی اور اجزا کے لئے تکمیل و تزیین کا سامان ہے، اگر نفس کی اصلاح نہ ہو، اور وہ اپنی بہیمت پر قائم رہے، اور شہوات و خواہشات میں ملوث رہے، تو ہو سکتا ہے کہ دین کے باقی اجزا وجود میں آتے رہیں، مگر نفس کے تلوثات کی وجہ سے وہ مکدر ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا:	جس نے نفس کو پاک کرلیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو خراب کر رکھا وہ ناکام ہوا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے

واما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوىٰ فان الجنة هي الماوىٰ	جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس کی خواہش سے روکا۔ اس کا مستقر جنت ہے

حقیقت یہ ہے کہ نفس، انسانی وجود کا وہ جز ہے جس میں بگڑنے اور فاسد ہونے کی استعداد اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا اسے مطلقاً "امارۃ بالسوء" برائی کا حکم دینے والا قرار دیا ہے، لیکن یہی نفس تزکیہ اور طہارت کے قبول کر لینے کے بعد نفس مطمئنہ بن جاتا ہے جس میں دخول جنت کی ندا سننے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے، مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں

(۱) بصائر حکیم الامت ص۱۴۲ بحوالہ وعظ تفصیل الدین۔

نفس آدمی بمنزلہ درختیست کہ بمدد ہوائے شیطانی درذات ایں کس بیخ می گیرد
و محکم می شود، اگر آدمی بتدریج وسکونت بزور عبادت وتقوی وبقوت محبت و
عشق ہر روز آں درخت را بجنباند ہر آئینہ بیخ او سست شود و قابل قلع گردد۔(۱)

آدمی کا نفس ایک درخت کی طرح ہے، شیطانی وساوس کی مدد سے اس میں بیخ پڑتا ہے
پھر وہ درخت بن کر مضبوط ہو جاتا ہے، اگر انسان آہستہ آہستہ سنجیدگی سے عبادت وتقوی کے
زور، اور محبت وعشق الٰہی کی قوت سے روزانہ اس درخت کو ہلاتا رہے گا، تو یقیناً وہ سست
پڑ جائے گا، اور اکھاڑنے کے قابل ہو جائے گا۔

اور جب یہ درخت اکھڑ جاتا ہے، تو آدمی کو احکام الٰہی کی پابندی میں کوئی دشواری محسوس
نہیں ہوتی، بلکہ اس میں شوق وذوق کا اضافہ ہوکر حلاوت ولذت کی ایک جدید کیفیت شامل
ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے پوری زندگی پرلطف اور کیف آفریں ہو جاتی ہے۔

گویا دین کی تکمیل کا مدار اصلاح نفس پر دو طریقوں سے ہے، ایک تو اس طرح کہ وہ
خود شریعت کا ایک جز ہے، وہ نہ ہو تو اس میں ایک جز کی کمی رہ جاتی ہے۔ دوسرے اس
طرح کہ باقی اجزا کی کماحقہ تکمیل بھی اسی جز کے واسطے سے ہے، اس کے نہ ہونے سے ہر جز و
میں کمی واضمحلال کو راہ مل جاتی ہے۔

تصوف کے اجزا

تصوف کوئی علمی اور تحقیقاتی فن نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عملی اور تمرینی
شعبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ مشائخ صوفیہ، مریدین کے قیل وقال
کو پسند نہیں کرتے، فرماتے ہیں کہ کام کرتے رہو، مقصود کام کرنا ہے، کلام کرنا نہیں ہے۔

صوفیہ کے مشہور شارح اور ترجمان خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب نے فرمایا ہے کہ

کامیابی تو کام سے ہوگی ‏ ‏ ‏ نہ کہ حسن کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی ‏ ‏ ‏ فکر کے اہتمام سے ہوگی

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ عمل سے پہلے، اس کا بقدر ضرورت علم ہو، تاکہ اعمال میں غلطی نہ
ہو، اس لحاظ سے، اور دوسرے فنون کی طرح تصوف کے بھی کچھ مبادی ومقدمات، کچھ مقاصد

(۱) نظام تعلیم وتربیت ص ۱۱۵ ج ۲، بحوالہ سیر الاولیاء ص ۲۴۲۔

اور کچھ ثمرات وفوائد ہیں۔ ان میں عمل کے لحاظ سے اصل چیز تو مقاصد ہیں، لیکن ان کے حصول کے لئے کچھ ابتدائی تمہیدات اور بنیادی مقدمات ہوتے ہیں۔ جن کو بروئے کار لائے بغیر مقصد کا حصول نہیں ہوتا، پھر مقاصد کو عمل میں لانے کے بعد ان کے کچھ ثمرات وفوائد حاصل ہوتے ہیں، ان ثمرات میں سے بعض تو مطلوب بھی ہوتے ہیں۔ اور محمود بھی، اور بعض صرف محمود ہوتے ہیں۔ ان کا حصول مطلوب نہیں ہوتا۔ اس کی قدرے تفصیل حکیم الامت حضرت تھانوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

"ہر مطلوب میں کچھ مبادی ہوتے ہیں، کچھ مقاصد، کچھ زوائد وتوابع، اصل مقاصد ہوتے ہیں۔ اور مبادی ان سے مقدم ہوتے ہیں، مگر مقصود بالعرض" (۱)

اور زوائد ان سے مؤخر مگر غیر مقصود ہوتے، اسی طرح اس طریق میں بعض مبادی ہیں، وہ چند علوم ومسائل ہیں، جو موقوف علیہ ہیں بصیرت فی المقصود کے لئے، اور بعض مقاصد ہیں کہ وہی مقصود بالتحصیل ہیں، اور انہیں پر مدار ہے کامیابی و ناکامی کا، اور بعض زوائد ہیں کہ ان کا وجود نہ معیار کامیابی ہے، اور نہ فقدان معیار ناکامی۔

منجملہ مبادی کے امر اول مذکورہ بالا ہے (یعنی چند علوم ومسائل، جو غالباً اعظم المبادی اور انجع المبادی ہیں اور مقاصد اعمال خاص ہیں جو کہ افعال اختیاریہ ہیں جن میں ایک حصہ اعمال صالحہ متعلق بجوارح ہے (یعنی ایسے اعمال جن کا تعلق اعضاء ظاہرہ سے ہے) جن کو سب جانتے ہیں، نماز روزہ حج و زکوٰۃ و دیگر طاعات واجبہ ومندوبہ اور دوسرا حصہ اعمال صالحہ متعلق بقلب ونفس ہے، مثل اخلاص وتواضع وحب حق وشکر وصبر ورضا وتفویض وتوکل وخوف ورجا وامثالہا اور ان کے اضداد کا ازالہ، اور ان اعمال اختیاریہ کو مقامات کہتے ہیں، اور یہی نصوص میں مامور بالتحصیل ہیں (یعنی قرآن حدیث میں ان کے حاصل کرنے کا حکم ہے) اور ان کے اضداد مامور بالازالہ بمعنی الکف والردع ہیں (یعنی افعال مذکورہ کی ضد جو اعمال وافعال ہیں۔ انہیں ترک کرنے کا حکم ہے) اور

---

(۱) مقصود بالعرض کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ چیز مطلوب نہیں ہے، لیکن چونکہ حصول مقصود کے لئے ضروری ہے، اس لئے اس کا برتنا ضروری ہے، مثلاً کھانے کے لئے برتن چولہا بذات خود مطلوب نہیں ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لئے وہ مقصود بالعرض ہے۔

ان اعمال کی غایت تعلق بحق و رضائے حق ہے کہ روح اعظم سلوک و تصوف کی یہی ہے اور زوائد احوال خاصہ ہیں مثل ذوق و شوق، قبض و بسط، صحو و سکر، غیبت و وجد اور استغراق واشباہہا اور یہ امور غیر اختیار یہ ہیں، اعمال مذکورہ پر اکثر ان کا ترتب ہوتا ہے اور گاہ نہیں ہوتا، یہ احوال نہ مامور بہا ہیں اور نہ ان کے اضداد مامور بالازالہ، اگر ترتب ہو جائے تو محمود ہے اور اگر نہ ہو تو مقصود میں کچھ خلل نہیں، اسی لئے کہا گیا ہے کہ المقامات مکاسب والاحوال مواہب (مقامات کو حاصل کیا جاتا ہے، اور احوال عطیۂ خداوندی ہیں)۔

پس خلاصہ یہ ہوا کہ طریق میں تین امر مبحوث عنہ ہیں (۱) علوم جن سے مقصود میں بصیرت حاصل ہوتی ہے (۲) اور اعمال جو کہ مقصود ہیں، اور انہیں کا اہتمام ضروری ہے (۳) اور احوال جو کہ مقصود نہیں ہیں، گو محمود ہیں، ان کے در پے ہرگز نہیں ہونا چاہئے عہ

مقاصد تصوف

تصوف کے مقاصد جن کا اوپر ذکر ہوا، اور جنہیں اصطلاح میں مقامات کہا جاتا ہے، ان کے مطلوب و مامور ہونے میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہو سکتا حضرت تھانوی نے اس کے دو شعبے بیان فرمائے۔ ایک شعبہ وہ ہے، جو اعضائے ظاہرہ سے متعلق ہے، مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ اور دوسری طاعات، ان میں جو کچھ فرض ہے، وہ تو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ البتہ ان میں جو کچھ نوافل ہیں ان کی تکثیر اور ان کا اہتمام مقربین اور اصحاب سلوک کا وظیفہ ہے، لیکن تصوف میں زیادہ اہتمام ان اعمال کا ہوتا ہے، جن کا تعلق قلب سے ہے جن کے حاصل ہونے کے بعد اول الذکر اعمال میں جان پڑ تی ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ

الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب ۔	سنو! بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے، تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے سنو! وہ دل ہے ۔

نماز ہر شخص پڑھتا ہے، لیکن اگر اس میں قلب کا عمل یعنی خشوع شامل نہیں ہے، تو نماز عبادت کا ظاہری ڈھانچہ بن کر رہ جائے گی، اس نماز سے فریضۂ الٰہی از روئے فقہ ظاہری تو اتر جائے گا، مگر اس

عہ بصائر حکیم الامت بحوالہ تربیت السالک ص۲۰۲ ۔

پر اس فلاح کی ضمانت نہیں ہے جس کی طرف اذان میں حی علی الفلاح کہہ کر دعوت دی جاتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قد افلح المومنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون. کامیاب ہوئے وہ مومن جو اپنی نماز میں صاحب خشوع ہیں۔

ہم اس جگہ چاہتے ہیں کہ مقاصد تصوف کی تفصیل بقدر ضرورت کر دیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس تصوف کی مخالفت آج کل ایک فیشن بن گئی ہے وہ انسان کو کن بلندیوں تک پہونچانا چاہتا ہے، اور اس سے محروم ہو کر لوگ کن پستیوں میں جا پڑے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی جماعت علماء و مشائخ دیوبند کے سرخیل ہیں، جو ایک طرف باکمال محدث اور زبردست فقیہ ہیں، تو دوسری طرف اعلیٰ درجہ کے صوفی اور شیخ طریقت بھی ہیں، جن کے فیض صحبت سے علماء ربانیین کی ایک بڑی تعداد وجود میں آئی، اور جن کے انفاس قدسیہ کی برکت سے برسوں کی نہیں بلکہ صدیوں کی جمی جمائی بدعات کا خیمہ اکھڑ گیا، ان کی ایک مختصر تحریر اس موضوع پر عربی زبان میں تذکرۃ الرشید میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم نے نقل کی ہے، اصل عبارت نقل کرنے میں ذرا طوالت ہے، تذکرۃ الرشید میں ملاحظہ فرمالیں، یہاں ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱) **علم صوفیہ**: نام ہے علم دین کا خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی اور قوۃ یقین کا، اور یہی علم اعلیٰ ہے۔

(۲) **حال صوفیہ**: اخلاق کا سنوارنا، اور ہمیشہ خدا کی طرف لو لگائے رکھنا۔

(۳) **حقیقت تصوف**: اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ مزین ہونا، اپنے ارادہ کو ترک کرنا اور بندے کا اللہ تعالیٰ کی رضا میں بالکلیہ محو ہو جانا۔

(۴) **اخلاق صوفیہ**: وہی ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وانك لعلی خلق عظیم. بیشک تم بڑے خلق پر فائز ہو نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے اس پر عمل کرنا۔

صوفیہ کے اخلاق کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) اپنے آپ کو کمتر سمجھنا، اس کی ضد تکبر ہے۔ (۲) مخلوق کے ساتھ لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آنا،

اور خلقت کی ایذاؤں کا برداشت کرنا (۳) نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرنا، غیظ وغضب سے بچنا (۴) ہمدردی اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا، مخلوق پر فرط شفقت کی وجہ سے جس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے حقوق کو اپنے نفسانی حظوظ پر مقدم رکھا جائے (۵) سخاوت کرنا (۶) درگزر اور خطا کا معاف کرنا (۷) خندہ روئی اور بشاشت بشرہ (۸) سہولت اور نرم پہلو رکھنا (۹) تصنع اور تکلف سے پرہیز کرنا (۱۰) خرچ بلا تنگی اور اسراف کے کرنا (۱۱) خدا پر بھروسہ رکھنا (۱۲) تھوڑی دنیا پر قناعت کرنا (۱۳) پرہیزگاری اپنانا (۱۴) جنگ وجدل اور عتاب نہ کرنا، مگر کسی حق کی بنیاد پر (۱۵) بغض وکینہ وحسد نہ رکھنا (۱۶) مال وجاہ کا خواہش مند نہ ہونا (۱۷) وعدہ کی پابندی کرنا (۱۸) بردباری (۱۹) دوراندیشی (۲۰) بھائیوں کے ساتھ موافقت ومحبت رکھنا، اور اغیار سے علیحدہ رہنا (۲۱) محسن کی شکر گزاری اور جاہ کا مسلمانوں کے فائدے کے لئے استعمال کرنا۔

صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر وباطن مہذب بناتا ہے، اور تصوف سارا ادب ہی کا نام ہے (کس ادب کا؟) بارگاہ احدیت کا ادب، اور حق تعالیٰ کے جلال وہیبت کی وجہ سے از روئے حیا، ماسوی اللہ سے اعراض کرنا، حدیث نفس (یعنی ہمہ وقت نفس کی گفتگو میں مشغول رہنا) بدترین معصیت اور ظلمت کا سبب ہے۔ (۱)

غور کر لیجئے، ان مقاصد میں کوئی بات اہلِ ایمان کے لئے نہ مبہم ہے اور نہ اجنبی کہ اسکی تشریح وتعریف ضروری ہو، البتہ قوۃ یقین جس کو مولانا نے علم اعلیٰ سے تعبیر کیا ہے، اس کی قدرے وضاحت کر دینی مناسب ہے۔

قوت یقین

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات از قبیل امور غیب ہیں۔ اور انسان کے ادراک وحواس کی قوت عالم شہود سے متعلق ہے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے اوپر ایسا یقین حاصل ہو، اور اس کے ساتھ ایسا قوی تعلق وارتباط پیدا ہو کہ اس کی وجہ سے مشاہدات کا یقین اور دنیا کی چیزوں کا تعلق مضمحل اور ماند پڑ جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس مادی جسم کے ساتھ جو عناصر اربعہ سے مرکب ہے، ایک غیر مادی چیز بھی جوڑ رکھی ہے جس کا تعلق بنیادی طور پر جسم کے ساتھ

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۲۲/۲۔

کم اور عالم غیب کے ساتھ زیادہ ہے، وہ روح ہے، اور جس طرح محسوس چیزوں کے ادراک و علم کے لئے اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی میں مختلف اعضا بناکران میں احساس کی طاقت رکھدی ہے مثلاً آنکھ میں دیکھنے، کان میں سننے، زبان میں ذائقہ، ناک میں سونگھنے اور کھال میں چھونے کی طاقت رکھدی ہے، اسی طرح عالم غیب کی چیزوں کے ادراک کے لئے اللہ تعالیٰ نے روح کو بھی ایک عضو عطا فرمایا ہے، اور اس میں امور غیبیہ کے ادراک کی قوت ودیعت فرمادی ہے، اس کا نام "قلب" ہے۔

پھر ہر شخص یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ جس حاسہ سے کام لیا جاتا رہے گا، وہ اپنا فریضہ باقاعدہ انجام دیتا رہے گا، اور جس حاسہ کو معطل کردیا جائے، رفتہ رفتہ اس کی طاقت ضعیف ہوجاتی ہے، مثلاً اگر نگاہ کو معطل کردیا جائے، ہمیشہ آنکھ پر پٹی بندھی رہے، اور اس سے کام نہ لیا جائے تو زیادہ مدت نہیں گزرے گی کہ بصارت ضعیف ہوجائے گی، اور ایک عرصہ میں بالکل ہی زائل ہوجائے گی۔

بعینہٖ یہی حال قلب کا بھی ہے، اگر اس کو امور غیبیہ کے ساتھ جوڑے رکھا گیا، اور اس کے موانع کے دور کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس کو غیبی امور کے ساتھ مناسبت قوی ہوتی جائے گی یہاں تک کہ یہ اپنی قوت کی وجہ سے تمام حواس ظاہرہ پر غالب آجائے گا۔

اور غیبی امور کے ساتھ اس کے تعلق کی ترتیب یہ ہے کہ اللہ کا ذکر بکثرت کیا جائے، ذکر کا اصل محل قلب ہے، مگر اس میں ذکر جاگزیں کرنے کے لئے زبان سے کام لینا پڑتا ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ذکر کے دل میں راسخ ہونے سے جو چیزیں مانع ہیں، ان سے علی حسب مراتب اور بقدر ضرورت اجتناب کیا جائے، تاکہ اللہ کی یاد دل میں بیٹھ کر حضوری کی کیفیت پیدا کردے اس مرتبہ میں پہونچ کر آدمی کو یقین کی قوت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایک بار ارشاد فرمایا کہ

> "تمام اذکار و اشغال و مراقبات وغیرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی حضوری ہر وقت میسر رہے، بعض نے اس حضوری کے دو درجے کردیئے ہیں جن

میں ایک یہ ہے کہ اسم ذات مخیلہ (قوت خیال) میں قائم ہو جائے، پھر اسم سے مسمی (یعنی ذات حق) کی طرف بآسانی راستہ مل جاتا ہے (اور یہی دوسرا درجہ ہے) یہ جو بزرگوں نے چلہ وغیرہ کا طریقہ ایجاد کیا ہے، اس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی دوسرا نقش وخیال مخیلہ پر نہ پڑے، مثلاً باہر نکلو تو گھونگھٹ کر کے نکلو کہ کسی کو دیکھوگے تو اس کی صورت کا نقش مخیلہ کو مکدر کر دے گا، جس طرح انسان کو اپنی ہستی کا ہمہ وقت علم ہے کہ "میں ہوں" بس ایسا ملکہ بلکہ یہی علم حق تعالیٰ کے ساتھ رہنا چاہئے، فرق اتنا ہے کہ اپنے تئیں جسم صورت شکل، آنکھ ناک، کان کے ساتھ مشاہدہ کرتا ہے، حق تعالیٰ کو بدوں اس کے مشاہدہ کرے کہ وہ ہے۔ ؎

دور بینا بارگاہ الست　　　غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست (۱)

کے یہی معنی ہیں، اور النہایۃ راجعۃ الی البدایۃ کا یہی مطلب ہے کہ جس طرح نوزائیدہ بچہ جانتا ہے کہ "اللہ ہے" بس یہی قائم ہو جانا سب کچھ ہے۔ انسان کسی وقت اپنی ہستی کو بھی بعض مصروفیت میں فراموش کر دیتا ہے، لیکن یہ فراموشی نہایت خفیف اور کالعدم ہوتی ہے۔

پہلے بزرگ اخلاق سیئہ کو چھڑانے کی محنتیں کرایا کرتے تھے تاکہ یہ کام آسان ہو جائے۔ مگر متاخرین نے خصوصاً ہمارے سلسلے کے بزرگوں نے یہ طریق پسند کیا ہے کہ ذکر اس قدر کثرت سے کرے کہ یہ اخلاق ذکر کے نیچے دب جائیں اور ذکر تمام باتوں پر غالب آجائے۔ (۲)

اذکار واشغال پر مفصل گفتگو تو آگے آرہی ہے، لیکن اس تحریر سے معلوم ہوا کہ مقاصد تصوف میں اعظم مقصد جو علم اعلیٰ ہے، وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی حضوری حاصل ہو جائے، حقیقت کے لحاظ سے خدا تعالیٰ بندے کے ساتھ ہیں۔

---

(۱) حق تعالیٰ کی بارگاہ کے جو دوربین حضرات ہیں، ان کی رسائی بس اسی قدر ہے کہ "وہ ہے" (اس سے زیادہ ان کی بھی رسائی نہیں ہے)۔ (۲) تذکرۃ الرشید ص ۱۲ ج ۲

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وھو معکم اینما کنتم — تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔

بلکہ وہ تو شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید — ہم آدمی کے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔

یہ حقیقت باوجودیکہ ایک امر محکم ہے، مگر انسان اس سے عموماً غافل رہتا ہے، اس غفلت کا علاج "ذکر کثیر" ہے، اور اس کے اثر کرنے کی شرط، موانع کا انسداد ہے، ذکر کثیر کے بعد اس حضوری اور معیت کا راسخ علم بندے کو حاصل ہوتا ہے، اس حضوری کے دو درجے ہیں، اور یہ دونوں درجے الگ الگ استعدادوں کے لئے ہیں، کبھی تو اللہ تعالیٰ کے نام کو ذکر کثیر کے ذریعے انسان کے دل میں، دماغ میں، خیال میں منقش کردیا جاتا ہے، چنانچہ ذاکر کو باری تعالیٰ کے نام کا استحضار کامل حاصل ہوجاتا ہے، یہ پہلا درجہ ہے، پھر اس خیال کو اسم سے مسمی اور ذات کی طرف منتقل کردیا جاتا ہے، یہ دوسرا درجہ ہے، اور یہی اصل مقصود ہے، اور جن کی استعداد اعلیٰ ہوتی ہے، ان کو پہلے درجہ کی حاجت نہیں ان کو براہ راست ذات حق کی حضوری حاصل ہوجاتی ہے۔

مقاصد تصوف پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجئے، ان میں سے کون سی بات قابل اعتراض ہے، جس سے ہمارے بہت سے بھائی بدک رہے ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو حلاوت ایمان[1]، جس کا حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے، اور جو منجملہ انعامات الٰہیہ کے ہے، اس کا حصول انہیں مقاصد کے حصول پر موقوف ہے۔ واللہ الموفق۔

---

(۱) عن انس رضی اللہ عنہ: قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان، من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما و من احب عبدًا لایحبہ الا اللہ و من یکرہ ان یعود فی الکفر بعد ان انقذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یلقی فی النار (بخاری ومسلم) تین باتیں جس میں ہونگی اسے ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی، ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول، دنیا کی ہر شے سے زیادہ اسے محبوب ہوں، دوسرے یہ کہ اگر کسی سے محبت

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

مبادی تصوف

ترتیب کے لحاظ سے مبادی اور تمہیدات کا ذکر پہلے آنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ مبادی کی اہمیت، مقاصد کی اہمیت پر موقوف ہے، کیونکہ مبادی مقصود نہیں ہوتے، حصول مقصود کے ذرائع ہوتے ہیں، مقصد جتنا رفیع اور وقیع ہوگا، اس کے مبادی و مقدمات اسی کے بقدر مہتم بالشان ہوں گے۔ اس لئے پہلے مقاصد پر گفتگو کی گئی۔ مقصد کی عظمت و جلالت کا جب انکشاف ہو گیا، تو ظاہر ہے کہ جن ذرائع سے اس کا حصول ہوگا۔ ان کا بجالانا کس قدر ضروری ہوگا، مقصد تصوف کی تحصیل کے لئے جو ضروری مقدمات درکار ہیں، ان کو ہم تین بنیادی عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) بیعت وصحبت (۲) ریاضت ومجاہدہ (۳) اذکار و اشغال و مراقبات۔

بیعت وصحبت

جہاں تک انسانی طبیعت کا معاملہ ہے، ہر زمانے کے عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسانی طبیعت کے بناؤ اور بگاڑ میں جس قدر صحبت و معیت کا دخل ہے، اتنا کسی اور چیز کو دخل نہیں ہے، یہ ایک ایسا بدیہی اور فطری مسئلہ ہے، جس پر کسی دو شخص کی رائے مختلف نہ ہوگی، قرآن سے، حدیث سے، اقوال علماء سے، حتیٰ کہ عام انسانی افراد سے یہ بات اس قدر محقق ہے کہ اس کے لئے کسی طرح کا ثبوت پیش کرنا تحصیل حاصل

(بقیہ صفحہ گذشتہ) رکھے تو محض اللہ کے واسطے محبت کرے، تیسرے یہ کہ کفر میں لوٹنا اس کے نزدیک آگ میں گرنے کی طرح ہولناک بن جائے، حلاوت ایمان کیا ہے؟ امام نووی اس کا جواب دیتے ہیں۔ استلذاذ الطاعات، طاعات سے لذت یاب ہونا۔ وتحمل المشاق فی رضی اللہ عزوجل ورسولہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی رضامندی کے لئے دشواریوں کو جھیلنا، وایثار ذلک علی عرض الدنیا۔ اور متاع دنیا پر اسے ترجیح دینا۔ ومحبۃ العبد ربہ سبحانہ وتعالیٰ بفعل طاعتہ وترک مخالفتہ وکذلک محبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور بندے کا اپنے رب سے محبت کرنا اس طرح کہ اس کی اطاعت میں سرگرم رہے اور اس کی خلاف ورزی سے بچتا رہے، اور اسی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی محبت رکھے، ہم نے جن مشائخ صوفیہ، جو واقعی تصوف کے صحیح نمائندے تھے کی سیرتوں کا مطالعہ کیا ہے، یا ہمیں ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے پاس اس حلاوت ایمانی کے جتنے نمونے ہم نے دیکھے، کہیں اور دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کثر اللہ امثالہم۔

اور طول لاطائل ہے، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی ساری فضیلت وکمال کا راز اسی ایک بات میں ہے کہ ان کو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ومعیت ایمان وعقیدت کے ساتھ حاصل ہوئی تھی، اگر کسی کو یہ صحبت حاصل نہیں ہے، تو وہ ایمان وعمل کے خواہ کتنے اونچے درجے پر فائز ہو، باتفاق امت اسے کسی صحابی کے مقابل میں نہیں رکھا جا سکتا۔

اللہ تعالیٰ کا دستور یہی ہے کہ جس کسی کو کوئی کمال حاصل ہوتا ہے، وہ کسی صاحب کمال ہی کی صحبت میں حاصل ہوتا ہے، حضرات صوفیہ نے اس اصول کے پیش نظر طریق کا مدار صحبت پر رکھا ہے، لیکن یہ بھی معلوم ومسلم ہے کہ نری صحبت بلا تعلق ومحبت اور بغیر اعتقاد وانقیاد کے مفید وموثر نہیں ہوتی، اس لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی دینی کمال اور تقوی کا حسن وجمال حاصل کرنا ہو، وہ کسی صاحب کمال اور متقی وخوش خصال کو تلاش کرے، اس سے عقیدت ومناسبت ہو، تو اس کی صحبت میں رہے، اس سے علم وعمل سیکھے، اس طریقے سے اسے کمال حاصل ہوتا چلا جائیگا۔

تجربہ یہی ہے کہ جو کچھ کسی کو حاصل ہوا ہے، اسی طریقہ سے حاصل ہوا ہے، دنیاوی علوم وفنون اور اعمال واشغال میں بھی یہی دستور کارفرما ہے، اگر کسی کو تجارت کرنی ہے تو تاجروں کی صحبت میں رہ کر سیکھے۔

صحبت کی تاثیر

مشہور ہے کہ کسی جوہری کا انتقال ہونے لگا، اس کا بچہ ابھی چھوٹا تھا۔ اس نے ایک صندوق میں جواہرات اور انہیں کے ہم شکل اور ہم رنگ پتھر کے ٹکڑے رکھ دیئے۔ اور ایک رقعہ پر وصیت تحریر کی کہ اس صندوق میں جواہرات ہیں اور انہیں کے ہم رنگ پارہائے سنگ رکھے ہوئے ہیں۔ بڑے ہونے کے بعد تم اسے فلاں شخص کے پاس جو میرا دوست اور جوہری ہے، لے جاکر اسے دکھانا، وہ شناخت کرکے تمہیں اصل جواہرات حوالے کردے گا۔ شعور کی عمر کو پہونچنے کے بعد یہ لڑکا صندوق لے کر اپنے باپ کے دوست کے پاس پہونچا، اور اسے وصیت نامہ دکھایا۔ اس جوہری نے وصیت نامہ اور جواہرات اور سنگ ریزوں کو دیکھ کر کہا کہ میں یونہی چھانٹ کر جواہرات تم کو نہیں دے سکتا، اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ میری دکان پر تم پانچ سال تک کام کرو۔ اس نے پانچ سال تک کام

تھا، ان پانچ برسوں میں اسے جواہرات کی مکمل شناخت حاصل ہوگئی، اب اس نے صندوق منگوایا، اور قفل کھول کر کہا کہ اب تم خود پہچان لو، میرا مقصد یہی تھا کہ تم کو یہ معرفت وشناخت حاصل ہوجائے، اگر میں اسی وقت تمہیں دے دیتا تو جواہرات تو تمہیں مل جاتے، لیکن نہ تم کو جواہرات کا علم حاصل ہوتا اور نہ ان کی قیمت معلوم ہوتی، اس حکایت سے صحبت کی اہمیت کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

صحبت کی برکت

حکیم الامت حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل ومکمل ہوا ہے، موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا، حتیٰ کہ بسولہ بھی لبطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدے سے نہ اٹھایا جائے گا بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا، بلا خوش نویس کے پاس بیٹھے، اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز کوئی خوش نویس نہیں ہوسکتا غرض بدوں کامل کی صحبت کے کوئی نہیں بن سکتا۔" (۱)

صحبت صالح ترا صالح کند ۔۔۔ صحبت طالح ترا طالح کند
ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا ۔۔۔ گو نشیند در حضور اولیا
یک زمانہ صحبتِ با اولیا ۔۔۔ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
صحبت نیکاں اگر یک ساعت است ۔۔۔ بہتر از صد سالہ زہد وطاعت است

نیک آدمی کی صحبت تم کو نیک بنا دے گی، اسی طرح بدبخت کی صحبت تم کو بدبخت بنا دے گی، جو شخص خدا کی ہم نشینی کا طالب ہو، تو اس کو اولیاء کرام کی صحبت میں بیٹھنا چاہئے، اللہ والوں کی تھوڑی دیر صحبت سو سالہ طاعت بے ریا سے بہتر ہے، نیکوں کی صحبت اگر گھڑی بھر نصیب ہوجائے تو وہ سو سالہ زہد وطاعت سے بہتر ہے۔

ساعت کا مطلب

کامل کی صحبت میں بعض اوقات کوئی گُر ہاتھ آجاتا ہے، یا کوئی حالت ایسی قلب میں پیدا ہوجاتی ہے، جو ساری عمر

(۱) شریعت وطریقت ص ۴۹، بحوالہ تصوف وسلوک ص ۱۱۱۔

کے لئے مفتاح سعادت بن جاتی ہے، ہر وقت ہر ساعت مراد نہیں ہے بلکہ وہی وقت اور وہی ساعت مراد ہے، جس میں یہ حالت میسر ہو، تاہم ہر صحبت میں اس خاص بات کا احتمال ہے، اس لئے ہر صحبت کا اہتمام کرنا چاہئے، اس سے ہر صحبت کا مفید اور نافع ہونا ظاہر ہے، اور اس حالت کو صد سالہ طاعت کے قائم مقام بتلانے کی ایسی مثال ہے کہ اگر کسی کے پاس سو اشرفیاں ہوں، تو بظاہر اس کے پاس اسباب اور سامان کچھ نہیں ہے، لیکن اگر ذرا تعمق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر چیز اس کے قبضے میں ہے، کیوں کہ اشرفیوں سے اسباب خریدا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو تو بظاہر خاص طاعات میں سے اس کے پاس کچھ نہیں ہے، مگر حکماً ہر چیز ہے۔ (۱)

شیخ کی صحبت میں طالب پوشیدہ طور پر آہستہ آہستہ اپنے اندر اخلاق حمیدہ کو جذب کرتا رہتا ہے، بالآخر وہ اعلیٰ درجہ کا صاحب اخلاق بن جاتا ہے، صحبت نیکاں کے متعلق شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا یہ قطعہ بہت عجیب اور مناسب ہے۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم (۲)

ترجمہ: ایک روز حمام میں ایک محبوب کے ہاتھوں سے ایک خوشبودار مٹی مجھ کو ملی میں نے اس سے پوچھا کہ تو مشک ہے یا عنبر کہ تیری دل آویز بو سے میری طبیعت مست ہوگئی، وہ بولی کہ میں ایک ناچیز اور معمولی مٹی تھی، مگر ایک مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں اسی ہم نشین کے جمال نے مجھ میں اثر کیا ہے، ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں، جو پہلے تھی۔

بیعت حضرات مشائخ اور صوفیہ جب کسی سالک اور مرید کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرتے ہیں تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت کرتے ہیں۔ یعنی پچھلے گناہوں سے توبہ کراتے ہیں، اور آئندہ معصیت نہ کرنے کا عہد لیتے ہیں، اور معصیت ہوجانے کی

(۱) شریعت و طریقت صفحہ ۹۹ (۲) گلستاں۔

صورت میں توبہ کر لینے کا وعدہ کراتے ہیں، نیز اعمال صالحہ پر استقامت اور سنت وشریعت کے اتباع کامل کا معاہدہ کراتے ہیں۔ یہ سارے کام تو خود مرید اور سالک کے کرنے کے ہیں، لیکن انسانی فطرت ہے کہ اپنے کسی عمل پر دوسرے کو گواہ بنالیا جاتا ہے۔ تو اس میں پختگی آجاتی ہے، اور اس کا اہتمام بڑھ جاتا ہے۔ ایک شخص جب اپنے شیخ ومرشد کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے، اور شریعت پر استقامت کا عہد کرتا ہے، تو اس میں بڑی قوت آجاتی ہے۔ بیعت کا یہ طریقہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے یہاں اپنے امتیوں سے بیعت لینے کا عام دستور تھا۔ امام نسائی نے اپنی کتاب میں مختلف امور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیعت لینے کا ذکر فرمایا ہے۔ خود قرآن کریم میں ایمان وعمل صالح پر بیعت لینے کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد ہے۔

یٰایہا النبی اذا جاءك المومنات یبایعنك علی ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینك فی معروف فبایعھن واستغفر لھن اللہ ان اللہ غفور رحیم۔

اے نبی، جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس غرض سے آئیں کہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کسی پر کوئی بہتان نہ باندھیں گی، اور معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان کو بیعت کرلو، اور ان کے لئے اللہ سے استغفار کرو، بیشک اللہ غفور رحیم ہیں۔

یہ تو گناہوں سے اجتناب کے سلسلے میں بیعت ہے، بعض مواقع پر جہاد پر بیعت لینے کا ذکر ہے۔

ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم۔

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔

بیعت کی شکل کیا ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔

عن عوف بن مالك الاشجعى قال كنا عند النبى صلى الله عليه وسلم تسعة أثمانية او سبعة فقال الا تبايعون رسول الله صلى الله عليه وسلم فبسطنا ايدينا وقلنا على ما نبايعك يا رسول الله قال على ان تعبد والله ولا تشركوا به وتصلو الصلوات الخمس وتسمعوا وتطيعوا۔

(مسلم، ابوداؤد، نسائی)

عوف بن مالک اشجعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، نو آدمی تھے یا آٹھ، یا سات آدمی آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرتے، ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کیا کہ کس امر پر بیعت کریں یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، اور پانچوں نمازیں پڑھو اور احکام سنو اور مانو۔

حکیم الامت تھانویؒ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

"حضرات صوفیاء کرام میں بیعت کا معمول ہے، جس کا حاصل التزام احکام (یعنی احکام ظاہری و باطنی پر استقامت) اور اہتمام کا معاہدہ ہے، جس کو ان کے عرف میں بیعتِ طریقت کہتے ہیں، بعض اہل ظاہر اس کو اس بنا پر بدعت کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے۔ صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعتِ جہاد کرنا معمول ہے، مگر اس حدیث میں صریح اثبات موجود ہے، کہ یہ مخاطبین چونکہ صحابہ ہیں، اس لئے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں ہے، کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں ہے، بلکہ بدلالت الفاظ معلوم ہوتا ہے کہ التزام و اہتمام اعمال کے لئے ہے، پس اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں، بعدہ بوجہ اشتباہ بیعت خلافت کے سلف نے صحبت پر اکتفا کیا، پھر خرقہ کی رسم بجائے بیعت کے جاری ہوئی، جب وہ رسم (بیعت) خلفاء میں نہ رہی تو صوفیہ نے اس مردہ سنت کو پھر جاری کیا۔" (۱)

ابتدا میں خلفاء و حکام عامۃ الناس سے بیعت لیا کرتے تھے، یہ بیعت حکومت سے

---

(۱) شریعت و طریقت ص۵۸۔

وفاداری اور تسلیم وانقیاد کی تھی، اس دور میں اگر صوفیہ دست بدست بیعت طریقت لیتے تو صورۃً مشابہت کی وجہ سے خلفاء وحکام کو بدگمانی ہوتی، اور خطرات کا اندیشہ ہوتا، اس لئے حضرات مشائخ نے یہ طریقہ موقوف کر دیا، کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے، صرف صحبت پر اکتفا کیا، پھر بعض حضرات نے بطور علامت کے بجائے بیعت کے خرقہ دینا تجویز کیا، جو اس بات کی نشانی ہوتی کہ اس شخص کو فلاں بزرگ کی خدمت وصحبت حاصل ہے، بعد میں بیعت کا دستور خلفاء نے ختم کر دیا، تو مشائخ نے پھر وہی قدیم سنت تازہ کر دی۔ (۱)

بیعت کی ضرورت

یہ بات یقینی ہے کہ بیعت کی ضرورت اس درجہ عام نہیں ہے کہ ہر شخص کو اس کا پابند قرار دیا جائے، بہت سی سلیم طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ خود بخود نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور مختلف اسباب وعوامل سے ان کے اندر تقویٰ ودیانت کا رجحان متعین ہو جاتا ہے، ایسے لوگ اگر بیعت نہ ہوں تو مضائقہ نہیں، لیکن عام انسانی طبائع کو دیکھتے ہوئے، اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے، امت کے حکیم حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:

"نفس میں بعض خفیہ امراض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بدوں تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے، اور اگر سمجھ میں آ بھی جاتے ہیں، تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا، اور جو معلوم ہوتا ہے تو نفس کی کشاکشی سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے، ان ضرورتوں سے پیر کامل تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے، ان کا علاج وتدبیر بتاتا ہے، کیونکہ خود اپنی حالت کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا، اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے۔" (۲)

عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ کوئی کمال بدوں استاذ کے حاصل نہیں ہوتا، تو جب اس راہ طریقت میں آنے کی توفیق ہو، تو استاذ طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہئے، جس کے فیض تعلیم وبرکت صحبت سے مقصود حقیقی تک پہونچے۔

---

(۱) یہ مضمون القول الجمیل مولفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی میں بھی مفصل بیان کیا گیا ہے۔

(۲) ...شا...ط لق... ص ۶۰ کے اا انفاس عیسیٰ، وقصد السبیل، وعظ الباطن۔

گرہوائے ایں سفرداری دلا دامن رہبر بگیر و پس بیا
بے رفیقے ہرکہ شد در راہ عشق عمر بگزشت و نشد آگاہ عشق

اے دل اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ کر پیچھے پیچھے آؤ اس لئے کہ جو بھی عشق کی راہ میں بغیر رفیق کے چلا، اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہو سکا۔(۱)

شیخ کامل بیعت و صحبت کی اہمیت و ضرورت ثابت ہو جانے کے بعد ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سالک مطمئن ہو جائے اور اس کی صحبت و تعلیم سے تقویٰ کی راہ طے کرے۔ ضرورت ہے کہ اس کے واسطے اعلیٰ درجہ کا دین دار و متقی اور صالح و مصلح تلاش کیا جائے کیونکہ صحبت و بیعت کی تاثیر بیان کی جا چکی ہے، حدیث شریف میں ہے۔

عن ابی هريرة قال، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: المرء على دين خليله فلينظر احدكم من يخالل۔(۲)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے، سو ذرا دیکھ بھال لینا چاہئے کہ کس کے ساتھ دوستی کرے۔

جب معمولی دوستی کے اندر یہ اثر ہوتا ہے، تو شیخ اور استاذ سے تو اعلیٰ درجہ کی محبت ہوتی ہے، اس کا کیا کچھ اثر ہوگا، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جس کے ساتھ جس قدر محبت و عقیدت ہوتی ہے، اسی اعتبار سے اس کے اعمال و اخلاق کا اثر جلد اور محکم طور پر سرایت کرتا ہے، اگر خدانخواستہ پیر کا حال بہتر نہیں ہوا تو اس کے حال کی خرابی مرید میں بھی آئے گی، اس لئے تلاش مرشد میں بہت احتیاط کرنی چاہئے۔ ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے۔

شیخ کامل کی علامات مشائخ محققین نے شیخ کامل کی کچھ علامات ذکر کی ہیں جن کو دیکھ کر شیخ کامل کو پہچانا جا سکتا ہے، حضرت تھانویؒ نے ان علامات کو اس طرح تحریر کیا ہے۔

---

(۱) شریعت و طریقت صفحہ ۶۲ بحوالہ تعلیم الدین۔ (۲) ابوداؤد و ترمذی۔

(۱) علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو، خواہ تحصیل سے، خواہ صحبت علماء سے تاکہ فساد عقائد و اعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے ورنہ مصداق ؎

او خویشتن گم است کرا رہبری کند کا ہوگا۔

(۲) عقائد، اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔

(۳) تارک دنیا، راغب آخرت ہو، ظاہری و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔

(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔

(۵) بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو اور ان سے فیوض و برکات حاصل کیے ہوں۔

(۶) تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو، اور ان کی بری بات سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو، یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔

(۷) جو لوگ اس سے بیعت ہوں، ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو۔

(۸) اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

(۹) بہ نسبت عوام کے، خواص یعنی فہیم و دین دار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

(۱۰) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

(۱۱) خود بھی ذاکر و شاغل ہو، کیونکہ عمل یا عزم عمل کے بغیر تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

(۱۲) مصلح ہو نرا صالح ہونا کافی نہیں ہے، شیخ ہونے کے لئے دونوں کے جمع کی ضرورت ہے کہ صالح بھی ہو اور مصلح بھی ہو، تاکہ جو مرض باطنی بیان کرے اس کو بہت توجہ سے سن کر اس کا علاج تجویز کرے، اور جو علاج تجویز کرے اس سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے اور اس کے اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی جائے۔

جس شخص میں یہ علامات ہوں تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ شخص صاحب تصرفات ہے یا نہیں، یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے یا نہیں، کیونکہ یہ امور لوازم مشیخت یا ولایت سے نہیں ہے، اسی

طرح یہ نہ دیکھے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں، کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی میں سے نہیں ہے، اصل میں یہ ایک نفسانی تصرف ہے، جو مشق سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ کام غیر متقی بلکہ غیر مسلم بھی کر سکتا ہے، اور اس سے چنداں نفع بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے اثر کو بقا نہیں ہوتا، صرف مرید غبی کے لئے جو ذکر سے اصلا متاثر نہ ہوتا ہو چند روز تک شیخ کے اس عمل سے اس میں ایک گونہ تاثر و انفعال و قبول آثار ذکر کا پیدا ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ خواہ مخواہ لوٹ پوٹ ہی ہو جائے (۱)

کچھ ضروری اور مفید ہدایات

اگر کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے، کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ، لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ وہ کامل و مکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا، اسی طرح اگر شیخ کا انتقال قبل حصول مقصود کے ہو جائے یا ملاقات کی امید نہ ہو، جب بھی دوسری جگہ تلاش کرے، البتہ بلا ضرورت محض ہوسناکی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے، اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے، اور شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے، اور نسبت قطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اور ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے۔

شیخ کو سب سے افضل سمجھنا

مشہور ہے کہ اپنے پیر کو سب سے افضل سمجھے ظاہرًا اس میں اشکال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وفوق کل ذی علم علیم۔ ہر صاحب علم سے بڑھ کر دوسرا عالم ہے۔

اتنا سمجھے کہ میری تلاش سے زندہ لوگوں میں اس سے زیادہ نفع پہونچانے والا شخص مجھ کو نہیں مل سکتا۔ (۲)

ریاضات و مجاہدات

اہل تصوف کے یہاں تلاش مرشد کے بعد دوسرا اہم اور ضروری کام ریاضت و مجاہدۂ نفس ہے، اور یہ بات صرف اسی فن کے ساتھ خاص نہیں ہے، آدمی کوئی بھی کمال حاصل کرنا چاہے اسے بہرحال محنت و کوشش

---

(۱) شریعت و طریقت ص۲۹۳ بحوالہ تعلیم الدین۔ (۲) ایضاً۔

کلفت ومشقت اور جگر کاوی اور پتہ ماری سے چارہ نہیں، ایک کاشت کار سے لے کر ایک صاحب قرطاس وقلم تک جسے چاہیں دیکھ لیں، اگر کسی نے کوئی کمال حاصل کیا ہے تو استاذ کی رہنمائی کے بعد وہ مجاہدۂ ومحنت ہی کا ثمرہ ہوگا، راتوں کو جاگنا، دن کو تھکنا، جسم کو مشقتوں کا عادی بنانا، سردی گرمی کی تکالیف کا سہنا، کھانے پینے کے معمولات کا گڑبڑ ہونا کبھی فاقے کی نوبت آجانا، کون سی ایسی مشقت ہے جو کسی اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انسان نہیں برداشت کرتا، تحصیل علم کے لئے علم کے شیدائیوں نے جو مجاہدے کئے ہیں، تاریخ کی داستانیں ان سے جگمگا رہی ہیں، یہ مجاہدہ کسی ایک علم کی خصوصیت نہیں ہے، تمام علوم کا یہی حال ہے، دنیاوی علوم میں اگر کوئی کسی کمال کا طالب ہے، تو اسے بھی محنت ومشقت کا وہی وطیرہ اختیار کرنا ہوگا، جو دینی علوم کے لئے اختیار کیا جاتا ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ہر کام کیلئے مجاہدہ مسلّم، ہر کمال کے لئے تحمل کلفت عین کمال، لیکن اگر صوفیہ قرب خداوندی کیلئے مجاہدہ کا نام لیں تو مورد طعن! یہ کہاں کا انصاف ہے، دوسرے علوم وفنون کے لئے اگر کوئی استاذ اپنے شاگردوں سے محنت ومشقت لیتا ہے، اس کے لئے اپنے تجربے سے کچھ اصول وقواعد اور طریقے متعین کرتا ہے، تو کسی صاحب کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ اصول وقواعد کتاب وسنت اور سلف صالح سے منقول ہیں یا نہیں؟ اس میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ حصول علم کے لئے یہ بات معین ہے یا نہیں، اگر معین ہے تو مضائقہ نہیں کہ وہ طریقہ مسلمانوں سے لیا گیا ہے، یا دوسری اقوام سے، لیکن مقاصد تصوف کو حاصل کرنے کے لئے اگر ضرورت کی بنا پر یا سہولت کے واسطے کچھ تجربہ کاروں نے کچھ مجاہدے یا ریاضتیں تجویز کیں تو فوراً سوال قائم کر دیا جاتا ہے کہ یہ طریقہ کتاب وسنت میں کہاں ہے، سلف صالح نے اس طریقہ پر کب عمل کیا ہے؟ یہ طریقہ تو جوگیوں سے لیا گیا ہے، یہود ونصاریٰ سے لیا گیا ہے؟ وغیرہ ذٰلك من الخرافات۔[1]

(۱) بہت عرصہ سے شور مچایا جاتا ہے کہ تصوف، ہندوؤں کے جوگ کا مثنیٰ ہے، اور صوفیوں نے جوگیوں سے اعمال واشغال حاصل کئے ہیں، پروپیگنڈہ خواہ کتنا ہی جھوٹا ہو، اس میں بڑی طاقت ہے، اچھے اچھے ذہن ودماغ اس شور وغوغا سے ماؤف اور بہتیرے کان اس چیخ وپکار سے بہرے ہوگئے ہیں، لیکن اس میں حقیقت کتنی ہے اس کا اندازہ کسی قدر خود اسی مضمون سے اور تفصیل سے دوسرے مضمون کے ذریعے ہو جائے گا۔ اللہ ہمارے ناقدین کو فہم سلیم دے۔

کتاب وسنت کی ساری مشق کے لئے بس تصوف غریب ہی رہ گیا ہے۔ باقی کہیں کتاب وسنت کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ وہ لوگ کرتے ہیں، جن کو کتاب وسنت کے حروف ونقوش کے علاوہ کسی اور چیز سے مس نہیں، جو حدیث لم یبق من القرآن الا رسمہ (قرآن کی صرف تحریر باقی رہے گی) اور لم یبق من الدین الا رسمہ (دین کا صرف نام باقی رہ جائے گا) کے مصداق ہیں، جن کی زندگیوں میں، ان کے مکان میں، ان کے لباس میں، ان کی اولاد میں، حتی کہ ان کے قلوب میں یہودیت اور نصرانیت بھری پڑی ہے، اور کتاب وسنت کا دور تک پتہ نہیں چلتا۔

وسائل ومقاصد کا فرق

یہ لوگ تصوف کو کتاب وسنت کے معیار پر پرکھتے وقت بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسری جگہوں پر یہ بات انہیں خوب یاد ہوتی ہے ۔ کہ شریعت نے ان چیزوں کو بطور خود جو مقصود اور مطلوب ہیں متعین اور متشکل کر دیا ہے، لیکن ان مقاصد کے حصول کے لئے ان کے ذرائع و وسائل میں وسعت کا راستہ اختیار کیا ہے، بعض مواقع پر تو شریعت نے مقصد کے ساتھ حصول مقصد کا بھی طریقہ متعین کر دیا ہے، اس میں تو تغیر وتبدیل ممکن نہیں، جیسے طہارت کے لئے پانی یا بوقت ضرورت مٹی کا استعمال، یا نماز کے اعلان کے لئے اذان پکارنا، کہ یہ ذرائع ہیں لیکن چونکہ حصول مقصود کے لئے شریعت نے انہیں ذرائع کو متعین کر دیا ہے اس لئے وضو کے لئے آدمی بجائے پانی کے کوئی اور سیال چیز استعمال کرے تو اس سے طہارت حاصل نہ ہوگی، اسی طرح نماز کی اطلاع عام کے لئے بجائے اذان کے اور کسی ذریعے سے کام لیا جائے، تو وہ درست نہ ہوگا۔

لیکن زیادہ تر مواقع میں شریعت نے حصول مقصود کا کوئی خاص طریقۂ کار مقرر نہیں کیا ہے، زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے طریقۂ کار کے اخذ و اختیار کا معاملہ اصحاب معاملہ کے سپرد کر دیا ہے، البتہ جواز وعدم جواز کی حدود متعین کر دی ہیں کہ ان سے خروج نہ ہو، جواز کے دائرہ میں رہتے ہوئے، مقاصد کے حصول کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ خاص طریقہ عہد نبوت میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اس طریقے کو

کتاب وسنت سے خارج نہیں قرار دیا جاسکتا جس طریقے کی اباحت کتاب وسنت سے ثابت ہوگئی، اس کو کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے، مثلاً تحصیلِ علم، مقاصد شرعیہ میں سے ایک عظیم مقصد ہے لیکن اس کے لئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ منضبط نہیں کیا ہے، آدمی کوئی بھی جائز طریقہ اختیار کرے جس سے علم حاصل ہوجائے بس کافی ہے، اس میں اس اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کہ تم نے فلاں خاص طریق سے علم حاصل نہیں کیا ہے، اس لئے تمہارا علم معتبر نہیں، بس شرط یہ ہے کہ وہ صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہو۔

البتہ اس مسئلہ میں حدود کی رعایت ضروری ہے، یعنی اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اسے ذریعے اور سبب ہی کے درجے میں رکھا جائے۔ اس کو مقصود اور بالذات عبادت نہ بنالیا جائے، ورنہ وہ بدعت قرار پائے گا، ذرائع میں بطور خود کوئی تقدس اور عبادت کا پہلو نہیں ہے، اگر ذرائع میں تقدس کا تصور ہے تو مقاصد کے اعتبار سے ہے، اگر کسی وقت ان سے مقصود کا حصول نہ ہو، یا کسی وجہ سے ان میں ضرر کا پہلو غالب ہوجائے، یا ان سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ تحصیل مقصود کے لئے ازروئے تجربہ حاصل ہوجائے، تو بے تامل اول کو چھوڑ کر دوسرے ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ تصوف کا مقصود رضا خداوندی اور اخلاق عالیہ کا حصول، رذائل سے اجتناب، دل میں یادالٰہی کا رسوخ اور عبادات میں ان کی روح یعنی خشوع وخضوع کا حصول ہے، ان مقاصد کے حصول کے لئے شریعت نے کچھ قواعد اور کچھ دستور اور طریقے متعین کئے ہیں، ان کو نہ تو کبھی بدلا جاسکتا، اور نہ انہیں ترک کیا جاسکتا، یہ ذرائع قرب ورضا کے اعتبار سے تو ذرائع ہیں، ورنہ وہ بذات خود مقصود اور عبادت ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ، تلاوت وذکر وغیرہ۔

لیکن ان مقاصد کے حصول اور ان کے مذکورہ بالا وسائل کو عمل میں لانے کی راہ میں بہت سے موانع پیش آتے ہیں، بہت سی رکاوٹیں اور اڑچنیں پڑتی ہیں ان موانع کو ہٹانے اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے، کچھ تدبیروں اور کچھ معالجات کی ضرورت پڑتی ہے، شریعت

نے ان معالجات اور ان تدبیروں کو کسی خاص شکل میں متعین نہیں کیا ہے، انہیں تدبیروں اور انہیں معالجات کو اصطلاح صوفیہ میں "مجاہدات و ریاضات" سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ مجاہدات نہ عبادت ہوتے اور نہ مقصود، اگر کسی شخص کو بغیر مجاہدہ و ریاضت کے مقصود حاصل ہو جائے، تو اسے ان کی کچھ ضرورت نہیں، حضرات صحابہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ان اصطلاحی مجاہدات کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ان کے لئے نماز، روزہ، تلاوت قرآن، اور ذکر الٰہی ہی کافی تھے، ان کے بعد بھی خود صحابہ کی برکت، دنیا دارانہ ماحول کے مغلوب ہونے کی وجہ سے ان مجاہدات کی زیادہ ضرورت نہ تھی، مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نفوس پر دنیا داری اور غفلت کا غلبہ ہوتا گیا، اب نماز، روزہ، تلاوت وغیرہ سب باقی ہیں، مگر تزکیہ نفس اور خشوع و ادب کا پتہ نہیں ہے، اس غفلت کو دور کرنے کے لئے ماہرین مناسب مجاہدے تجویز کرتے گئے، آج بھی اگر کسی کی استعداد عالی ہو یا مرشد قوی تاثیر رکھتا ہو، تو زیادہ مجاہدہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

نفس و شیطان کی رخنہ اندازی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا تو فرشتوں کی طرح معصوم و بے خطا، اور خواہشات و شہوات سے مبرا نہیں پیدا فرمایا، اور نہ شیاطین کی طرح سراپا طغیان و بغاوت بنا کر رکھا، بلکہ آگ پانی مٹی ہوا کے امتزاج سے اس کا پتلا اور ڈھانچہ بنایا، اور پھر اپنے امر خاص سے اس میں لطیف اور پاکیزہ روح ڈال دی، اس میں مذکورہ بالا چاروں عناصر کی خصوصیات بھی ہیں اور روحانیت و ملکوتیت بھی استعداد ہے، پھر دونوں استعدادوں کی امداد کے لئے اللہ نے دو مخلوق برپا کیں، آگ، مٹی اور ہوا کے آمیزہ سے شہوات و خواہشات بھرا نفس تیار ہوا، جو ہر وقت لذت کوشی نفس پرستی کی جانب دوڑتا رہتا ہے، اس کی امداد کے لئے ابلیس اور اس کی ذریت ہے، روح لطیف کی امداد کے لئے ملائکہ کا لشکر ہے، ان دونوں میں توازن برقرار رکھنے کے لئے [اللہ] تعالیٰ نے انسان میں ایک اور قوت ودیعت فرمائی، جس کا نام "عقل" ہے، اور عقل کی رہنمائی [ہدا]یت کے ذریعے کی، عقل ان دونوں جذبات میں اعتدال و توازن برقرار رکھتی ہے۔

اب غور کیجئے، اگر نفس کا میلان شہوات و معاصی کی جانب ہے، تو اس کو ہوا دینے والا [شیطا]ن موجود ہے، اور اگر روح کا انجذاب حق تعالیٰ کی بارگاہ قدس کی جانب ہے، تو اس کی

مدد کے لئے جنود ملائکہ حاضر ہیں، انسان اس کشمکش میں گرفتار ہوتا ہے تو عقل، دونوں کے درمیان شریعت کی رہنمائی میں محاکمہ کرتی ہے، پھر نہ تو وہ اسے بالکل شیطان بن جانے دیتی، اور نہ انسانوں کی صف سے نکل کر فرشتہ بننے کی اجازت دیتی، پھر وہ انسان ہی رہ کر بارگاہِ قدس میں ترقی کرتا رہتا ہے، تاہم عام انسانوں کے حق میں نفس و شیطان کا پلہ بھاری رہتا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں، اول یہ کہ انسان بچپن سے بلوغ تک ایک ایسے عبوری دور میں ہوتا ہے جبکہ عقل ناپختہ اور شعور نابالغ ہوتا ہے اس دور میں روح بھی خوابیدہ اور نفس کے تابع ہوتی ہے، اس عبوری عہد میں نفس اپنی لذات و ضروریات پر لوٹ مار رہتا ہے، اس عہد میں نفس کافی طاقتور ہو چکا ہوتا ہے، بلوغ کے وقت تک جبکہ اس کی عقل کامل ہوتی ہے، نفس کا غلبہ ہو چکا ہوتا ہے، اس عبوری مرحلہ کے گزرنے کے بعد وہ خدا کے احکام کا مخاطب ہوتا ہے، یہ احکام نفس کی عین ضد ہوتے ہیں کیونکہ نفس تو بالکل آزاد رہنا چاہتا ہے، اور احکام اسے پابند بناتے ہیں، پس وہ بغاوت کرتا ہے، اور شیطان اس کی مدد کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمانیات کا تعلق غیبی حقائق سے ہے، اور اعمال صالحہ کی بنیادیں بھی غیبی امور پر ہیں، اس کے برخلاف نفس اور طبیعت کے تقاضے اور خواہشات کا تعلق اس دنیائے حاضر کے ساتھ ہے، اور آدمی کی نہاد عاجلانہ ہے، پس عالم غیب سے اس کا تعلق ذرا مشکل سے قائم ہوتا ہے اور اس دنیا کے ساتھ جلد رشتہ جڑ جاتا ہے۔ اسی لئے بیشتر نفوس اپنی لذات و خواہشات میں منہمک ہوتے ہیں۔

اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ بجبر اسے شریعت کی لگام پہنائی جائے، اگر وہ گناہ بر دوڑے تو اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں اس کے ملکات رذیلہ کو دور کیا جائے۔ خصائل حمیدہ کا اسے خوگر بنایا جائے، اور عبادت و طاعت کا ذوق اس کے اندر بیدار کیا جائے، یہی بنیاد ہے ریاضات و مجاہدات کی۔

مجاہدے کی اقسام

مجاہدات کی حقیقت اجمالاً واضح کر دینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے نزدیک جو ضروری مجاہدات ہیں جن کے اختیار کئے بغیر حصول مقصود ممکن نہیں، ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کر دیا جائے۔ اس سے اندازہ

ہوجائے گا کہ صوفیہ کس قدر فطرت شناس اور روح ایمان کے کس درجہ عارف اور واقف کار ہیں۔
حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مجاہدے کی دو قسمیں ہیں، ایک مجاہدۂ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی بنایا جائے، مثلاً تکثیر نوافل سے نماز کا عادی کرنا، اور روزے کی کثرت سے کھانے کی حرص وغیرہ کو کم کرنا۔

اور ایک مجاہدہ مخالفت نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضا کرے اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کرنا۔

اصل مقصود دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے، اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کے لئے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوجائے گا، تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی، لیکن اگر کسی کو بغیر مجاہدۂ جسمانی کے نفس پر قدرت حاصل ہوجائے تو اس کو مجاہدۂ جسمانیہ کی ضرورت نہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں، اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدۂ جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ (۱)

مجاہدۂ جسمانی کے ارکان

حضرات صوفیہ کے نزدیک جسمانی مجاہدہ کے چار بنیادی ارکان ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی فن میں اعلیٰ کمال حاصل کرنے کے لئے ان چاروں مشقتوں سے گزرنا ناگزیر ہے اول قلت طعام، یعنی کم کھانا، کم کھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی کھانا اتنا کم کھائے کہ اس کی طبعی قوت گھٹ جائے، کم کھانے کا وہی مطلب ہے، جسے اطباء صحت جسمانی کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں، یعنی یہ کہ جب تک خوب بھوک نہ لگے، کھانا نہ کھایا جائے، اور جب تھوڑی بھوک باقی رہے، جبھی ہاتھ کھینچ لیا جائے، یہ تدبیر جہاں صحت جسمانی کے لئے اکسیر ہے صحت روحانی کے لئے بھی ناگزیر ہے، آدمی ہر وقت اناپ شناپ کھاتا رہے، یا ضرورت سے زائد پیٹ کو بھرتا رہے تو اخلاط میں اعتدال باقی نہیں رہتا جس سے اگر اس کی جسمانی صحت متاثر ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ رطوبات فاسدہ کی کثرت کی وجہ قلب و دماغ تشویشات

---

(۱) شریعت وطریقت ص۸ بحوالہ وعظ المجاہدہ۔

کی آماجگاہ بن جاتا ہے، جس سے دل کی یکسوئی باقی نہیں رہتی، جو کہ ایک ضروری چیز ہے۔

دوسرے قلت منام: کم سونا، اس سے بھی مراد یہ ہے کہ آدمی ضرورت سے زیادہ نہ سوئے، ضروری نیند جو چند گھنٹوں میں پوری ہو جاتی ہے، اس سے زیادہ سونے سے بلغم بڑھتا ہے، سستی پیدا ہوتی ہے، اور آدمی کاہل ہو کر رہ جاتا ہے۔

تیسرے قلت کلام: یعنی کم بولنا، اس مسئلہ میں تو شاید دنیا کے کسی عقلمند کو اختلاف نہ ہوگا کہ ضرورت سے زائد کلام کرنا ہر عملی مقصد کے لئے سخت مضر ہے، خاموشی سے بہتر وقت کو اور قوت کو بچانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

چوتھے قلت اختلاط مع الانام: یعنی لوگوں کے ساتھ کم سے کم تعلق رکھنا مطلب یہ ہے کہ آدمی زیادہ خلوت اختیار کرے، کسی کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے خلوت جس قدر ضروری ہے، اس سے کام کرنے والا ہر شخص واقف ہے۔

آدمی کا نفس ان چار چیزوں یعنی طعام، منام، کلام، اور اختلاط مع الانام کا حد درجہ حریص ہے، جب اس میں تقلیل کا ارادہ کیا جائے گا، تو شدید مشقت برداشت کرنی ہوگی، مگر یہ چاروں مجاہدے ایسے ہی ضروری ہیں، جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز ضروری ہے۔

حضرت حکیم الامت لکھتے ہیں کہ:

”جو شخص ان چاروں کا عادی ہو جائے گا، واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا۔“ (۱)

مجاہدۂ نفس

مجاہدۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے تو اس کی مخالفت کی جائے، اسے زبردستی معصیت سے روکا جائے، اس میں نفس کو شدید کلفت ہوتی ہے، یہ مجاہدہ فرض ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے، اور نفس کو ڈھیل دے دی جائے تو وہ معاصی کا ارتکاب کر کے ہر وقت غضب الٰہی کو دعوت دیتا رہے گا، لیکن عین گناہ کی خواہش کے وقت نفس کو قابو میں کرنا ایسا مشکل امر ہے کہ اس میں کامیابی کی امید بہت کم ہوتی ہے، البتہ اگر پہلے سے اس کی تدبیر کی جائے تو اول تو تقاضائے معصیت

(۱) تعلیم الدین۔

کم ہوگا، اور اگر ہوگا تو اس کا مقابلہ آسان ہوگا، اس کی تدبیر کیا ہے۔ حضرت حکیم الامت کی زبانی سنئے۔ فرماتے ہیں:

"یہ بات اس وقت حاصل ہو گی جبکہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی کسی حد تک مخالفت کی جائے، مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش نہ پوری کی جائے، بلکہ اس کے تقاضے کو روک دیا جائے اور کبھی کبھی سخت تقاضے کے بعد اس کی جائز خواہش پوری کر دی جائے، تاکہ نفس پریشان نہ ہو جائے، بلکہ اس کو کسی قدر خوش رکھا جائے، اور اس سے کام لیا جائے اس لئے کہ مزدور خوش دل کند کار بیش، تو جب مباحات میں مخالفت نفس کے عادی ہوگئے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہوگے، اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے، وہ بعض اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اس کو دبا نہیں سکتا۔" (۱)

مجاہدہ میں اعتدال

اعتدال اور توسط تمام دینی اعمال میں ضروری ہے، یہ بات مجاہدے میں بھی قابل لحاظ ہے، مجاہدے سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کو مشقت کا عادی بنانا ہے، اور راحت و تنعم کی عادت سے باہر نکالنا ہے۔ اسی لئے حضرات مشائخ نے از خود کوئی مجاہدہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ:

"پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنا چاہئے، مگر اس اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کریں، بلکہ کسی محقق سے درجۂ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کریں۔" (۲)

مجاہدہ درحقیقت معالجہ ہوتا ہے، اور علاج ہمیشہ مریض کی طبیعت، اس کی قوت اور اس کے مرض کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور اس میں اس کی بھی رعایت ملحوظ ہوتی ہے کہ اس کو کس درجہ کی صحت و قوت مطلوب ہے، اس لئے جیسے ایک مریض کے علاج کو دوسرے مریض کے علاج پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ایک شخص کے مجاہدے کو دوسرے کے مجاہدے پر

---

(۱) تعلیم الدین۔ (۲) وعظ المجاہدہ۔ ایضاً

قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور نہ اس پر اعتراض کیا جا سکتا، مثلاً ایک شخص کو زکام ہے، اور دوسرے کو کینسر، زکام کے مریض کا علاج سستا اور اس کا پرہیز معمولی ہوگا، اس کو شفا بھی جلد ہی حاصل ہو جاتی ہے، اس کے برعکس کینسر کے مریض کا علاج گراں اور مشکل اور پرہیز سخت ہے اور صحت بھی بہت دیر میں حاصل ہوتی ہے دونوں ایک ہی طبیب کا علاج کرتے ہیں، لیکن دونوں کے علاج میں بہت فرق ہے۔

اسی طرح ایک عام آدمی ہے، اور ایک سپہ سالار افواج ہے، دونوں ایک مرض میں مبتلا ہیں، عام آدمی کو ہلکی دوا دی جاتی ہے، اور عام غذا تجویز کی جاتی ہے کہ اس کو شفا حاصل ہو اور بقدر ضرورت طاقت حاصل ہو جائے۔ لیکن سپہ سالار کو اعلیٰ قسم کی دوا تجویز کی جاتی ہے تاکہ جلد صحت حاصل ہو۔ اور عمدہ قسم کی مقوی غذائیں اور طاقت کی دوائیں بتائی جاتی ہیں، تاکہ پوری قوت عود کر آئے، کیونکہ اس کا کام بڑا اور طالب مشقت ہے۔ پس اول کو معمولی شفا مطلوب ہے، اور دوسرے کو اعلیٰ درجہ کی شفا درکار ہے۔

ٹھیک یہی حال مجاہدات کا ہے، از خود اگر کوئی مجاہدہ اختیار کیا جائے گا تو نقصان کا اندیشہ ہے، اس کیلئے شیخ و راہبر کی ضرورت ہے، وہ موقع اور ضرورت کے مناسب مجاہدات تجویز کرے گا

بعض لوگ بزرگوں کے حالات کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان میں ان کے بعض مشکل اور سخت مجاہدات منقول ہیں۔ ان سے انہیں وحشت ہوتی ہے، انہیں خیال کرنا چاہئے کہ ان حضرات سے بہت بڑے بڑے کام لینے تھے، اس لئے ان سے مجاہدات بھی سخت کرائے گئے، ورنہ عام اور معمولی آدمیوں کے سلسلے میں ایسے مجاہدے منقول نہیں ہیں، یہ طبیب کی تجویز ہے، اس پر غیر طبیب کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

اور یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جن بزرگوں نے یہ مجاہدات کئے ہیں انہوں نے ان کے ذریعے بڑے بڑے کمالات حاصل کئے۔ انہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوا، لیکن آج کے بالشتیے، جن کو نہ ان مجاہدات کی ہوا لگی، اور نہ انہیں اپنے منھ زور نفس کو ہاتھ لگانے کا کبھی حوصلہ ہوا، انہیں ان مجاہدات پر اعتراض سوجھ رہا ہے۔ دوستو! اگر تم سے نہیں ہوتا، نہ کرو، مگر اعتراض تو نہ کرو۔

یہی حال امراض کے اعتبار سے علاج کا معاملہ ہے، کبھی مرض شدید ہوتا ہے تو علاج میں

بظاہر سختی ہوتی ہے، ناواقف اسے سختی کہتا ہے، مگر واقف کار اسے عین شفقت تصور کرتا ہے، آخر ڈاکٹروں کے آپریشن اور چیر پھاڑ کو کون سختی کہتا ہے۔

مرض کی شدت اور علاج کی سختی

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی سوانح حیات "تذکرۃ الرشید" میں حضرت کا ایک ملفوظ منقول ہے، فرماتے ہیں:

"اخلاق سیئہ بہت سے ہیں، مگر اکثر نے دس میں محصور کردیا ہے، پھر ان دسوں کا خلاصہ تکبر کو بتایا ہے، اگر یہ دور ہوجائے تو باقی خود دور ہوجاتے ہیں، حضرت جنید بغدادی کے پاس کوئی آدمی بیس سال رہا اور ایک روز عرض کیا کہ حضرت اتنی مدت میں مجھے آپ سے کچھ حاصل نہیں ہوا، وہ شخص اپنی قوم کا سردار اور برادری میں ممتاز تھا، آپ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں بڑائی ہے، فرمایا اچھا ایک بات کرو، اخروٹوں کا ایک ٹوکرہ بھر کر خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ جاؤ، اور پکارو کہ جو شخص میرے ایک جوتہ مارے گا اس کو ایک اخروٹ دوں گا، اور جو دو مارے گا تو دو دوں گا، اسی طرح زیادہ کرتے چلے جاؤ، جب یہ کام کرچکو اور اخروٹ کا ٹوکرہ خالی ہوجائے تب میرے پاس آؤ، اس شخص نے کہا لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ حضرت یہ کام تو مجھ سے نہ ہوسکے گا، حضرت جنید نے فرمایا کہ یہ وہ مبارک کلمہ ہے کہ اس کو ستر برس کا کافر صدق دل سے ایک مرتبہ پڑھ لے تو واللہ مسلمان ہوجائے گا مگر تو اس وقت اس کے پڑھنے سے کافر طریقت ہوگیا۔" (۱)

بزرگوں سے جو مجاہدات منقول ہیں، اگر ان میں ہمارے ذکر کردہ اس نکتے سے صرف نظر کرلیا جائے تو آدمی اعتراضات کی وادی میں جا گرے گا، اور محروم ہوگا، نگاہوں کے اس قصور نے بڑی محرومیاں پیدا کی ہیں اور بڑے فتنے اٹھائے ہیں۔ اللھم انا نعوذ بك من الفتن ما ظہر منہا وما بطن۔

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۱۳/۲ ۔

اذکار - اشغال - مراقبات

مبادی تصوف میں تیسری اہم چیز اذکار و اشغال اور مراقبات ہیں۔

اذکار ذکر کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت سے تو یہ مقاصد میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے
یاایہاالذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا۔ (سورہ احزاب) اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بکثرت کرو۔

دوسری جگہ فرمایا۔

واذکر ربك فی نفسك تضرعا وخیفة ودون الجہر من القول بالغدو والآصال ولا تکن من الغافلین۔ (سورہ اعراف)

اور اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح و شام اور غافلوں میں سے مت ہو (بیان القرآن)

غفلت ذکر کی ضد ہے، غفلت حرام ہے، اور ذکر فرض ہے، اور یہ خود مطلوب ہے۔

لیکن دوسری حیثیت سے مقصود و مطلوب کے لئے معاون اور ذریعہ بھی ہے، منجملہ مقاصد شرع کے محبت الٰہی کی تحصیل بھی ہے، جس قدر اللہ کا ذکر کیا جائے گا اسی قدر اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی، اور محبت کے بعد خدا کی اطاعت و بندگی پر دوام حاصل ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں خدا کا قرب میسر ہوگا، بزرگوں نے ذکر کو دونوں حیثیتوں سے اختیار کیا ہے، مقصود ہونے کے اعتبار سے یہ حضرات پوری زندگی کو ذکر سے سرشار کردینا چاہتے ہیں، جو "ذکر کثیر" کا اعلیٰ مصداق ہے، یہاں تک کہ ذکر کا رنگ ان پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آنے لگتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں نیک لوگوں کی علامت بیان کی گئی ہے کہ

اذارأوا ذکر اللہ ۔۔۔۔۔ جب ان پر نظر پڑے تو اللہ یاد آئے۔

لیکن ذکر کا یہ رنگ آدمی پر چڑھے کیونکر؟ اس کے لئے بطور وسیلہ کے ذکر کو ہی استعمال کیا گیا اور اس طرح کے ذکر کے مختلف طریقے تجربے کی رو سے تجویز کئے گئے۔ ان کی خاص خاص تعداد متعین کی گئی، ان کی وضع اور ہیئت مقرر کی گئی، جہر اور سر کی حدیں بنائی گئیں، اور ان سب

کا حاصل یہ ہے کہ ذکر بعجلت اور بسہولت دل میں راسخ ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث میں ذکر کا حکم مطلق ہے، اس مطلق حکم کی تعمیل کے لئے اگر کوئی خاص طریقہ بشرطیکہ وہ جائز ہو، وضع کیا جائے، اور اسے بطور وسیلہ کے عمل میں لایا جائے، اس طریقۂ خاص کو مقصود اور عبادت نہ قرار دیا جائے، تو اس میں اسی کو کلام ہو سکتا ہے، جو اصول شرع بلکہ اصول عقل سے بھی نابلد ہو۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ حضرات صوفیہ کبھی ذکر کا جہراً حکم دیتے ہیں، کبھی اس کے لئے بیٹھنے کی کوئی خاص ہیئت بتاتے ہیں، اور حکم دیتے ہیں کہ مثلاً لاالٰہ پر سر اور گردن کو پیچھے لیجاؤ اور یہ خیال کرو کہ غیر اللہ کی محبت اور اس کا اثر دل سے خارج ہو رہا ہے، اور پھر الا اللہ کی ضرب دل پر لگاؤ کہ اللہ کا نور یا اللہ کی محبت دل میں پیوست ہو رہی ہے، یہ ضربیں متواتر اور مسلسل لگائی جاتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دل سے غیر اللہ کی مقصودیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت مستحکم ہو جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ طریق زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔ کبھی مشائخ ذکر قلبی تلقین کرتے ہیں، اور اس کے بھی مختلف طریقے ہیں، مثلاً یہ کہ خیال کرو کہ دل کی دھڑکنیں ناطق ہیں، اور اللہ اللہ کر رہی ہیں، یہ طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں کہ ذکر کا رسوخ ہو جائے، کبھی پورے کلمہ لاالٰہ الا اللہ کی مشق کراتے ہیں، کبھی الا اللہ کی ضرب لگاتے ہیں، کبھی صرف اللہ اللہ رٹاتے ہیں، یہ سب تمرینات ہیں، اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ ان کے مختلف اثرات قلب پر مرتب ہوتے ہیں، یہ سب قلب میں ذکر کے رسوخ کے اسباب وذرائع ہیں، انہیں بدعت قرار دینا دینی اعتبار سے اپنے ذہنی افلاس کی خبر دینا ہے، ایک بچہ قرآن حفظ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جب تک وہ قرآن کے الفاظ اپنی زبان سے نہیں رٹے گا، کلمات قرآنی اس کی لوح دل پر نقش نہ ہوں گے۔ وہ کبھی پوری آیت دہراتا ہے کبھی ایک ہی لفظ کا تکرار کرتا چلا جاتا ہے، کیا اس کو بدعت کہا جائے گا۔

حضرات صوفیہ اللہ کے نام کو مختلف طریقے سے رٹاتے ہیں، یہ طریقے مقصود نہیں ہیں، مقصود یہ ہے کہ وہ نام دل میں راسخ ہو جائے، اسی کے لئے ضربیں لگواتے ہیں۔ اسی کے لئے خلوت میں بٹھاتے ہیں، اسی کے لئے چلوں کا حکم دیتے ہیں، خدا کے نام میں جو برکت اور حلاوت

ہے، اس کے اثر سے رذائل فنا ہوتے ہیں، ایمان میں ترقی ہوتی ہے، دل نرم ہوتا ہے، ماسوی اللہ کی محبت دل سے زائل ہو جاتی ہے، غرض اس ایک نام کے رٹنے سے روح اسلام اور روح ایمان حاصل ہوتی ہے، اور یہی روح نہ حاصل ہو تو آدمی روح حیوانی رکھتے ہوئے مردہ ہے، حدیث میں ہے:

عن ابی موسی قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مثل الذی یذکر اللّٰہ والذی لایذکر مثل الحی و المیت. (رواہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو اللہ کو یاد کرتا ہے اور جو نہیں یاد کرتا، زندہ اور مردہ کی ہے

غرض یہ ہے کہ یہ تمرینات ہیں، جن سے مقصود یہ ہے کہ آدمی کے رگ و ریشہ میں ذکر سرایت کر جائے، اور کوئی لمحہ اس کا غفلت میں نہ گزرے، چنانچہ صدیوں کا تجربہ یہی ہے کہ جس نے ان طریقوں کے مطابق کسی مرشد کامل کی رہنمائی میں ذکر اللہ کی مشق کی، اس کا پورا وجود ذکر الٰہی بن گیا، اس کا مشاہدہ اس کثرت سے ہے کہ اس کی تکذیب، تواتر کی تکذیب ہے اگر کسی کو تجربہ نہ ہوا ہو تو تجربہ کاروں کی بات کی تصدیق تو کرنی چاہئے، ہاں اگر کوئی، اس سے بہتر طریقہ ذکر الٰہی کے رسوخ کا لائے تو کیا مضائقہ ہے ؎ چشم ما روشن و دل ماشاد۔

لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ دوستوں نے تصوف پر تو تیشہ چلا دیا، مگر اس کا کوئی بدل نہ پیش کر سکے، جو دولت ہاتھ میں تھی اسے ضائع کر دیا، اور دوسری کوئی دولت عطا نہیں کی پس محروم تو کر دیا۔ اور محرومی کا کوئی علاج نہیں کیا۔

کہتے ہیں کہ اعمال مسنونہ کافی ہیں۔ اس میں کیا شبہ کہ وہ کافی ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اعمال مسنونہ کے جتنے مدعیان خام ہیں، ذرا سی ٹھیس میں ان کے تمام دعووں کی ہوا نکل جاتی ہے، بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت اور نظر کیمیا اثر حاصل تھی اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مشق و مجاہدہ کی ضرورت نہ تھی آپ کی نظر کی تاثیر ہی سے قلوب کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی، لیکن اب جب کہ وہ دولت حاصل نہیں ہے، ذکر کے رسوخ اور دلوں کو نرمانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرورت پڑتی ہی ہے، آج بھی مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی مرشد قوی النسبت اور زیادہ

موثر ہوا، تو اس کے مریدین و متوسلین کو زیادہ محنت و مجاہدہ کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے کوئی بہت کامل اور اعلیٰ درجہ کا استاذ ہو تو طلبہ کم محنت کر کے بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ طریقے کہاں تھے؟ ہم عرض کریں گے کہ طرق اور ذرائع کے بارے میں یہ سوال بیجا ہے کہ حضور کے زمانے میں کہاں تھے؟ ذرائع ضرورت کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں آپ کی صحبت بابرکت کے ہوتے ہوئے ان طرق کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کے بعد ضرورت ہوئی ہے، جواز کی حدود میں رہ کر کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسے جہاد ایک شرعی فریضہ ہے، اس کی اقامت کے لئے ضرورت کے لحاظ سے جو چیز بھی جائز حدود میں ہوگی اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ذکر کے رسوخ کے لئے کوئی مناسب اور موثر طریقہ اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اشغال

"شغل" بھی صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دل کی توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لئے کوئی عمل کیا جائے، تاکہ اس سے یکسوئی پیدا ہو، مثلاً لفظ اللہ موٹے حرفوں میں لکھ کر اس پر نگاہ جمائی جائے کہ پلک تک نہ جھپکے، اس سے قلب کو یکسوئی بھی حاصل ہوتی ہے اور اس پر کچھ ایسے اثرات بھی طاری ہوتے ہیں، جن سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے پھر قلب تشویشات سے خالی ہو کر ہمہ وقت متوجہ بحق رہتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"اشغال کا مقصود اصلی یہ ہے کہ قلب کا انتشار جو بوجہ تشویش افکار کے ہے دفع ہو کر جمعیت خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو، تاکہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام الی اللہ جو کہ مبتدی کو بوجہ غیب ہونے مدرک کے، اور مزاحم ہونے افکار مختلفہ اور حیات حاضرہ کے متعذر ہے[1] سہل ہو جائے، اشغال مختلفہ اسی کے حیل (تدبیریں) اور طرق ہیں، نماز میں سترہ کا حکم اس عمل کا ماخذ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بتصریح علماء اسرار، مقصود سترہ سے بھی جمع خاطر اور ربط خیال و نفی انتشار ہے، جیسا کہ ابن ہمام

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات چونکہ غیب ہے، اور انسان مشاہدات کا خوگر ہے پھر (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے، اور سترہ اس کی تدبیر ہے۔"(۱)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"غرض جتنے اشغال ہیں، وہ جمع خاطر ہی کے لئے ہیں، مقصود بالذات نہیں ہیں، اور اس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے کہ جوگیوں تک سے بعض اشغال لئے ہیں، مثلاً حبس دم، جو جوگیوں کا شغل ہے مگر چونکہ ان کا مذہبی شعار نہیں ہے اور خطرات دفع کرنے کے لئے نافع ہے، اس لئے اس کو بھی اپنے ہاں لے لیا ہے، اور اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور اس میں تشبہ ممنوع نہیں ہے، کیونکہ جو چیز کسی فرقہ کا نہ مذہبی شعار ہو اور نہ قومی، محض تدبیر کے درجے میں ہو، اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کے لئے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے، چونکہ حبس دم بھی دفع خواطر کے لئے محض ایک طبعی تدبیر ہے، اس لئے اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ یہ اخذ تدبیر میں ہے نہ کہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں، اور اس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے، یہ انتظام و تدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا، محض ایک تدبیر تھی اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔"(۲)

خوب یاد رکھیئے کہ شاذو نادر جو اشغال جوگیوں سے لئے گئے ہیں وہ نہ تو بعینہ ان کے طریق پر لئے گئے ہیں اور نہ ان پر مطلقاً عمل ہوتا، ان میں مشائخ نے تصرف کرکے انکی ہیئت تبدیل کردی ہے، مثلاً حبس دم کے جو طریقے جوگیوں میں مروج ہیں، ان میں سے کوئی ایک طریقہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) یہ کہ قلب انسانی پر ہر وقت مختلف قسم کے افکار کی یورش رہتی ہے، اسلئے سالک مبتدی کو اللہ کی طرف توجہ تام نہیں ہوتی، اس کو ہر شخص محسوس کرتا ہے، اور بہت سے لوگ اس کے دفعیہ کی تدابیر پوچھتے بھی رہتے ہیں، لیکن جب اس کی تدبیر بتائی جاتی ہے تو سطحی علم رکھنے والے اسے بدعت کہہ کر بدکتے ہیں، اور محروم رہتے ہیں۔ فویل لہم۔

(۱) شریعت وطریقت ص ۲۷۳، بحوالہ التکشف۔

(۲) شریعت وطریقت ص ۲۷۳۔

ہمارے یہاں معمول نہیں ہے، صرف معمولی درجے میں سانس روکنے کا عمل کیا جاتا ہے، تاکہ کسی قدر گرمی پیدا ہوکر فاسد رطوبات جل جائیں، اور اس سے یکسوئی پیدا ہو، پھر یہ کہ وہ بہت ناگزیر ضرورت کے وقت اختیار کئے جاتے ہیں، اور ہمارے مشائخ دیوبند نے تقریباً اسے بالکل ہی حذف کردیا ہے۔

اشغال کی ضرورت

اشغال کی ضرورت کب ہوتی ہے، یہ بھی حضرت تھانویؒ کی زبانی سن لیجئے:

"ذکر کے وقت اگر قلب میں جمعیت وخشوع معلوم ہوا اور وہ روزانہ بڑھتی جائے اور وساوس وخطرات میں کمی ہونے لگے، اور دل لگا کرے تب تو اشغال کی حاجت نہیں، اور ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی وخشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل کرلیا کرے۔" (۱)

مراقبات

مراقبہ بھی حضرات صوفیہ کی اصطلاحات میں سے ہے، اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا یا اس سے متعلق کسی اور مضمون کا اکثر احوال میں، یا کسی خاص محدود وقت میں دل سے پورے تدبر اور کامل غور وفکر کے ساتھ خیال جمانا، اور اس کا تصور بطور مواظبت کے رکھنا، تاکہ اس تصور کے غلبہ سے اس کے مقتضا پر عمل ہونا آسان ہوجائے۔ یہی عمل مراقبہ کہلاتا ہے، مراقبہ کا فائدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ناقص اور ناتمام تصور جو کبھی ذہن میں حاضر ہوتا ہے، اور بیشتر اوقات غائب رہتا ہے، یہ تصور راسخ ہوجائے، اسی رسوخ میں مشائخ عوام سے ممتاز ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانك تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك۔	احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو، تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے

اور فرمایا

احفظ اللّٰہ تجدہ تجاھك۔	اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھو، اسے اپنے سامنے پاؤگے

(۱) شریعت وطریقت ص ۲۸۴۔

دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بندے کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار رکھے، گویا اسے اپنے سامنے پا رہا ہے، اسے دیکھ رہا ہے، اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب اس کا گہرا تصور آدمی کو حاصل ہو، اس کے بغیر استحضار ناممکن ہے، اسی گہرے تصور اور کامل توجہ کو حاصل کرنے کیلئے مشائخ مختلف مراقبات تجویز کرتے ہیں۔ کبھی کسی خاص صفت کا مراقبہ تلقین کرتے ہیں، کبھی محض ذات کا مراقبہ، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار تام حاصل ہو جائے۔ (۱)

مشارطہ اور محاسبہ

مراقبہ سے تعلق رکھنے والی دو چیزیں اور ہیں۔ ایک مراقبہ سے پہلے اور ایک مراقبہ کے بعد، مراقبہ سے پہلے مشارطہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ صبح اٹھ کر تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے نفس کو خوب فہمائش کرے کہ دیکھو فلاں فلاں کام کرنا، اور فلاں فلاں نہ کرنا، اس کے بعد دن بھر صبح کو دی ہوئی ہدایات کی نگرانی کرتے رہنا، اور جب دن ختم ہو، پھر سوتے وقت صبح سے شام تک جو اعمال کئے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لے جو کام نیک ہوئے ہوں، ان پر شکر الٰہی بجالائے، اور جو برے کام صادر ہوتے ہوں، ان پر نفس کو ملامت اور زجر و توبیخ کرے، اگر صرف زجر و توبیخ کافی نہ ہو تو کچھ سزا تجویز کرکے اس کو عمل میں لائے۔ اسی طریقۂ کار کو محاسبہ کہتے ہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

ولتنظر نفس ما قدمت لغد۔ چاہئے کہ ہر شخص غور کرلے کہ کل کے لئے کیا کیا ہے؟ (۲)

مراقبات بہت سے ہیں، ان سب کا مقصود ایک ہے کہ حق تعالیٰ کی حضوری، ان کی محبت، ان کی یاد اور ان پر اعتماد کلی حاصل ہو جائے۔ اس استحضار سے بندے کو حق تعالیٰ سے حیا کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، جس کی برکت سے معاصی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، اور طاعات کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

یہ مبادی تصوف پر مجمل گفتگو کی گئی ہے۔ تفصیل کے لئے تو دفتر درکار ہے۔ لیکن اس سے اندازہ تو ہو ہی گیا کہ مقاصد تصوف کے حصول کے لئے جو تمہیدات و مقدمات تجویز کئے گئے ہیں اور ان کی افادیت و نافعیت پر صدیوں کا تجربہ شاہد ہے ان کو بدعات کے ذیل میں شمار کرنا، حقیقت ناشناسی کی دلیل ہے، البتہ ناقص متصوفین جب ان مبادی کو مقصود کے درجے پر

---

(۱) ماخوذ از شریعت و طریقت۔ (۲) ماخوذ از تعلیم الدین۔

رکھنا شروع کر دیں، تو یقیناً ان پر نکیر کی جائے گی۔ یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ان مبادی میں کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔ اگر ان کے علاوہ کسی اور چیز سے مقصود حاصل ہو جائے تو ان مبادی کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان مبادی کو عمل میں لائے بغیر مقصود کا حصول معتبر نہیں ہو گا یہی وجہ ہے کہ مشائخ کے یہاں ایک مقولہ بہت رائج ہے۔

طرق الوصول الی اللہ بعدد انفاس الخلائق۔ خدا تک پہونچنے کی راہیں مخلوقات کی سانس کے بقدر ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے، ایمان حاصل ہونے کے بعد خدا کے قرب و رضا کو حاصل کرنے کا کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں ہے، بے شمار ذرائع و وسائل کو کام میں لاکر خدا کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ صوفیہ کا متعارف طریقہ ہو یا کوئی دوسرا طریقہ!

تاہم یہ بھی مسلم ہے کہ حضرات صوفیہ کے متعارف طریقوں سے جس درجہ جذب وحضوری، اور یقین و توکل کا حصول ہوتا ہے، تجربہ سے ثابت ہے کہ دوسرے ذرائع اتنے مفید اور تام نہیں ہیں۔

توابع و ثمرات

آدمی کسی فن میں کوشش اور محنت کرتا ہے، اس کے اندر کمال پیدا کرنے کی لگن میں رہتا ہے، اور اسے ہمہ وقت برتتا رہتا ہے، تو تجربہ ہے کہ اس کے اسرار و رموز اس پر کھلنے لگتے ہیں، وہ بڑے عجیب عجیب تجربات سے گزرتا ہے، جو باتیں پہلے اس کے وہم و گمان میں نہیں آتی تھیں، وہ اس کے تجربات و مشاہدات کے ذیل میں آکر بدیہیات و ضروریات میں شامل ہو جاتی ہیں، یہ تجربہ کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، معمولی کاشت کاری و دست کاری سے لے کر اعلیٰ درجے کے علمی مشاغل تک کے ماہرین ان تجربات سے گزرتے ہیں۔

اسی طرح انسان جب اپنے باطن کی اصلاح اور نفس کے تزکیہ کی راہ پر قدم رکھتا ہے، وہ اپنی پوری ہمت اور طاقت کے ساتھ اپنے قلب کو ذکر کے نور سے روشن کرنا چاہتا ہے،

اور شب و روز اسی دھن میں لگا رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو، اس کے وجود کو کچھ مخصوص نوازشوں کے ساتھ سرفراز کرتے ہیں، اس پر غیبی حقائق کا انکشاف ہونے لگتا ہے اگر اس کی دماغی استعداد عالی ہوتی ہے، تو قرآن و سنت کے اسرار و غوامض اس پر کھلنے لگتے ہیں، اس کی طبیعت کا رنگ بدل جاتا ہے، ایک عام آدمی بھی وہی قرآن و حدیث پڑھتا ہے، اور یہ شخص بھی وہی قرآن و حدیث پڑھتا ہے، لیکن اول کے قلب پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اور اِس کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے، دل شوق یا خوف سے معمور ہوجاتا ہے، آنکھیں آنسوؤں سے ابل پڑتی ہیں، ہر ہر آیت پر خدا سے نیا عہد و پیمان باندھتا ہے، غرضیکہ اسے کچھ ایسی خاص باتیں حاصل ہوتی ہیں، جن کی دوسروں کو خبر نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کی خانقاہ میں ایک عالم تشریف لے گئے، رات کے سناٹے میں دیکھا کہ ذاکرین کی جماعت بیدار ہوئی، اور تہجد کی رکعتیں پڑھ کر لوگ اپنے اپنے اذکار میں لگ گئے پھر ان عالم کی آنکھوں نے دیکھا، کہ کوئی رو رہا ہے، کسی کی چیخ نکلی جا رہی ہے، کوئی چپکے چپکے آنسو بہا رہا ہے، کوئی ساکت و صامت گردن جھکائے بیٹھا ہے، کوئی مناجات کرکے سو سو طرح اپنے رب کی خوشامد کر رہا ہے۔ انہوں نے صبح کو شیخ خانقاہ سے عرض کیا کہ یہی کلمہ میں بھی پڑھتا تھا۔ اور مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور یہی کلمہ دوسرے لوگ پڑھ پڑھ کر بے حال ہوئے جا رہے تھے، اس میں کیا راز ہے، شیخ نے اول تو ٹالا کہ یہ لوگ دل کے ضعیف ہیں۔ زود حس ہیں، وغیرہ، لیکن پھر ان کی درخواست پر انہیں بھی ذکر تلقین کیا، اس تلقین کے بعد جب وہ ذکر کے لئے بیٹھے تو مارے گریہ کے منھ سے کلمہ ادا نہیں ہوتا تھا، بعد میں آکر عرض کیا کہ میں سمجھ تو نہیں سکا کہ کیا بات ہے، مگر دل ہے کہ امنڈا چلا آتا تھا۔

ان کیفیات کو حضرات صوفیہ اپنی خاص اصطلاح میں "احوال" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ احوال محض فضل خداوندی سے نصیب ہوتے ہیں۔ ان کے ملنے نہ ملنے میں بندے کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا، تاہم عموماً تجربہ یہی ہے کہ بندہ جب اپنے کو یاد الٰہی میں کھپاتا ہے تو اس کی استعداد و قوت کے بقدر ان مواہب سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

احوال رفیعہ

ہندوستان کے مایۂ ناز اور مشہور عالم و محدث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"جن لوگوں کو سکینہ پر دوام و استقامت نصیب ہوتی ہے انہیں یکے بعد دیگرے بلند احوال نصیب ہوتے رہتے ہیں، سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت سمجھے، اور یہ جان لے کہ یہ حالات اس بات کی علامت ہیں کہ اس کی طاعت حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے، اور یہ کہ اس کا باطنِ نفس اور دل کی گہرائی طاعت الٰہی سے متاثر ہے۔" (۱)

شاہ ولی اللہ ایک ایسے عالم و محدث ہیں جن پر ہندوستان کے بیشتر علمی حلقوں کا اعتماد ہے، ان کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ صاحب سکینہ کو بہت سے بلند احوال حاصل ہوتے ہیں ان احوال کی قدرے تفصیل آگے آرہی ہے، لیکن ہمارے زمانے میں دینی اصطلاحات، اور دینی علوم سے اس قدر بعد ہوگیا ہے کہ اکثر اصحاب کے لئے لفظ "سکینہ" نامانوس ہوگا، اور بعض سطح بینوں، اور سرسری مطالعہ والوں نے اس باب میں بڑا مغالطہ پیدا کر رکھا ہے، کہ جہاں کوئی لفظ ان کی عقل و فہم سے بالاتر اہل علم کی کتابوں میں آیا، تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے قصور علم اور کوتاہیٔ نظر کا اعتراف کریں، ان الفاظ کو ہی بے معنی اور بے اثر بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، اس طرح آہستہ آہستہ وہ تمام الفاظ و اصطلاحات جو آج سے ایک صدی پیشتر نہ صرف یہ کہ مانوس تھے، بلکہ ناخواندہ حتیٰ کہ غیر مسلموں تک میں متعارف تھے، آج پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ احوال کی قدرے تفصیل بیان کرنے سے پہلے لفظ سکینہ کی تشریح کردیں۔ اور یہ تشریح بھی ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ہی سے مستعار لیں گے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"تمام مشائخ کے طریقوں کا مقصد و منتہیٰ ایک خاص نفسی کیفیت کا حاصل کرنا ہے جس کا نام ان کی اصطلاح میں "نسبت" ہے، کیونکہ یہ ہیئت نفسی درحقیقت

---

(۱) حضرت شاہ صاحب کا یہ مضمون، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی کتاب تصوف اور نسبت صوفیہ سے ماخوذ ہے، اصل کتاب القول الجمیل سے بھی اس کی مراجعت کرلی گئی ہے۔

انسان کا حق تعالیٰ کے ساتھ ربط وارتباط ہے، اسی کا نام سکینہ بھی ہے، اور اس
کو نور بھی کہتے ہیں، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ فطرت انسانی میں یعنی اس کے نفس
ناطقہ میں ایک ایسی کیفیت سرایت کر جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے ملائکہ کے
ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، اور عالم بالا کے مشاہدہ کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔
اس عبارت کی تشریح میں مشہور بزرگ عالم اور محقق شیخ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ
صاحب نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں:

"تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات، طہارات اور اذکار وغیرہ پر مداومت
کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،
جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنے کا ایک ملکۂ راسخہ
پیدا ہو جاتا ہے، اسی ملکہ کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے، اور حصول نسبت کا مطلب
یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو اُدھر توجہ تام ہو گئی، اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو گیا، ورنہ
حق تعالیٰ کو تو بندہ سے نسبت ہوتی ہی ہے جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس ؛ ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ایک ایسا اتصال یعنی نسبت حاصل ہے جس کی نہ تو
کیفیت کا بیان ہو سکتا، اور نہ کسی چیز پر اس کو قیاس کیا جا سکتا۔" (۱)

چند احوال رفیعہ

مشائخ کو حصول نسبت کے بعد جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بہت سے
بلند احوال حاصل ہوتے ہیں، جن کی عوام الناس کو تو ہوا بھی نہیں
لگتی اور وہ علماء جو صرف علم کے ظاہر پر اکتفا کئے رہتے ہیں اور قلب و باطن کی طرف توجہ نہیں کرتے
وہ بھی ان میں سے اکثر سے محروم رہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان احوال رفیعہ میں سے چند
ایک کو شمار کرایا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض احوال اپنے تعارف کے لئے مبسوط مقالہ
چاہتے ہیں، کیونکہ ہمارے دور میں یہ چیزیں نامانوس اور اجنبی بن چکی ہیں، نہ صرف اجنبی بلکہ
ستم ظریفوں نے اپنی کوتاہی عقل کی وجہ سے انہیں اعتراضات کا ہدف بھی بنا رکھا ہے، اسلئے

(۱) تصوف اور نسبت صوفیہ (مجموعۂ تالیفات ص ۱۴۳/۱۴۴)

ضرورت ہے کہ ان کی حقیقت واضح کردی جائے، لیهلك من هلك عن بينة ويحيى من حي عن بينة۔ لیکن اس مقالہ میں زیادہ بسط کی گنجائش نہیں، یونہی یہ مقالہ طویل ہوگیا ہے تاہم اختصار کے ساتھ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سالک کو حصول نسبت کے بعد ایک عظیم القدر حال یہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ نفس کی شدید کشاکش سے نجات پاکر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دیتا ہے، اس کا ایک ہی مطمح نظر رہتا ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہوجائیں اس کے لئے وہ سو طرح کے جتن کرتا ہے۔

(۲) اسی طرح اس کو ایک بڑی دولت یہ حاصل ہوتی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی خشیت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کے آثار قلب سے چھلک کر بدن اور دوسرے اعضا پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

(۳) صاحب نسبت کو حق تعالیٰ کی جانب سے رویا صالحہ (اچھے خواب) کی نعمت میسر آتی ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ نیک آدمی کا رویا صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے بعد نبوت کے حصوں میں سے صرف مبشرات رہ جائیں گے، صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا خواب جسے کوئی نیک آدمی دیکھے، یا اس کے واسطے کسی دوسرے نیک اور صالح شخص کو دکھایا جاوے، چنانچہ حق تعالیٰ کے قول لهم البشرى في الحيوة الدنيا. میں بشریٰ کی تفسیر رویا صالحہ سے کی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح صاحب سکینہ کو اس دنیا میں فراست صحیحہ کی دولت حاصل ہوتی ہے یعنی دل میں ایسی بات کا آجانا جو حقیقت کے مطابق ہو، اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله. یعنی مومن کی فراست سے بچو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

(۵) صاحب نسبت کو ایک بڑا انعام حق تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ ملتا ہے کہ اس کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندے کو ایسی نسبت اور ایسا تعلق قائم ہوجاتا

ہے کہ وہ اپنی جس ضرورت کے لئے جہد ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتے ہیں۔

(۶) اسی طرح صاحب سکینہ کو ایک بلند حال یہ ملتا ہے کہ اگر اللہ پر توکل کر کے کسی بات پر قسم کھائے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری کر دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

رب اغبر اشعث ذی طمرین لا یعبو به احد لو اقسم علی الله لا بره۔

یعنی بہت سے غبار آلود، پراگندہ بال پھٹے پرانے کپڑے والے، جن کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا لیکن اللہ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیں۔

مطلب یہ ہے کہ ظاہر حال تو ایسا ردی کہ لوگ اپنے پاس بٹھانا گوارا نہ کریں، مگر خدا کے نزدیک ایسا درجہ کہ اگر کچھ زبان سے نکال دیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھنے کے لئے وہی کر دیتے ہیں۔

صاحب سکینہ کے ان احوال کا ذکر کر کے شاہ صاحب پھر پہلی بات کا اعادہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ :

"خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ایسے احوال رفیعہ جو مذکور ہوئے، اور انہیں کے مانند دوسرے حالات عالیہ، یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے، اور اس کی طاعات عند اللہ مقبول ہیں، نور ایمان اس کے باطن میں سرایت کئے ہوئے ہے، لہٰذا سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت سمجھے، کیونکہ یہ سب اس کے ایمان کی دلیل ہے۔" (۱)

یہ چند خدائی انعامات ہیں، جو حق تعالیٰ کی جانب سے صاحب نسبت کو ملتے ہیں، اتنے ہی پر بس نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی گنجہائے گرانمایہ ہیں، جن سے سالکین نوازے جاتے ہیں۔

---

(۱) مجموعۂ تالیفات مصلح الامۃ ج ۲ ص ۴۷۔

الہام مثلاً ایک بڑی نعمت — جو اصحابِ نسبت کو ملتی ہے، وہ الہام ہے، الہام کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر نظر و استدلال کے اللہ تعالیٰ کوئی حقیقت بندے کے قلب میں القاء فرمادیں، یا کسی غیبی مخلوق کے ذریعہ اطلاع بخش دیں جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدۂ محترمہ کے لئے ارشاد ہے کہ

واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ (سورۂ قصص) — ہم نے موسیٰ کی ماں کی جانب وحی کی کہ دودھ پلاتی رہو۔

یہ وحی باتفاق مفسرین الہام ہے۔ اسی طرح حضرت مریم کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے

واذ قالت الملائکۃ یٰمریم — جب فرشتوں نے کہا اے مریم

فرشتے کا حضرت مریم سے خطاب فرمانا الہام کی قبیل سے ہے، یہ دولت اللہ تعالیٰ صاحب نسبت بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔

موطا امام مالک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے

انا عمر ولم احرص علی امرکم لکن المتوفی اوصیٰ الی بذلک واللہ الھمہ ذلک۔ — میں عمر ہوں اور تم پر حاکم بننے کی مجھے خواہش نہ تھی، لیکن متوفی (یعنی ابوبکر) نے مجھے اس کی وصیت کی اور اللہ نے ان کے قلب میں اس کا الہام فرمایا۔

کشف الہام اور فراست سے مشابہ ایک اور بڑی نعمت اہل نسبت کو میسر آتی ہے وہ کشف ہے، کشف کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے قلب میں عالم غیب کی اشیاء منکشف ہوجائیں اور وہ انھیں اس طرح دیکھے جس طرح ظاہری آنکھوں سے دنیا کی چیزیں دیکھتا ہے، بخاری و مسلم میں حضرت انس بن نضر کا قول مروی ہے انھوں نے فرمایا کہ انی لاجد ریحھا من دون احد میں جبل احد کے پیچھے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔ اس روایت کی شرح میں امام نووی فرماتے ہیں

محمول علی ظاھرہ وان اللہ اوجد ریحھا من موضع المعرکۃ۔ — یہ روایت اپنے ظاہری معنیٰ پر محمول ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی خوشبو میدان جنگ میں محسوس کرادی۔

غزوۂ احد ہی کے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے غزوۂ احد میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں دو شخص سفید لباس پہنے ہوئے بہت سخت لڑائی لڑ رہے تھے میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا یعنی جبرئیل ومیکائیل علیہما السلام ۔ (بخاری ومسلم)

دنیا میں جنت کی خوشبو پالینا اور فرشتوں کو جو غیبی مخلوق ہیں دیکھ لینا ان کا تعلق کشف سے ہے

کشف کی قسمیں کشف کی دو قسمیں ہیں، کشفِ کونی وکشفِ الٰہی، کشف کونی کا مطلب یہ ہے کہ زمان ومکان کی دوری صاحب کشف کے لئے حجاب نہ رہے کسی چیز کا حال معلوم ہوجائے، اور کشف الٰہی یہ ہے کہ علوم واسرار اور حقائق ومعارف خواہ سلوک کے متعلق ہوں یا حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق اسکے قلب پر وارد ہوں، یا عالم مثال میں یہ چیزیں متمثل ہوکر مکشوف ہوں، اور واردات غریبہ ومواجید مثل ذوق وشوق، محبت وانس وہیبت وانکشاف اسرار احکام وحسن معاملہ فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ وغیرہ فائز ہوں، جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد ہے

علوم کشفیہ کا درجہ کشف والہام سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، اگر شرعی قواعد کے مطابق ہے تو قابل عمل ہے ورنہ واجب الترک ہوگا، حقائق ومعارف بھی وہی مقبول ہیں جن کو شریعت رد نہ کرے، رسالہ قشیریہ میں ابوسلیمان دارانی کا قول منقول ہے کہ اکثر میرے دل میں کوئی نکتہ اسرار صوفیہ میں سے آتا ہے مگر میں اس کو بلا دو عادل گواہوں کے کردہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبول نہیں کرتا، اور ابو حمزہ کا قول ہے۔

کل باطن یخالفہ الظاہر فہو باطل جو باطن کہ ظاہر کے خلاف ہو وہ باطل اور مردود ہے۔[1]

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرات صوفیہ کے بیان کردہ حقائق ومعارف جہاں بظاہر کسی ظاہر نص سے ہٹے ہوئے نظر آئیں، تو فوراً ان کا انکار کردیا جائے، اس میں بہت تأمل اور احتیاط سے کام لینا چاہئے، بعض اوقات آدمی کسی آیت یا حدیث کا صحیح مطلب نہیں سمجھ پاتا، اور اپنے ذہن ودماغ سے اس کا کوئی مطلب اخذ کرلیتا ہے، اور پھر اسی کو معیار بناکر علماء وفقہاء کے اقوال

---

[1] عنوان "الہام" سے اس جگہ تک "شریعت وطریقت" سے ماخوذ ہے جو حضرت تھانوی کے افادات وتالیفات سے مرتب کی گئی ہے

کو رد کرتا ہے، اور بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ میرا استدلال قرآن وسنت سے ہے، حالانکہ اس کا حاصل مستدل اس کی اپنی فہم ہے، یہ مصیبت ہمارے اس زمانہ میں بہت عام ہے عموماً لوگ سنجیدگی اور عقلی توازن کے ساتھ قرآن وحدیث پر غور نہیں کرتے، یہ لوگ دوڑتے بھاگتے مختلف مشاغل اور گوناگوں افکار وخیالات میں گرفتار سرسری نظر سے کسی آیت یا حدیث کا کوئی مفہوم اخذ کر لیتے ہیں بس اسی کو حرف آخر سمجھ کر قرآن وحدیث کا درجہ دیدیتے ہیں، حالانکہ یہ ان کا قصور فہم تھا اس ذہنی طغیان نے نہ جانے کتنے حقائق وعلوم کو فنا کر کے رکھ دیا ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی مشائخ اور صوفیہ کی زبان نہیں سمجھتا یہ حضرات کوئی لفظ بولتے ہیں اور اس کا کوئی مخصوص معنی ان کے نزدیک متعین ہوتا ہے لیکن پڑھنے اور سننے والا اس کا اصطلاحی معنی نہیں جانتا وہ اس لفظ کو اسکے لغوی یا عرفی معنی میں مراد لے لیتا ہے اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے ایسی غلطیاں ہر فن میں غیر اہل فن سے ہوتی رہتی ہیں اور اہل علم ان کی تصحیح کر دیا کرتے ہیں مگر اہل تصوف پر اس باب میں بہت ظلم ہوا ہے لوگ تصوف کے حقائق ومسائل سے عموماً آگاہ نہیں ہیں یہ لوگ تصوف کی اصطلاحات کو کسی اور معنی میں لے کر اس کی تردید کرنے لگ جاتے ہیں۔

اسلئے خوب غور کر لینا چاہئے کہ محققین صوفیا ومشائخ جنھوں نے اپنی تمام تر زندگی اپنے سارے اوقات اور اپنا دل ودماغ، جسم واعضا، اور ذہانت وذکاوت بلکہ تمام راحت وآرام رضاء الٰہی کیلئے قربان کر دیا ہے، ان کی زبان وقلم سے نکلا ہوا کوئی علم آسان نہیں ہے کہ اسے رد کیا جائے اگر کہیں اشکال ہو تو رد کرنے سے پہلے غور وتامل سے اس کا مطلب سمجھ لینا چاہئے، اہل فن سے پوچھ لینا چاہئے تاکہ اس کے سمجھنے میں کوئی قصور واقع نہ ہو، پھر بھی دیکھ لینا چاہئے کہ قرآن وحدیث کی جس نص سے یا قاعدے سے ہم اسے رد کر رہے ہیں اس کا بھی وہی مفہوم ہے جو ہم نے سمجھا ہے جب اس کا خوب اطمینان ہو جائے اور علماء فن سے اس کی تصدیق ہو جاتے تب رد کرنے میں کوئی حرج نہیں اور نہ ان حضرات کے مقابلے میں اپنے کو قصور فہم اور قلت تتبع کے ساتھ متہم کرنا زیادہ مناسب ہے، مخلص اہل علم کو اس کا خوب تجربہ ہے کہ بعض اوقات قرآن واحادیث کے ظاہر سے ایک مفہوم ذہن میں آتا ہے، مگر جب کوئی محقق اور دقیقہ رس صاحب علم اس کا صحیح مفہوم بیان کرتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے سمجھا گیا تھا وہ کس قدر بے بنیاد تھا۔ واللہ الموفق۔

✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻✻

مولانا اختر امام عادل، دارالعلوم حیدرآباد

یوں تو تصوف اپنی روح اور اصل کے اعتبار سے عہد نبوی ہی سے موجود ہے، تصوف ہی کی دوسری تعبیر حدیث میں احسان کے لفظ سے کی گئی ہے، مگر باقاعدہ تصوف اور صوفیاء کی اصطلاح اور مستقل ایک روحانی جماعت کی شکل اُسے اس وقت حاصل ہوئی جبکہ عہد صحابہ کے بعد عالم اسلامی میں فتوحات کی کثرت اور دولت کی فراوانی کے نتیجے میں عام طور پر لوگ ذہنی تعیش، راحت پسندی، فکری اضمحلال اور تہذیبی نمائش کے شکار ہونے لگے اور مسلمانوں کے اندر سے وہ اسلامی روح رخصت ہونے لگی جو مومن کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ نجات ہے ایسے وقت میں ایک ردعمل کے طور پر صوفیہ تحریک اٹھی اور بہت تیزی کے ساتھ عالم اسلام کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔

اس تحریک میں بنیادی اہمیت اس کو دی گئی کہ محنت و مشقت اور ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ تزکیۂ نفس اور اصلاح حال کیا جائے، اور پھر اسی زینے سے اللہ کی معرفت حاصل ہو، اور کشف و مشاہدات کے دروازے کھلیں اس میں علمی اور استدلالی بحث و نظر کی قطعاً گنجائش نہیں رکھی گئی، بلکہ علم کو اس راہ کے لئے حجاب اکبر قرار دیا گیا۔

تصوف کی اصطلاح، ماخذ اور حقیقت

تصوف کے بارے میں اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ اصطلاح کہاں سے لی گئی؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے، تاریخ نگاروں اور اہل تحقیق کی رائیں، علم و تاریخ کے مختلف زاویوں کو چھو رہی ہیں مثلاً۔

(۱) بغداد کے مشہور مورخ علامہ ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کا خیال یہ ہے کہ صوفیہ کی نسبت زمانۂ جاہلیت کے ایک صوفہ نامی آدمی کی طرف ہے، اس کا اصلی نام غوث ابن المر تھا، مگر صوفہ کے نام سے وہ مشہور تھا، ابن جوزی کے اس قول کی وجہ نہ معلوم ہوسکی کہ دور جاہلیت کے ایک شخص کی طرف تصوف کی نسبت کس بنا پر کی گئی؟ کیا اس صوفہ نامی آدمی کا ریاضت و مجاہدات کے میدان میں کوئی کردار تھا؟ یا جو لوگ صوفیہ تحریک اٹھانے میں پیش پیش تھے ان کا اس شخص سے کوئی نسلی تعلق تھا؟

(۲) قدیم مورخین میں البیرونی اور جدید تاریخ نگاروں میں فون ھامر کی رائے یہ ہے کہ صوفیہ یونانی لفظ سوفیا سے بنا ہے، یونانی زبان میں سوفیا کے معنی عقل و حکمت کے ہیں اس توجیہ سے ان حضرات کے موقف کی تائید ہوتی ہے جو اس کے قائل ہیں کہ اسلامی تصوف دراصل افلاطونی فلسفے کی شاخ ہے۔

لیکن یہ فہم سے بالاتر چیز ہے کہ مسلمان صوفیاء نے اپنی جماعتی اصطلاح کے لئے عربی لغات کے وسیع ذخیرے سے کیوں استفادہ نہیں کیا؟ اور اس غرض سے ان کو یونان کی خاک کیوں چھاننی پڑی؟ اسلامی فلسفہ میں انھوں نے کیا نقص محسوس کیا؟ کہ فلسفۂ افلاطون میں انھیں پناہ ڈھونڈنی پڑی، فیہ ما فیہ۔

(۳) ایک رائے یہ بھی ہے کہ صوفیہ صوف سے بنا ہے، چونکہ اس وقت کے فقراء عموماً صوف کے کپڑے پہنتے تھے، اس لئے وہ صوفیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔

(۴) کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ صوفیہ صفۃ المسجد النبوی سے بنا ہے، عہد نبوی میں مسجد نبوی سے متصل صفہ ایک چبوترہ تھا، جہاں دنیا سے بے تعلق فقراء صحابہ عبادت میں مشغول رہتے تھے، صوفیاء نے اپنی جماعت کو اسی صفہ کی طرف منسوب کیا۔

(۵) ایک خیال یہ ہے کہ صوفیہ صفا سے مشتق ہے چونکہ یہ مردان باصفا کی جماعت تھی اس لئے صوفیہ کہلانے لگے۔

(۶) بعض اس طرف گئے ہیں کہ صوفیہ صف اول سے بنا ہے، چونکہ ان کا خیال تھا کہ جو شخص تقرب الی اللہ کی غرض سے اس جماعت میں شامل ہوگا وہ انشاء اللہ جنت کے مستحقین

کی صف اول میں شمار کیا جائے گا۔

تصوف کی حقیقت

(۱) حضرت ابوسعید الخراز فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جس کا دل آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو جس میں خدا کی معرفت کا نور جھلکے جسے ذکر الٰہی میں وہ لذت حاصل ہو جو دنیا کی کسی چیز میں نہ مل سکے۔

(۲) ابو محمد الجریری (م ۳۱۱ھ) کہتے ہیں کہ تصوف اخلاق حسنہ کے اپنانے اور عادات بد کے ترک کرنے کا نام ہے۔

(۳) ابوبکر الکتانی (م ۳۲۲ھ) فرماتے ہیں کہ تصوف وفار قلب اور انوار الٰہی کے مشاہدے کا نام ہے۔

(۴) جعفر الخلدی (م ۳۴۸ھ) فرماتے ہیں کہ تصوف یہ ہے کہ انسان اپنے کو بندگی کے لئے وقف کردے اور بشری تقاضوں سے بے نیاز ہو کر حق عزاسمہ کی طرف نگاہ جماوے۔

(۵) شیخ شبلی کا فرمان ہے کہ تصوف کا آغاز اللہ کی معرفت سے ہوتا ہے اور اس کی انتہاء توحید کی منزل ہے۔

(۶) الرسالۃ القشیریۃ کے مصنف علامہ قشیری لکھتے ہیں کہ تصوف وتقویٰ مشتبہ چیزوں کے چھوڑ دینے کا نام ہے۔

مذکورہ بالا اقوال کی روشنی میں تصوف کی بنیادی تصویر سامنے آجاتی ہے، اور یہ بھی پوری طرح واضح ہوجاتا ہے کہ صوفیہ اگر کوئی تحریک تھی جیسا کہ بعض تاریخ نگاروں کا کہنا ہے تو یہ کسی دنیوی مفاد پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کی منزل وہی تھی جس کو حدیث احسان میں بیان کیا گیا ہے۔

الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (الحدیث)

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو پھر اگر تم خدا کو نہیں دیکھ سکتے تو کم از کم یہ خیال تو ضرور قائم رہے کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے صوفیاء کرام کے مذکورہ بالا اقوال کو جو مناسبت ہے وہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے

تصوف کی اہم ترین شخصیات

تصوف کی اصطلاح اور اس کی حقیقت سے روشناس

ہونے کے بعد آیئے ایک نظر ان شخصیات پر ڈال لیں جو تصوف میں کردار کی حیثیت رکھتی ہے ان شخصیات کے مقام و مرتبہ کے تناسب سے تصوف کی اہمیت کا اندازہ کرنا بھی آسان ہوگا۔

① رابعہ بصریہؒ اسلامی تصوف کی یہ وہ مایۂ ناز خاتون ہیں، جن کی نظیر انسانی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے ایک ایسی خاتون جس نے اپنی تمامتر خواہشات اور تقاضوں کو پامال کرکے زہد و تقویٰ کا وہ مقام حاصل کیا کہ بہت سے مردوں سے بھی آگے نکل گئی، عشق الٰہی کا وہ چراغ ان کے سینے میں روشن تھا جو اندھیریوں کے دبیز پردے کو بھی چاک کرنے کے لئے کافی تھا، انھوں نے محبت الٰہی کی شمع اس وقت جلائی تھی جب کہ اسلامی فتوحات، دولت کی بہتات اور فتنوں کی رہ رہ کر اٹھان نے لوگوں کے ذہنوں کو آلودہ کردیا تھا اور تاریکیاں دن بدن گہری ہوتی جارہی تھیں، ان باطنی کمالات کے ساتھ وہ صوفیانہ ادب میں بھی سند کا درجہ رکھتی ہیں، ان کا کلام کھوکھلی شاعری اور نرے ادب سے الگ ایک چیز تھی، ان کے کلام میں وہ تاثیر تھی جو نغمۂ داؤدی کی یاد تازہ کرتی تھی۔

ان کی وفات کے بارے میں مختلف تاریخیں ملتی ہیں، ۱۳۵ھ یا ۱۸۰ھ یا ۱۸۵ھ، ان کی وفات سے نسوانی تاریخ میں جو خلا پیدا ہوا وہ آج تک پُر نہ ہوسکا ان کے بعد امت ایسی ماؤں کے لئے ترس گئی جن کے سینے میں لخت جگر کی محبت سے زیادہ محبتِ الٰہی کا طوفان اپنی تاثیر دکھاتا ہو۔

② ابراہیم ابن ادہمؒ ابراہیم ابن ادہم صرف تاریخی شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل تاریخ کا نام ہے وہ صرف عہد ساز نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی تعبیر تھے، اقوام و ملل کی تاریخ میں ایسی مثالیں نایاب ہیں کہ یادِ الٰہی کی طلب نے کسی کو تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور کردیا ہو، مگر ہاں امت محمدیہ میں حضرت ابراہیم بن ادہم ایک ایسی ہی مثالی شخصیت تھے جن پر صرف امت محمدیہ نہیں بلکہ پوری تاریخ بھی ناز کرے تو کم ہے جنھوں نے محض اللہ کی محبت کی خاطر تاج و تخت پر لات ماردی تھی، اور صحرا و بیابان کی راہ لی تھی، پھر زہد و تصوف کی راہ سے وہ روحانی اور ابدی حکومت حاصل کی تھی جس کا دائرہ محدود انسانیت تک نہیں بلکہ پوری کائنات پر محیط تھا مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ

جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔ جب خدا اس کا ہے تو خدا کی پوری کائنات اس کی ہے۔ آپ کی وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی۔

۳ سفیان ثوریؒ

حضرت سفیان ثوری صف اول کے صوفیا میں ہیں جن کو علم کے ساتھ زہد کی دولت بھی حاصل تھی، لوگ عام طور پر سفیان ثوری کو ایک فقیہ اور مجتہد امام کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ علم کے ساتھ زہد و تقویٰ اور تصوف و طریقت کے بھی امام تھے۔ انھی کا یہ مشہور فرمان جگہ جگہ تصوف کی کتابوں میں ملتا ہے۔

"کہ زہد دنیا سے اپنی تمام امیدیں منقطع کر لینے کا نام ہے، کھُردرا کپڑا پہننے یا جبہ و دستار کی بندش کا نام نہیں"

آپ کی زندگی ان تمام علماء کیلئے مینارۂ نور ہے، جو علم کے ساتھ احسان کی منزل کے بھی طلبگار ہیں، آپ کی ولادت ۹۵ھ اور وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی۔

۴ ذوالنون مصریؒ

حضرت ذوالنون مصری، صرف زاہد فقیر نہیں بلکہ مستقل مدرسہ تصوف تھے، یہ وہ شخصیت تھی جس نے تصوف میں مستقل باب معرفت کی بنیاد ڈالی، ان کا کہنا تھا کہ مجھے رب کی معرفت اپنے رب ہی کے ذریعہ حاصل ہوئی، اگر رب مددگار نہ ہوتا تو میں اپنے رب کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

معرفت کا یہ وہ راز تھا جس کا انکشاف سب سے پہلے ذوالنون مصری کی زبانی ہوا، رب کو رب ہی کے ذریعہ پہچاننا ایک ایسی منزل ہے جہاں برسوں کی ریاضت کے بعد بھی انسان مشکل ہی سے پہونچتا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری قبطی النسل تھے، بعض روایات کے مطابق ان کا شجرہ نوبی خاندان سے ملتا تھا، آپ کی وفات ۲۴۵ھ میں ہوئی۔

۵ ابوالقاسم جنید بغدادیؒ

حضرت جنید بغدادی نسبی اعتبار سے نہاوند سے تعلق رکھتے ہیں آپ کی ولادت عراق کے تاریخی شہر بغداد میں ہوئی اور وہیں آپ نے پرورش پائی، آپ حارث المحاسبی کے خصوصی شاگرد تھے آپ نے تصوف و معرفت کی دنیا میں ایسے پائیدار اور روشن نقوش چھوڑے ہیں جن سے

رہتی دنیا تک رہنمائی اور روشنی حاصل کی جاتی رہے گی، جنید بغدادی کا نام سنتے ہی تصور میں زہد وتقویٰ کی وہ مثالی منزل جھلکنے لگتی ہے، جہاں تک رسائی کے لئے تخیل کو بھی کافی گردش دینے کی ضرورت پڑتی ہے، حضرت جنید بغدادی کا یہ مشہور مقولہ صوفیا کی زبان زد ہے کہ

"تصوف یہ ہے کہ حق کے ساتھ انسان کو ایسی محویت پیدا ہوجائے کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھول جائے، اس کا وجود بھی حق کی راہ میں فنا ہوجائے، پھر اسے بقاء باللہ کی منزل نصیب ہوجائے۔"

جب آپ سے ان اہل معرفت کے بارے میں سوال کیا گیا جن پر استغراق کا ایسا غلبہ ہو کہ ظاہری اعمال خیر بھی ان سے متروک ہوجائیں تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا،

"کہ یہ لوگوں کی نگاہ میں خواہ کتنا ہی بعید ہو، مگر میرے نزدیک یہ بہت بڑا مقام ہے اور جو لوگ ان اہل معرفت پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ میرے نزدیک زناکاروں اور چوروں سے بھی بدتر ہیں"

آپ ۲۹۷ھ میں اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملے۔

۶ بایزید بسطامی رح

حضرت بایزید بسطامی کے دادا مجوسی اور والد زردشت مذہب کے ماننے والے تھے مگر اللہ نے ان کو ایمان ومعرفت کے نور سے نوازا، پھر وہ اس میں اس قدر آگے گئے کہ روحانی دنیا کے تاجدار بن گئے تصوف کی کتابیں ان کے واقعات، کرامات اور اقوال سے بھری ہوئی ہیں، تصوف کی کتابوں میں جب سلطان الاولیاء کا لقب آتا ہے تو عام طور سے اس سے مراد حضرت بایزید بسطامیؒ ہی ہوتے ہیں۔

انہی کے بارے میں وہ مشہور واقعہ کتابوں میں موجود ہے کہ ایک بار وہ ایک بہت ہی مشہور بزرگ کے پاس بڑی عقیدت کے ساتھ ملنے گئے مگر جب وہ ان کے آستانے پر حاضر ہوئے تو بزرگ محترم کو قبلہ کی طرف تھوکتے دیکھا، اس منظر کو دیکھتے ہی وہ الٹے قدم لوٹ گئے، اور بزرگ کو سلام تک نہ کیا، ان سے جب اس کی وجہ دریافت کی گئی تو حسرت آمیز لہجے میں کہا ــ :

• کہ جب یہ شخص دربار رسالت کا ادب شناس نہیں ہے تو اس کے بارے میں آخر کیسے باور
کرلیا جائے کہ یہ اپنے دعویٔ ولایت میں صادق ہوگا۔

یہ عشق کا بڑا اعلیٰ مقام ہے جس کی خواجہ بایزید بسطامی بات کر رہے ہیں، ورنہ عوام تو کیا خواص
کو بھی ان چیزوں کی تمیز نہیں رہتی، تھوکتے وقت کسی کو خیال بھی نہیں آتا کہ میرا رخ قبلہ کی طرف
تو نہیں ہے؟ اور اسی طرح روضۂ اقدس بھی ہے ؎

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے ایک تاریخ ۲۳۴ھ ہے اور دوسری ۲۶۱ھ ہے

۷ منصور الحلاجؒ

آپ کا پورا نام ابومغیث الحسین ابن منصور الحلاج ہے، ولادت فارس میں ۲۴۴ھ میں ہوئی، آپ کے دادا زردشت مذہب کے
ماننے والے تھے، آپ کی تربیت عراق کے مشہور شہر واسط میں ہوئی۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کی شخصیت ایسے تہ در تہ پردوں میں مستور ہے کہ
ان کی حقیقت تک رسائی بہت مشکل ہے، خدا نے ان کو کس منزل کا مسافر بنایا تھا اس کو
وہی لوگ جانیں جو ایسی منزلوں کا سفر کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کے اسی ابہام کا اثر ہے کہ
آج بھی کچھ لوگ ان پر نکتہ چینی کر رہے ہیں اور خود ان کی زندگی میں بھی لوگ ان کو نہ سمجھ سکے، ان
کی اداؤں کے رموز و اسرار سے واقف نہ ہو سکے، ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا، ان پر چار ایسے
زبردست الزامات تھے کہ جن کی صفائی منصور نہ کر سکے اور نہ کرنے پر وہ قادر تھے بالآخر وہی ہوا
جو شریعت کا فیصلہ تھا، ان کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا، اور ایک نامعلوم منزل کا مسافر، عشق
کی بے تاب کروٹیں بدلتا ہوا ۳۰۹ھ میں ابدی نیند سو گیا۔ ؎

جان ہی دیدی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

ان پر لگائے گئے چار الزامات یہ تھے۔

(۱) ان کا تعلق باطنیہ نواز ایک مشہور شیعہ فرقہ قرامطہ سے تھا۔

(۲) ان کی زبان سے اکثر انا الحق کا جملہ نکلتا تھا جسکے ظاہری معنی ہیں کہ میں خدا ہوں۔

(۳) ان کے معتقدین ان کو خدا تصور کرتے تھے اور اس پر وہ خاموش رہتے تھے۔

(۴) حج کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ ایسا فرض نہیں ہے جس کو ادا کرنا ضروری ہے۔

۸ حجۃ الاسلام ابو حامد الغزالیؒ

امام غزالی کا شمار کبار صوفیاء میں ہوتا ہے، بلکہ ان کو معرفت کا امام قرار دیا گیا ہے، ان کی ولادت سنہ ۴۵۰ھ کو خراسان کے مشہور شہر طوس میں ہوئی، آپ نے جرجان اور نیشاپور کا سفر کیا، نظام الملک سے گہرے روابط کی بنا پر بغداد کے سب سے بڑے جامعہ مدرسہ نظامیہ میں تدریس پھر صدارت کا منصب حاصل کیا، اس مدرسہ میں رہ کر آپ نے اسلام کی وہ مثالی خدمات انجام دی ہیں جسے تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی، مدرسہ میں قرآن و حدیث فقہ و کلام کا درس دینے کے علاوہ آپ نے فلسفۂ یونان اور فرقہ باطنیہ کا ایسا تاریخی تعاقب کیا ہے جس نے فلسفہ اور باطنیت کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا، آپ کی مایۂ ناز کتاب تہافت الفلاسفہ نے علمی دنیا سے وہ زبردست خراج تحسین وصول کیا ہے جو اس موضوع کی بہت کم کتابوں کو حاصل ہوا، مدرسہ نظامیہ کے پورے دورِ قیام میں امام غزالی کی شخصیت ایک متکلم اسلام، دین کے زبردست سپاہی اور ملت کے جانباز مجاہد کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی تھی، لیکن ایک عرصہ تک منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھانے اور فقہ و کلام کی باریکیاں سمجھانے کے بعد ان کے اندر ایک عجیب و غریب ذہنی انقلاب پیدا ہوا، ان کے اندر خلق بیزاری اور خدا طلبی کی کیفیت پیدا ہوئی اور مرکز علم و فن بغداد جیسا ثقافتی و تاریخی شہر انھیں ایک ویران قبرستان محسوس ہونے لگے، بغداد کی پررونق آبادی اور فلک بوس عمارتیں انھیں بیابان کے کھنڈرات سے زیادہ وحشتناک معلوم ہونے لگیں، ان کو خلوت و یکسوئی کی ضرورت تھی جو اس گنجان شہر میں انھیں میسر نہ ہو سکتی تھی، آخر ایک دن وہ کسی طرح شہر سے نکلے اور صحرا و بیابان کی راہ لی، اسی کے بعد ان کا وہ یادگار سفر شروع ہوا جس میں ۴۸۸ھ دمشق پہنچے، دمشق کی جامع مسجد کے ایک منارے میں اعتکاف کیا، پھر وہاں سے مجنونانہ انداز میں بیت المقدس پہونچے، انبیاء کے اس مقدس شہر اور مسلمانوں کے قبلۂ اول میں نہ معلوم انھوں نے کیا کیا حاصل کیا، کافی دنوں ٹھہرنے کے بعد جب عشق نے اجازت دی تو وہ وہاں سے گرتے پڑتے حجاز پہونچے اور خانۂ کعبہ کی زیارت کے بعد آستانۂ رسالت پر حاضر ہوئے

پھر وہ کن کیفیات اور حالات سے دوچار ہوئے وہ جانیں اور ان کا خدا جانے، مدینہ طیبہ کی نہر سلسبیل سے جب عشق کی آگ میں کچھ ٹھنڈک آئی، تو وہ اپنے وطن واپس ہوئے وطن کے علم دوستوں سے ملاقات ہوئی تو اپنے دس سالہ سفر کے تجربات کا نچوڑ۔ احیاء علوم الدین کتاب کی شکل میں پیش کیا، جب ان سے ان کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کا راز دریافت کیا گیا تو انھوں نے "المنقذ من الضلال" جیسی قیمتی کتاب لکھ کر اس راز کا انکشاف کیا۔

غرض امام غزالی صرف تصوف نہیں بلکہ انسانی تاریخ کی ان عظیم ہستیوں میں تھے جن کی زندگی انقلابات سے بھرپور اور عبرتوں سے معمور تھی، وہ دین حق کے روشن چراغ تھے جس سے نہ معلوم کتنے چراغوں نے روشنی حاصل کی یہ چراغ مسلسل پچپن سال تک جلتا رہا اور صفحۂ گیتی پر اپنی روشنی بکھیرتا رہا، مگر دیکھتے ہی دیکھتے ۵۰۵ھ میں یہ چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا مگر اس کا نور آج بھی اہل معرفت کے دلوں کا طواف کر رہا ہے، وہ اب پھر کسی بیت المقدس کے راہی اور دمشق کے مسافر کا طلب گار ہے۔ جس کے سینے میں وہ ایک ابدی امانت بن کر رہ سکے

۹ ابوالفتوح شہاب الدین السہروردی

ان کی پیدائش ۵۴۹ھ میں ایران کے ایک مقام سہرورد میں ہوئی، یہ مستقل ایک سلسلۂ تصوف کے امام اور بانی ہیں جو سلسلۂ سہروردیہ کے نام سے مشہور ہے، ان کا رجحان اشراقی فلسفہ کی طرف تھا، بلکہ کہا جاتا ہے کہ اشراقی فلسفہ کے ایک مدرسہ کی حیثیت ان کو حاصل تھی۔

ان کی زندگی کے حالات ایسے پیچ در پیچ اور واقعات کے نشیب و فراز اتنے عجیب تھے کہ اصل حقیقت تک پہونچنا عام نگاہوں کے لئے مشکل ہوگیا، چنانچہ ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو راہ حق کے دیوانوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے، حق کے فرزانوں کی تاریخ نے اپنا سبق دہرایا اور دار و رسن کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، حضرت شہاب الدین سہروردی پر علماء حلب کی جانب سے قتل کا فتوی صادر کیا گیا اور اس فتوی کے مطابق سوریا کے مقام پر ۵۸۷ھ میں اس شہید ناز نے اپنی جان بائے ناز نیں پر نچھاور کر دی، ابھی وہ عمر کی

صرف ۳۸ بہاریں دیکھ پائے تھے کہ ان کو خزاں کی گود میں ہمیشہ کے لئے سلا دیا گیا۔

حضرت سہروردی نے فلسفہ، اشراق اور تصوف کے موضوع پر چند کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں حکمۃ الاشراق ہیاکل النور، التلویحات العرشیہ، اور المقامات خاص شہرت کی مالک ہیں۔"

۱۰: **شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ** ان کی ولادت ۵۶۰ھ میں اندلس کے اندر ہوئی، بعد میں اندلس سے رخصت ہوکر مصر چلے گئے تھے، مصر کے قیام کے زمانے میں حج کا خیال پیدا ہوا، چنانچہ حج کے لئے روانہ ہوئے، حجاز پہونچکر حج کیا، حج سے واپسی میں بغداد تشریف لائے، بغداد میں کچھ دنوں ٹھہر کر دمشق کو آخری مستقر کی حیثیت دی، اخیر عمر تک وہیں رہے، وہیں وصال ہوا اور خاک دمشق کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئے، شیخ اکبر ایک مستقل فلسفہ ر تصوف کے امام کی حیثیت رکھتے ہیں، وحدۃ الوجود کا نظریہ تو انہی کی جانب منسوب ہی ہے گروہ اولیاء سے ان کو خاتم الاولیاء کا خطاب دیا گیا، یہ بھی راہ حق کے ان دیوانوں میں سے تھے جن کے عشق کی داستان دلدوز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک معمہ بن گئی تھی معرفت کی منزل کا یہ منتہی مسافر کس کس مقام کی بات کرتا تھا وہ عام فہم سے بالاتر بات تھی، ان کے "انسان کامل" کے نظریے نے تو علم و آگہی کی دنیا میں تہلکہ مچا دی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس نظریے کی بنیاد اس پر تھی کہ ایک انسان پر جب وحدانیت کی منزل میں استغراقی کیفیت غالب ہو جاتی ہے تو اس بات کے روشن امکانات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس انسان کے اندر خدائی صفات کا ظہور ہونے لگے۔

یہ معرفت کا غالباً وہی مقام ہے جس کی نشاندہی ایک حدیث قدسی میں کی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بندہ میری طرف ایک ہاتھ آتا ہے، تو میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں، اور بندہ جب چل کر آتا ہے تو میں دوڑ کر آتا ہوں، پھر وہ میری عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اسکا ہاتھ میرا ہاتھ، اسکا پاؤں میرا پاؤں اسکی آنکھ میری آنکھ اس کی زبان میری زبان ہو جاتی ہے پھر اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ در حقیقت خدا کی زبان سے صادر ہوتا ہے

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ الآیۃ۔ اور آپ نے نہیں پھینکا جس وقت آپ نے پھینکا تھا، بلکہ اللہ نے پھینکا تھا۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ شیخ اکبر کے اس نظریہ پر وہ شور و غوغا مچا، اور ایسی ہنگامہ آرائی ہوئی کہ چشم فلک نے کسی عارف اور عاشق حق کے خلاف کم اس قسم کی معرکہ آرائی دیکھی ہوگی، ان پر کفر و شرک کے فتوے لگائے گئے ان کو آزمائشوں میں ڈالا گیا انھی آزمائشوں سے دوچار ہوتے ہوتے آخرکار ۶۳۸ھ میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے حریفوں کی بزم سے رخصت ہوگئے اور اپنے پیچھے اس حسرت آمیز صدا کی ابدی گونج چھوڑ گئے ؎

مجھ سا مشتاق نہ پاؤگے زمانے میں کہیں
گرچہ ڈھونڈوگے چراغ رخ زیبا لیکر

شیخ اکبر ایک عارف و زاہد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ مصنف بھی تھے، مختلف موضوعات پر آپ کی کتابوں کی تعداد چار سو تک پہونچتی ہے، جن میں روح القدس، ترجمان الاشواق، الفتوحات المکیہ اور فصوص الحکم شہرۂ آفاق کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۱ ابوالحسن الشاذلیؒ

حضرت ابوالحسن شاذلیؒ ۵۹۳ھ میں مرسیہ کے قریب ایک گاؤں کے اندر پیدا ہوئے، بعد میں وہ تونس منتقل ہوگئے تھے وہیں سے ان کو کئی بار حج کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، پھر عراق چلے گئے اور اخیر تک وہیں رہے عراق ہی سے ایک بار حج کا سفر کر رہے تھے کہ عیذاب کے جنگل میں ۶۵۶ھ کو وہ آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

آپ ایک مستقل سلسلۂ تصوف شاذلیہ کے امام اور بانی ہیں، آپ کی طرف بے شمار کشف و کرامات منسوب ہیں، آپ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ۔

"ہم اللہ کو ایمان و یقین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے ہمیں دلیل و برہان کی روشنی میں خدا کو پہچاننے کی ضرورت نہیں"

۱۲۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحؒ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، آپ پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ صوفیاء میں کم ہی کسی پر اتنا لکھا گیا ہوگا، آپ کی ولادت جیلان میں ۴۷۰ھ میں ہوئی اور ۵۶۱ھ میں وفات ہوئی، آپ کا مزار مبارک بغداد میں مرجع خلائق بنا ہوا ہے، آپ مستقل سلسلۂ تصوف قادریہ کے امام اور بانی ہیں آپ بلند پایہ ولی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے زبردست عالم دین بھی تھے، آپ کو علوم عصریہ پر بھی مکمل دستگاہ حاصل تھی، تقریر و خطابت میں آپ کی کوئی مثال نہ تھی بلکہ تاریخ نے آپ کے جلسۂ خطابت کی جو رپورٹ محفوظ کی ہے اس کی روشنی میں تو آج تک آپ جیسا سحرالبیان خطیب پیدا نہ ہوا، آپ کی کرامات بے شمار ہیں، صوفیاء نے آپ کو چار اساسی اقطاب میں سے پہلے درجے کا قطب تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو انچاس اولادیں عطا فرمائی تھیں، جن میں سے گیارہ لڑکوں نے اپنی زندگیاں قادری سلسلے کے فروغ و اشاعت ہی کے لئے وقف کر دیں، اور کہنا چاہئے کہ حضرت شیخ کی تعلیمات اور اصول کی غیر معمولی وسعت و پھیلاؤ میں جہاں شیخ کے کبار خلفاء کا زبردست ہاتھ ہے وہیں آپ کی صلبی اولاد کا بھی مثالی کردار رہا ہے، اللہ حضرت شیخ، ان کی ذریات اور ان کے تمام متعلقین و متوسلین پر اپنے بے پناہ رحمتوں کی بارش فرمائے آمین۔

ع:۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

۱۳ احمد الرفاعیؒ

آپ کا نسبی تعلق عرب کے قبیلہ بنی رفاعہ سے تھا اور اسی لئے رفاعی آپ کی شہرت کا جزو بن گیا ہے، تصوف میں آپ کی جلالت شان اور علو مرتبت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ صوفیاء کے نزدیک چار اساسی اقطاب میں آپ دوسرے درجہ کے قطب مانے گئے ہیں، آپ نے ریاضت و مجاہدہ اور زہد و تقویٰ میں اتنے مبالغہ سے کام لیا کہ آپ کا زہد ضرب المثل بن گیا، آپ کی کرامات بہت ہیں آپ مستقل ایک سلسلۂ تصوف رفاعیہ کے امام اور بانی کی حیثیت سے معروف ہیں۔

ایک طویل عرصہ تک لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا، یہاں تک کہ وقت موعود آپہونچا اور ۵۷۸ھ میں پورے عالم اسلامی کو عموماً اور تصوف کو خصوصاً آپ سوگوار چھوڑ گئے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

۱۴- شیخ احمد البدوی آپ مصر کے سب سے بڑے ولی کی حیثیت سے خاص امتیاز رکھتے ہیں، آپ کی ولادت ۵۹۶ھ میں مصر کے مقام فاس میں ہوئی، خدا نے آپ کو حج کی سعادت سے نوازا، حج سے فارغ ہوکر عراق تشریف لائے اور عراق کے مشہور مقام طنطا پر مستقل مقیم ہوگئے یہاں تک کہ ۶۳۴ھ میں طنطا ہی کی خاک کی امانت بن گئے آپ کا مزار مقصود خلائق بنا ہوا ہے۔

دنیائے تصوف میں آپ کو چار اساسی اقطاب میں تیسرے درجے کا قطب قرار دیا گیا ہے زہد و تقویٰ اور دنیا بیزاری میں آپ تاریخی حیثیت کے حامل ہیں، آپ نے اپنے کو عبادت الٰہی کے لئے وقف کردیا تھا، زندگی کی سب سے بڑی نعمت نکاح سے بھی اپنے کو محروم رکھا تھا آپ احمدیہ سلسلۂ تصوف کے امام و پیشوا ہیں، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ فقر و غنا، زہد و توکل اور تصوف و تقویٰ کے ساتھ آپ اپنے وقت کے ایک ممتاز شہسوار بھی تھے، تاریخ کے مطابق مصر و عراق میں آپ کی شہسواری کا جواب نہ تھا، موجودہ زمانے میں عالم اور مجاہد، صوفی اور بہادر، شیخ اور سپاہی، اور بزرگ اور ماہر جنگ متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں، کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ کوئی عالم بھی مسندِ تدریس پر فائز رہتے ہوئے ایک بہترین شہسوار ہوسکتا ہے اور کوئی شیخ وقت بھی، وقت آنے پر خانقاہ کی مسند بیعت و ارشاد چھوڑ کر میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھا سکتا ہے؛ مگر امام الطریقت شیخ احمد بدوی کو اللہ نے انھی متضاد کمالات کا حامل بنایا تھا جن کی مثال تاریخ بار بار پیش نہیں کرسکتی ے

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

۱۵- ابراہیم الدسوقی رح آپ کی ولادت ۶۳۳ھ میں ہوئی آپ دسوقیہ سلسلے کے امام اور بانی ہونے کے ساتھ ساتھ چار اساسی اقطاب میں چوتھے درجے کے قطب بھی ہیں، آپ جس طرزِ اصلاح اور طریق تعلیم کے حامل اور داعی تھے، وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی، آپ زندگی کی تمام لذتوں سے دستبردار ہوجانے کی دعوت دیتے تھے، اور خود اس کی واضح مثال تھے۔ آپ کے فیض سے پورا عالم مستفید ہو رہا تھا۔ آپ کے وجود سے

پوری دنیا کے تصوف میں ایک خوشگوار حرکت تھی، ۷۶۶ھ میں یہ حرکت اچانک بند ہوگئی اور وہ زاہد اکبر جنھوں نے اپنے کو زندگی کی تمام لذات سے بے نیاز کر لیا تھا ایک وقت آیا کہ خود زندگی کی بھی انھیں ضرورت نہ رہی، اور یہ امانت، مالکِ امانت کے سپرد کرکے بقار کی اس منزل کی طرف چل پڑے جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آسکتے ہیں، وہ ہمیشہ کے لئے اس ڈوبتی اور ابھرتی دنیا کو بے سہارا چھوڑ گئے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

۱۲ ۔ خواجہ بہار الدین نقشبندیؒ

آپ کا پورا نام شیخ بہار الدین محمد ابن محمد البخاری ہے، آپ کی ولادت بخارا میں ۷۱۸ھ میں ہوئی، آپ ایک مشہور سلسلۂ تصوف نقشبندیہ کے امام اور بانی ہیں اور اسی لئے نقشبند آپ کے نام کا جزو بن گیا ہے، آپ شاہ نقشبند کے لقب سے جتنی جلد پہچانے جاتے ہیں اتنی آسانی سے نام کے ذریعہ نہیں، آپ کی عظمت و منزلت کا اندازہ آپ کے اس جملے سے ہوتا ہے جو ہر نقشبندی بزرگ کے لئے ایک وظیفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

"جہاں عارفین و کاملین پہونچ کر رک جاتے ہیں اور اس سے آگے بڑھنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی وہیں سے میرے سفر معرفت کا آغاز ہوتا ہے۔"

اس جملے میں وہ کس مقام کی بات کر گئے ہیں اس سے تو وہی لوگ واقف ہوں گے یا ہوسکتے ہیں جنھیں کبھی ایسے سفر کا اتفاق یا سعادت حاصل ہوئی ہو، حضور کی یہ حدیث ایسے ہی بزرگ علمار کی سوانح دیکھ کر یاد آتی ہے جس کے الفاظ میں اگرچہ کچھ کلام ہے مگر معنی بالکل صحیح ہیں کہ علمار امتی کانبیار بنی اسرائیل الحدیث: "میری امت کے علمار بنی اسرائیل کے انبیار کے مانند ہیں۔"

آپ ۷۹۱ھ میں دنیا سے رخصت ہوگئے مگر آپ کا سلسلہ، آپ کی تعلیمات اور آپ کی یادیں آج تک زندہ ہیں، ایسا لگتا ہے کہ شاہ نقشبند کہیں نہ کہیں زندہ موجود ہیں۔

"لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون ۰"

: جو لوگ اللہ کی راہ میں مرتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم ان کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتے :

تصوف کی اہم شخصیات کی فہرست یہیں پر ختم نہیں ہوتی، صوفیا اور بزرگانِ دین کے تذکروں سے درجنوں کتابیں بھری ہوئی ہیں، مجھے ان تمام فہرستوں کا احاطہ مقصود نہیں ہے اور نہ اس مختصر سے مضمون میں اس کی گنجائش ہے، میں تصوف کے تعارف کے ذیل میں کم از کم ان شخصیات کا ذکر ضروری سمجھتا تھا جن کے بغیر تصوف کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اور جو پر تصوف میں غلو کرنے کا الزام ہے، ورنہ تصوف کی روح کے اعتبار سے تو ہر مومن صالح اپنے وقت کا بہترین صوفی ہے۔

افکار و تعلیمات

کسی بھی جماعت کے مخصوص افکار و نظریات اس کے تعارف کی راہ میں بہت معاون ثابت ہوتے ہیں، اس لئے آیئے تصوف کے کچھ مخصوص افکار و خیالات، تعلیمات و اصلاحات پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال لیں تاکہ صوفیہ تحریک کی تہ اور اسکے حقیقی خط و خال تک ہم پہونچ سکیں۔

(۱) ــــ صوفیاء کا خیال ہے کہ دین کے دو رخ ہیں، شریعت اور حقیقت

۱ :۔ شریعت دین کے ظاہری حصے کا نام ہے، اور یہ ایسا دروازہ ہے جس میں ہر وہ شخص داخل ہو سکتا ہے جس نے کلمۂ توحید کا دل سے اقرار کیا ہو۔

۲ :۔ مگر حقیقت، دین کی اس روح کا نام ہے جس تک رسائی ہر ایک کیلئے ممکن نہیں، یہ نہاں خانۂ فطرت کا وہ راز سربستہ ہے جسے سوائے اہلِ ریاضت و تقویٰ کے کوئی نہیں پا سکتا۔

(۲) ــــ صوفیاء کی نگاہ میں تصوف، طریقت اور حقیقت کے مجموعے کا نام ہے۔

(۳) ــــ تصوف کے لئے روحانی قوت اور باطنی تاثیر ضروری ہے جو شیخ طریقت کے واسطے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۴) ــــ اس راہ کے مسافروں کے لئے ذکر و فکر اور مراقبہ ضروری ہے، مراقبہ کا مطلب یہ ہے

کہ اپنی پوری ذہنی قوت ملاء اعلیٰ کی طرف مرکوز کردے اور اوپر سے انوار و تجلیات کے نزول کا انتظار کرے، صوفیاء کے نزدیک یہ وہ مقام ہے جو صرف اولیاء کو حاصل ہوتا ہے۔

(۵) صوفیاء شرعی احکام کی پوری پابندی کو لازم قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک شریعت حقیقت سے مقدم ہے، شریعت میں جو ناقص ہوگا اسے طریقت میں بھی ناقص قرار دیا جائیگا وہ اس معاملے میں اسی طرح سخت ہیں جس طرح کہ اہل شریعت علماء ــــ شریعت کے احکام اور امر و نواہی کی ان کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے صوفیاء کرام کے چند اقوال نقل کر دینا مناسب ہوگا۔

۱:۔ حضرت سہل التستری ؒ فرماتے ہیں: "طریقت کے لازمی اصول سات ہیں، قرآن پر مضبوطی سے قائم رہنا، سنت نبوی کی پیروی کرنا، حلال کھانا، ایذاء رسانی سے بچنا، گناہوں سے پرہیز کرنا، توبہ کا التزام کرنا، حقوق کی ادائیگی میں سستی نہ کرنا۔"

۲:۔ حضرت ابوالحسن شاذلی ؒ فرماتے ہیں: "جب تمہارا کشف کتاب و سنت کے کسی حکم سے ٹکرا جائے تو کتاب و سنت کو تھام لو اور اپنے کشف کو دیوار پر مار دو۔"

۳:۔ حضرت شاذلی ؒ ہی فرماتے ہیں: "جب کوئی صوفی پنج وقتہ باجماعت نماز کا پابند نہ ہو تو ہرگز قابل توجہ نہیں، وہ کسی لائق نہیں ہے۔"

۴:۔ حضرت بایزید بسطامی ؒ فرماتے ہیں: کسی شخص کے کشف و کرامات کو دیکھ کر متاثر نہ ہوجانا اگر کوئی شخص ہوا میں بھی اڑتا ہوا دکھائی دے تو اس اڑان کو دیکھ کر فریب نہ کھانا، تمہارے نزدیک معیار یہ ہونا چاہئے کہ قرآن و حدیث کے اوامر و نواہی اور شریعت کے احکام کا وہ پابند ہے یا نہیں؟ شریعت کے حدود سے اس کے قدم تجاوز تو نہیں کر گئے ہیں؟ اگر وہ شریعت کا پابند ہے تو ولی ہے ورنہ اس کی کرامات شیطانی خرافات اور کید و فریب کے سوا کچھ نہیں" ــــ حضرت بایزید بسطامی ؒ ہی کا قول ہے کہ۔

۵:۔ اگر کوئی آدمی اپنی جائے نماز پانی پر بچھادے اور فضا میں چار زانو بیٹھ جائے تو بھی اس وقت تک فریب میں نہ آنا جب تک کہ یہ جائزہ نہ لو کہ وہ شریعت کے معاملے میں کیسا ہے

۶ :- امام غزالی رح فرماتے ہیں :- اگر تم کسی ایسے انسان کو دیکھو جو ہوا میں اڑتا، اور پانی پر چلتا ہو، اور خلافِ شرع کام بھی کرتا ہو، تو یقین کرلو کہ وہ شیطان ہے۔

(۶)ــــ صوفیاء کی ترجمانی کرتے ہوئے امام غزالی نے لکھا ہے کہ تنہا عقل، معرفت کے لئے کافی نہیں بلکہ عقل سے بالاتر کسی ایسے طریق کی ضرورت ہے، جس پر چلنے کے بعد انسان کو وہ چشم بینا حاصل ہوجاتے جس کی روشنی میں اسے ایک طرف انوار الٰہی کی جھلکیاں نظر آئیں تو دوسری طرف ملاء اعلیٰ کی کچھ خاص باتوں اور مستقبل کے اہم واقعات پر بھی اس کی نظر جاسکے۔

امام غزالی رح فرماتے ہیں کہ یہ چشم بینا اور نور معرفت بغیر صوفیاء اور عارفین کی راہ پر چلے حاصل ہونا مشکل ہے اس پر انھوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویائے صادقہ اور سچی پیشین گوئیوں سے استدلال کیا ہے۔

(۷)ــــ صوفیاء علم لدنی کے بھی قائل ہیں جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ صرف انبیاء و اولیاء کو حاصل ہوتا ہے جیسے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں خود قرآن نے علم لدنی کی خبر دی ہے۔ وعلمناہ من لدنا علما۔ اور ہم نے ان کو اپنی جانب سے ایک خاص علم سکھایا

(۸)ــــ ان کے نزدیک فنا ایک بہت بڑا مقام ہے، صوفیاء میں فنا کی اصطلاح سب سے پہلے حضرت بایزید بسطامی رح نے قائم کی، اور آپ ہی نے سب سے اول اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی، مگر خود حضرت بسطامی رح اس فنا کو اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنے شیخ حضرت ابو علی سندھی رح کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ

"فنا کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ کی ذات و صفات میں اتنا محو ہوجائے کہ اسے اللہ کے سوا کچھ یاد نہ رہے، یہاں تک کہ وہ اپنے وجود کو بھی فراموش کردے، اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ جس کے بعد فنا کا کوئی درجہ نہیں ہے، وہ فناء الفناء کا ہے جس کو صوفیاء کی اصطلاح میں مقام جمع الجمع کہتے ہیں، یعنی ایسا مقام کہ اپنے فنا ہونے کا احساس بھی فنا ہوجائے، اس پر استغراق کا ایسا غلبہ ہو کہ اسے یہ بھی شعور و احساس نہ رہے کہ میں فنا ہوچکا ہوں۔"

علامہ قشیری رح فرماتے ہیں۔

جس شخص پر سلطان الحقیقۃ کا ایسا غلبہ ہو کہ اللہ کے سوا تمام چیزیں اس کی نگاہ سے بالکل اوجھل ہو جائیں بلکہ مفقود ادراک سے ان کی یاد اور کسک تک رخصت ہو جائے تو ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خلق سے فنا ہو کر حق کے ساتھ بقا کی منزل کا مسافر بن چکا ہے۔

غالبًا یہ وہ مقام ہے جس کی طرف ایک حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے، موتوا قبل ان تموتوا، الحدیث، کہ مرنے سے پہلے مرجاؤ۔

(۹) ــــــ مقام فنا کی کیفیت یہ ہے کہ یہاں پہونچنے کے بعد سالک کے تصورات دو متضاد قطبوں کے درمیان سیر کرتے ہیں، کبھی وہ اتحاد کے مقام سے گذرتا ہے اور کبھی تنزیہ و تجرید کی سیر کرتا ہے۔

درجاتِ سلوک

تصوف کے ان نظریات کا تعلق اصول وضابطے سے ہے، اسی جگہ تصوف کے فکری خانے میں سفر معرفت کی بھی کچھ اصطلاحی منزلیں ہیں جن کو صوفیاء کے عرف میں درجاتِ سلوک کہا جاتا ہے، مناسب ہوگا کہ سلوک کے اصطلاحی درجات سے بھی ہمارا تعارف ہو جائے۔

① تصوف میں صوفی، عابد، زاہد، مختلف درجات کا نام ہے۔

② مقامات ایک اصطلاحی نام ہے، ان سے مراد وہ روحانی منزلیں ہیں جن پہ راہِ خدا کا مسافر گذرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرتا ہے، اور اپنی اگلی منزل کی طرف پرواز بھرنے کے لئے ہمت و محنت کا ایندھن جمع کرنے کا بندوبست کرتا ہے، یہ مقامات رک کر ٹھہر جانے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ یہ ایک طرح کی سانس لینے کی منزل ہے، اگر کوئی سالک ان ہی مقامات کو اپنی آخری منزل بنالے تو وہ ناقص قرار دیا جاتا ہے۔

③ احوال ـ یہ ان کیفیات کا نام ہے جن کے جھونکے سالک پر اس لئے چلتے ہیں تاکہ راستے کا تعب اور طبیعت کا اضمحلال ختم ہو کر اسے ایک ایسا روحانی نشاط و سرور حاصل ہو

کہ وہ اپنے سفر کی رفتار تیز سے تیز تر کر دے، اور اس کی روح کو ان لمحات کا شوق بے چین کر دے جن میں اسی طرح کے نرم خرام روحانی جھونکے اس کے قلب و روح کو کیف و سرور سے بھر دیں۔

حضرت جنید بغدادی رح فرماتے ہیں کہ احوال قلب پر چند لمحوں کے لئے طاری ہوتے ہیں جو دائمی نہیں ہوتے:

④ تصوف کی روشنی میں احوال اور مقامات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ احوال عنایات الٰہی سے حاصل ہوتے ہیں، اس میں محنت و کسب کا دخل نہیں ہوتا، جبکہ مقامات سراسر کسبی ہیں، محنت کے مطابق مقامات طے ہوتے ہیں، اسی بات کو صوفیاء اپنے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ

۔ احوال براہ راست چشمۂ جود و کرم (اللہ) سے نازل ہوتے ہیں، اور مقامات سالک کی ہمت و محنت اور جہد مسلسل سے حاصل ہوتے ہیں:

⑤ تصوف میں سلوک کا پہلا درجہ، محبتِ الٰہی اور عشق رسول ہے، جس میں اتباع سنت مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے

⑥ اسکے بعد کی منزل "اسوۂ حسنہ" ہے، جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ الآیۃ، یقیناً تمھارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک بہترین نمونہ ہے۔

⑦ اس کے بعد توبہ کا مقام آتا ہے، جو بنیادی طور پر تین چیزوں سے عبارت ہے (گناہ سے مکمل پرہیز، اپنے کئے پر ندامت و پشیمانی اور ہمیشہ کے لئے اس گناہ کو چھوڑ دینے کا عزم مصمم

⑧ ورع بھی ایک مقام کا نام ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ طالب شبہ کی ہر چیز سے پرہیز کرے خواہ اس کا تعلق زبان، دل، یا عمل کسی سے ہو۔

⑨ زہد اس مقام کا نام ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ اگرچہ انسان بظاہر دنیا میں ہو مگر اس کا دل خالق کائنات کے ساتھ وابستہ ہو، اسی لئے صوفیا کہتے ہیں کہ زاہد وہ ہے جس کے دل کو اللہ نے دنیا کی آلائشوں سے دھو دیا ہو چاہے بظاہر دنیا کے وہ سارے کام کر رہا ہو۔

اور اسی لئے ایک انسان دولت مند اور خوش حال ہوتے ہوئے بھی زاہد ہو سکتا ہے، بشرطیکہ مال و دولت سے اسے کوئی رغبت نہ ہو، بلکہ اس کا دل اپنے خدا کے ساتھ لگا ہوا ہو کیونکہ

زہد فقر کا نام نہیں ہے، اور اسی لئے ہر فقیر کا زاہد ہونا اور نہ ہر زاہد کے لئے فقیر ہونا لازم ہے۔

(۱۰) توکل ابتدائی درجہ ہے، سر تسلیم خم کرنا اور راضی برضا رہنا درمیانی درجہ ہے اور خود سپردگی سب سے اعلیٰ اور آخری مقام ہے۔

(۱۱) محبت تصوف کے اعلیٰ منازل میں سے ایک منزل ہے، محبت کیا شئی ہے؟ اس کی علامت اور حدود اربعہ کیا ہیں ان کو سمجھنے کے لئے حضرت حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کا قول ملاحظہ کیجئے

"محبت کی علامت یہ ہے کہ ہر معاملے میں محبوب کی موافقت اور ہر پہلو سے اسے خوش رکھنے کی کوشش کی جائے، محبوب سے قریب ہونے کے لئے ہزار حیلے بہانے تلاش کئے جائیں، جب بھی فرصت ملے تو لایعنی کاموں میں پڑنے کے بجائے محبوب کے در کا رخ کیا جائے"

(۱۲) سلوک کا سب سے آخری مقام رضا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں۔

"خدا کے ہر فیصلے پر راضی رہنا، سب سے بڑا مقام ہے اور جس کو یہ مقام مل گیا تو درحقیقت اسے دنیا ہی میں جنت کی بہاریں مل گئیں۔"

بعض صوفیاء یہ بھی کہتے ہیں کہ

"مقام رضا تک پہونچ جانے کے بعد خصوصی احوال وکیفیات طاری ہوتے ہیں، پھر اس کے سامنے ایک ایسا نور پھرنے لگتا ہے جس میں وہ غیب کی کتاب کا مطالعہ اور کائنات اور نظام فطرت کے اسرار و رموز کا انکشاف کر سکتا ہے"

یہ تعلیمات وافکار تصوف کے مجموعی ڈھانچے میں مشترک ہیں، مگر اہل تصوف کے درمیان بھی مختلف مکاتب فکر موجود ہیں جن میں مناسب طور پر افکار وتعلیمات کی تقسیم ہو جاتی ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تصوف کے وہ تمام نظریات جو اوپر ذکر کئے گئے ہیں وہ سب کے سب کسی ایک مکتب فکر میں موجود ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان مختلف مکاتب تصوف پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے مگر اس سے پہلے ایک بنیادی بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ تصوف کے مکاتب دو نوعیت کے ہیں ایک فکری ونظری مکاتب، دوسرے عملی واصلاحی مکاتب، پورے تصوف کے مجموعی مطالعہ سے انہی دو طرح کے مکاتب کا سراغ ملتا ہے یہ بھی

یاد رہے کہ ان دونوں مکاتب کے درمیان تداخل کا سلسلہ بھی جاری ہے، ایک فکری مکتب تصوف کسی عملی مکتب تصوف کے ساتھ جمع ہوتا ہے۔

اس کے بعد سب سے پہلے فکری مکاتب تصوف کی طرف ہم چلیں اور ان کے اساتذہ سے ایک ملاقات کریں

تصوّف کے مکاتب فکر

تصوّف میں اساسی اہمیت کے حامل چار مکاتب فکر ہیں

(۱) مکتب زہد اس مکتب سے شب بیدار، عبادت گذار اور آنسو بہانے والے حضرات تیار ہوتے ہیں، اس کے مرکزی اساتذہ میں حضرت ابراہیم ابن ادہم، حضرت سفیان ثوری، اور حضرت رابعہ بصریہ خاص مقام کے حامل ہیں۔

(۲) مکتب کشف و کرامات اس مکتب کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ نری عقل معرفتِ الٰہی کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے زبردست محنت دریاضت اور روحانی مجاہدوں کی ضرورت ہے، تاکہ دل پر پڑے ہوئے جہالت وغفلت کے دبیز پردے چاک ہوجائیں، اور دل کی آلودگیاں ختم ہو کر اس میں جلا پیدا ہوجائے، اس کے بعد ہی انسان حقائق کا ادراک کرسکتا ہے اور اس میں انوار الٰہی کی جھلکیاں دیکھ سکتا ہے۔ اس مکتب کے صدر اعلیٰ حضرت امام غزالیؒ ہیں۔

(۳) مکتب وحدۃ الوجود اس مدرسہ کی بنیاد اس فکر پر قائم ہے کہ اللہ ہر شئی میں موجود ہے، اور ہر شئی اللہ سے قائم ہے، اس لئے دنیا کی تمام چیزیں قابل احترام ہیں، اس لئے کہ ہر چیز میں اللہ کا جلوہ موجود ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا یہ فرمان تو تقریبًا ہر روز اس مکتب میں دہرایا جاتا ہے کہ۔

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ چکی ہے کہ ہر وجود میں اللہ کے سوا کچھ نہیں ہے، ہمارا وجود اگرچہ جداگانہ نظر آرہا ہے مگر درحقیقت اسی کے وجود کی یہ سرسری جھلکیاں ہیں، وجودِ ذاتی سے وجود حق کے سوا کچھ صادر نہیں ہوسکتا، اور یہ طے ہے کہ

وجود حق ایک ہی ہے، اس وقت اگر ہم مخلوقات کا کوئی ممتاز اور مستقل وجود مان لیں تو وجود حق میں دو مختلف وجودوں کا اقرار کرنا پڑے گا، اور یہ ناممکن ہے:

اس مدرسہ کے مرکزی استاذ شیخ محی الدین ابن عربی ہیں، اور ماضی قریب کے لوگوں میں شیخ جمال الدین افغانی خصوصی شہرت رکھتے ہیں، ان کی کتاب "الواردات" نے ان کو اس مدرسہ کے اساتذہ میں شامل کردیا ہے

(۴) مکتب اتحاد و حلول اس مکتب کی تعلیم بھی اسلامی طرز کی ہے مگر اس کے نصاب تعلیم و تربیت پر ہندی اور عیسائی تصوف کی بھی ہلکی چھاپ محسوس ہوتی ہے، حقیقت حال خدا جانتا ہے مگر شرعی اعتبار سے بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے، مثلاً اس مدرسہ کے بنیادی افکار میں سے یہ فکر کس قدر وحشت خیز ہے جو صوفی کے بارے میں ان کے یہاں ملتی ہے کہ جب ایک صوفی انتھک محنتیں کرتا ہے، اور اپنے پیمانۂ دل کو بالکل مجلّیٰ کرلیتا ہے تو خدائی صفات اس میں اتر آتی ہیں، اور اسکے افعال اور خدائی افعال کے درمیان ایک اٹوٹ اتحاد پیدا ہوجاتا ہے، یہ مقصود اگرچہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے درست ہے جیسا کہ پچھلے صفحات میں میں نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، مگر جب اس تصور کی تعلیم کے لئے مستقل نصاب تیار ہوتا ہے تو اس نصاب کا نقشہ کچھ اتنا بھیانک ہوجاتا ہے کہ اہل شریعت کو مجبوراً تلوار اٹھانی پڑتی ہے، پھر وہی الزام دہرایا جاتا ہے جو منصور کے بارے میں دہرایا گیا تھا کہ صوفی اور شیخ کو وہ ایک نوع کا خدا سمجھ بیٹھتے ہیں، اور شیخ اس بناء پر اس تصور کی تردید نہیں کرسکتے کہ اس تصور کی بنیاد ایک مسلمہ صداقت پر ہے، اس لئے اس تصور کی نفی سے اس کھلی سچائی پر حرف آئے گا، مگر ان کی خاموشی ان کے معتقدین کے لئے دینی وفکری تباہی کا سامان فراہم کردیتی ہے، اور رفتہ رفتہ ان کے معتقدین اور اس مکتب اتحاد کے طلبہ صوفی اور شیخ کو واقعۃً خدا ہی سمجھ لیتے ہیں، پھر تعدد الٰہ کا وہی تصور جنم لیتا ہے جو عیسائی اور ہندی تصوف میں موجود ہے، اور اسی بناء پر میں نے یہ کہا کہ اس مکتب پر ہندی اور عیسائی تصوف کی چھاپ محسوس ہوتی ہے۔ اس مکتب کے استاذ الاساتذہ حضرت منصور حلاج ہیں۔

سلاسل تصوف طریق کار اور اصول تربیت کے اعتبار سے بھی تصوف میں مختلف

مکاتب پائے جاتے ہیں، جس کو میں نے عملی مکاتب تصوف کا نام دیا ہے، مگر صوفیاء کی اصطلاح میں ان مکاتب کو سلاسل کا نام دیا گیا ہے، تصوف کے سلاسل بے شمار ہیں مگر میرا مقصد تصوف کا پورا ڈھانچہ تیار کرنا نہیں ہے بلکہ اصولی حیثیت سے اس کا تعارف کرانا ہے اس لئے صرف چند مشہور سلاسلِ تصوف کا ذکر میں کافی سمجھتا ہوں۔

(۱) سلسلۂ قادریہ:۔ یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی طرف منسوب ہے اس سلسلے کی شاخیں پورے عالم میں پائی جاتی ہیں۔

(۲) سلسلۂ رفاعیہ:۔ اس کی نسبت حضرت شیخ احمد رفاعی رح کی طرف ہے، اس کو عموماً مغربی ایشیا کے علاقوں میں زیادہ فروغ حاصل ہوا، باقی اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں اس کا وجود برائے نام ہے۔

(۳) سلسلۂ احمدیہ:۔ یہ حضرت شیخ احمد بدوی رح کی طرف منسوب ہے، اس سلسلے کی اشاعت مصر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں خوب ہوئی اس سلسلے کی بھی کئی شاخیں پیدا ہو چکی ہیں، مثلاً بیومیہ، شناویہ، شعبیہ وغیرہ، اس سلسلے کی خاص پہچان سرخ عمامہ ہے۔

(۴) سلسلۂ دسوقیہ:۔ اس سلسلے کے بانی حضرت ابراہیم دسوقی رح ہیں، اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام انسانوں سے بلا امتیاز مذہب و ملت بلکہ تمام مخلوقات سے محبت و پیار کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سلسلے میں خلوت پسندیدہ نہیں ہے، البتہ شیخ کی اجازت سے کوئی چاہے تو کر سکتا ہے۔

(۵) سلسلہ اکبریہ:۔ اس کے بانی شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ ہیں، اس میں خصوصیت کے ساتھ خاموشی تنہائی، فاقہ کشی اور شب بیداری کی تعلیم دی جاتی ہے مصائب پر صبر، نعمتوں پر شکر اور قضا و قدر پر اطمینان یہ تین چیزیں اس سلسلے کے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہیں

(۶) سلسلۂ شاذلیہ:۔ یہ سلسلہ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رح کی جانب منسوب ہے، اس سلسلے کی بنیادی تربیت ذکر و فکر کی کثرت کے بارے میں ہوتی ہے اس

میں زیادہ مجاہدات پر زور نہیں دیا جاتا ہے اسی لئے صوفیاء نے اس سلسلے کو بہت آسان سلسلہ قرار دیا ہے، یہ سلسلہ مصر، یمن، عرب ممالک، مراکش، مغربی الجزائر اور مغربی و شمالی افریقہ تمام میں پھیلا ہوا ہے، ان تمام علاقوں میں اس سلسلے کے کافی افراد پائے جاتے ہیں۔

(۷) سلسلہ مولویہ :- اسکے بانی شیخ جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ) ہیں، جن کا مزار مبارک قونیہ میں ہے، کہتے ہیں کہ اس سلسلے کے حلقۂ ذکر میں رقص و سرود، سماع و قوالی، اور حال و قال مستقل دینی اور روحانی اہمیت رکھتے ہیں، شروع میں اس کو ترکی اور مغربی ایشیا میں زبردست فروغ حاصل ہوا مگر آج ترکی کے بعض علاقے حلب اور بعض مشرقی ممالک کے سوا کہیں اس کا وجود نہیں ہے۔

(۸) سلسلۂ نقشبندیہ :-

یہ حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندؒ کی طرف منسوب ہے، صوفیاء کے نزدیک شاذلیہ کی طرح یہ بھی بہت سہل سلسلہ ہے، اس میں بھی مجاہدات کی شدت کے بغیر بڑے قریب اور آسان راستوں سے انسان خدا تک پہونچ جاتا ہے، اس سلسلے کو فارس، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور مغربی ایشیا میں خاص شہرت حاصل ہوئی

(۹) سلسلۂ چشتیہ :-

اس کی نسبت حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی طرف ہے، اس سلسلے میں بھی بڑے بڑے اکابر گذرے ہیں، اس کو زیادہ تر شہرت ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہوئی

(۱۰) سلسلۂ ملامتیہ :-

اسکے بانی ابو صالح حمدون ابن احمد ابن عمار (م ۲۷۱ھ) ہیں، جو قصار کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، اس سلسلے کے افراد عموماً غالی قسم کے ہوتے ہیں، ماضی قریب میں ترکی کے اندر انکے غلو کے مختلف نمونے سامنے آئے، اس سلسلے کو ترکی ہی کے اطراف و جوانب میں زیادہ تر شہرت حاصل ہوئی،

یہ دس سلسلے تصوف کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، تصوف کا مطالعہ کرنے والا کوئی شخص ان سلاسل کو نظر انداز کر کے تصوف کے حقیقی خد و خال کو نہیں سمجھ سکتا، اور نہ اس

کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تصوف کی تہ تک پہونچ گیا ہے۔

تصوف کا مثبت رخ

تصوف کے مجموعی تعارف کے بعد میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں بطور خلاصہ تصوف کے کچھ مثبت اور کچھ منفی پہلو پر بھی روشنی ڈالوں، اس سے تصوف کی افادیت کے ساتھ اس کے دوسرے رخ کو بھی سمجھنے میں بہت حد تک مدد ملے گی

① ـــــ تصوف نے بہت سے ایسے مقامات پر وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جنھیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور جن کو تلوار و زبان کی ہزار طاقتیں بھی جمع ہوکر انجام نہیں دے سکتی تھیں مثلاً انڈونیشیا، افریقہ اور دوسرے بہت سے دور دراز ممالک جن کو زبردست سے زبردست اسلامی لشکر بھی فتح نہ کرسکتا تھا مگر تصوف کی جذبی قوت اور روحانی تاثیر نے بغیر کسی کشت و خون کے ان تمام ممالک پر اسلامی پرچم لہرادیا، صوفیاء نے ان علاقوں میں غیر مسلموں اور متعصب دشمنوں پر اپنی قلبی اور روحانی توجہات کے ہتھیار استعمال کئے نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں کی اکثریت ان صوفیاء سے قریب ہوئی، اور حلقہ بگوش اسلام ہوکر اسلام کی علمبردار بن گئی۔

خود ہمارا ہندوستان سلطان الہند حضرت خواجہ اجمیری رہ کا کتنا ممنون کرم ہے، مسلمانوں کی پوری فوجی طاقت بھی اگر یہاں کے تفلسف پرست غیر مسلموں پر صرف کردی جاتی تو بھی مسلمان پیروں کا جمنا یہاں مشکل ہوتا، اسلامی حکومت کا تصور تو دور کی بات تھی، مگر حضرت خواجہ غریب نواز رہ نے اپنی روحانی طاقت اور خداداد کرامتوں کا مظاہرہ کیا، لاکھوں کے لاکھ انسان آن کی آن میں مسلمان ہوگئے، اور حضرت موسیٰ ؑ اور جادوگروں کے مقابلے کی تاریخ ہندوستان کی سرزمین پر ایک بار پھر دہرا گئی، یہ تصوف کا وہ مثبت رخ ہے جو اس کی تمام مضرتوں اور منفی پہلوؤں پر حاوی ہوگیا ہے۔

② اسلامی دور کے حکمرانوں نے ہر جہاد کے موقعہ پر صوفیاء اور خصوصاً اقطاب صوفیہ سے مدد اور توجہ کی درخواست کی، بڑے سے بڑے تاجور ان بزرگوں کی کٹیوں پر نیازمندانہ حاضر ہوتے اور نہایت عاجزی کے ساتھ دشمنوں کے مقابلے میں فتحیابی کی دعا کی درخواست

کرتے، اور بڑے سے بڑے نذرانہ کی پیش کرنے کی خواہش رکھتے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ ان بزرگوں نے کبھی ان تھیلیوں پر نگاہ تک نہ کی، بلکہ ان کی ایسی بے جا جرأتوں پر سخت نفرت اور غصہ کا اظہار کیا

لیکن اصل مقصد میں ان کو کبھی مایوس نہ کیا، بلکہ ان کو تسلی دیتے اور حوصلے دلاتے، پھر دشمنوں کے خلاف ایسے روحانی ہتھیاروں کا استعمال کرتے کہ معمولی سے معمولی اسلامی لشکر، بڑی سے بڑی جنگجو، تجربہ کار اور جدید ہتھیاروں سے مسلح افواج کو شکست دے دیتا، جس کی توجیہ خدائی نصرت کے سوا کسی چیز سے نہیں کی جاتی تھی، اور یہ خدائی نصرت لشکر کے مسلمان ہونے کے علاوہ بزرگوں کی دعاؤں کا ثمرہ ہوتی تھی ــــــ حضرت احمد بدوی رحمۃ اللہ علیہ، ابراہیم دسوقی اور ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ اس باب کی جلی سرخیاں ہیں۔

③ ــــــ اور غالباً انھی چیزوں کا اثر تھا کہ صوفیہ تحریک محدود بن کر نہیں رہی، بلکہ پورے عالم میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں، ان تمام علاقوں پر چھا گئی، مصر، عراق، افریقہ مغربی، مشرقی اور وسطی ایشیا وغیرہ تمام ممالک اس کی روحانی سلطنت میں شامل ہوگئے

④ شعر، نثر، موسیقی اور فنون لطیفہ پر بھی تصوف کی گہری چھاپ پڑی، جو آج تک محسوس کی جارہی ہے۔

⑤ مغربی مادہ پرستوں کو اسلام کی طرف کھینچنے میں تصوف نے زبردست رول ادا کیا، جو مادہ پرست اسلام کی طرف آنے میں تصوف کے ممنون کرم ہیں، ان میں مارٹن لنجز ایک واضح مثال ہے، جو کہتا ہے کہ۔

"میں یوروپی ہوں، میری روح بے قرار تھی، میری روح کو چین وسکون اور قرار وخلاص اسلامی تصوف کے زیر سایہ نصیب ہوئی۔ میں تصوف کا جتنا بھی دلدادہ بنوں کم ہے"

یہ مثال کے طور پر چند مثبت پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ تصوف کے مثبت اثرات کل یہی ہیں، بلکہ اس کی اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ تعارف کے لئے اس قدر کافی ہیں۔

❋ ❋ ❋

تصوّف کا منفی رُخ

اب ایک نظر تصوف کے منفی رخ پر بھی ڈالنا ضروری ہے، اس سے میرا مقصد تصوف پر نکتہ چینی یا تنقید کے بجائے اس کے صحیح خطوط واضح کرنے ہیں، اور یہ اس کے بغیر ناممکن ہے کہ اسکے مفید اور مضر دونوں پہلوؤں کو روشن کیا جائے، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کے ایک منفی رخ کو دیکھ کر پورے تصوف ہی کو زہر ہلاہل کا نام دے دیا جائے بلکہ ایک انصاف پسند اور بصیرت مند تاریخ نگار کو دیکھنا چاہئے کہ اس کا کون سا پہلو غالب ہے تصوف کے بارے میں یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے منفی اثرات مثبت کے مقابلے میں نہایت کم اور جو بھی ہیں شکستہ حالت میں ہیں، اس لئے تصوف کی افادیت اور اثباتیت کا فیصلہ کرنا ہر انصاف پسند محقق کی تاریخی مجبوری ہے۔

اس معمولی تمہید کے بعد تصوف کے منفی یا مضر اثرات کی ایک مختصر فہرست ملاحظہ فرمایئے

۱۔ بعض متصوفین اس گمان میں مبتلا ہیں کہ ولی سے تمام تکلیفات شرعیہ اٹھالی جاتی ہیں، اس سے شرعی احکام نماز، روزہ وغیرہ دوسرے تمام فرائض رخصت ہوجاتے ہیں اس لئے کہ وہ ایسے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں جہاں انھیں ان ظاہری چیزوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی، بلکہ بعض حالات میں یہ نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتی ہیں، اس لئے کہ اگر وہ ان ظاہری احکام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات کی طرف توجہ کریں تو ان پر جو باطنی واردات اور روحانی فیوض کا نزول ہو رہا ہے، ان کی طرف توجہ میں کمی واقع ہوگی جو ان کے منصب ولایت کے لئے سخت مضرت رساں ثابت ہوگا۔

اولیاء کے بارے میں یہ عقیدہ کتنا واضح طور پر خلاف شریعت ہے جبکہ کسی نبی کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ احکام شرعیہ کی پابندی ان سے اٹھالی گئی ہو ــــ جب کسی جماعت میں اس قسم کی فکر نشو ونما پاتی ہے تو قدرتی طور پر اس جماعت کے ارکان اور متعلقین میں ذہنی وفکری اباحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ صوفیاء کی وہ جماعت جو اولیاء کو اس قدر ممتاز مقام پر دیکھنے کی عادی ہے، اس کے ساتھ بھی تاریخ کی وہی سنت دہرائی

گئی، امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ابتداءً اس جماعت میں عملی وفکری آزادی کا رجحان بڑھا پھر آہستہ آہستہ اس آزادی نے ان کے اندر مختلف فرقے اور گروہ پیدا کر دیئے، جن میں سے ہر فرقہ آزادی میں دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتا تھا، ان میں سے چند فرقوں کے خیالات آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے

الف :- ایک فرقہ نے اسلامی علوم چھوڑ کر منطق، فلسفہ اور علم ہیئت، ہی کو اپنا مشغلہ بنالیا اور اسی کو انھوں نے اپنے لئے معراجِ کمال تصور کیا۔

ب :- دوسرے فرقے نے معرفت الٰہی، دیدار باری اور سیر مقامات کے دعوے کئے

ج :- اس کے مقابلے میں تیسرے فرقے نے اباحیت وآزادی کا وہ راستہ اپنایا جس میں انھوں نے شریعت کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی اور حلال وحرام کی تمیز تک کھودی، احوال ومقامات کا کیا ذکر، وہ تو ان کے لئے قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔

د :- ایک فرقہ نے اعلان کیا کہ ظاہری اعمال کا اللہ کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں ہے، خدا کے یہاں اصل اصیل چیز دل ہے اگر دل میں یاد الٰہی اور عشق رسول موجزن ہو تو کسی عمل کی قطعاً ضرورت نہیں، اور اگر انسان تمام اعمال صالحہ کر رہا ہو مگر اس کا دل عشق ومحبت کے سوز سے خالی ہو تو اس کے تمام اعمال غارت ہیں، اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے، بلکہ قیامت کے روز یہ اعمال اس کے لئے مصیبت بن سکتے ہیں کہ اس نے ان کو دل کے نہاں خانے سے خوراک جیا کیوں نہ کی؟ ان کے نزدیک ایک انسان جو رات دن فواحش وشہوات میں مشغول ہو، مگر اس کا دل یاد الٰہی سے معمور ہو، تو یہ فواحش اس کے لئے قطعاً نقصان دہ ثابت نہیں ہونگے بلکہ ممکن ہے کہ یہ ان کے لئے نیکیوں میں تبدیل ہو کر مفید ثابت ہوں۔

۴:- سلطان الاولیاء حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ کی طرف کچھ ایسے اقوال منسوب کئے گئے ہیں جن کو دیکھ کر ایک صاحب شریعت انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ سبحانی ما اعظم شانی ۔ یعنی میری ذات بے عیب ہے، میری شان کیا ہی بلند ہے۔

۲۔ انی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدونی۔ یعنی بلاشبہ میں خدا ہوں میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لئے میری عبادت کرو۔

۳۔ خضت بحرا وقف الانبیاء عند سواحلہ۔ یعنی میں نے ایک ایسا سمندر

عبور کرلیا ہے کہ انبیاء بھی جس کے کنارے ہی پر رہ گئے تھے

۴۔ صعدت الی السماء وضربت قبتی بازاء العرش۔ یعنی میں نے آسمان پر چڑھ کر عرش کے بالمقابل اپنا ایک مستقل گنبد نما محل تیار کیا ہے۔

مگر یہاں پر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کے تمام اقوال کا راوی صرف ایک شخص ہے جس کا نام عبداللہ ہروی (م ۱۸۱ھ) ہے، اس کے سوا حضرت بایزید بسطامیؒ کے دوسرے ہزاروں مریدین میں سے کوئی اس قسم کے اقوال نقل نہیں کرتا، جس سے ان اقوال کے ضعف کی طرف اشارہ ملتا ہے، اور اسی بنا پر ایک مستشرق تاریخ نگار آرنلڈ نیکلسن نے اپنی کتاب "تاریخ تصوف" میں حضرت بایزید کی جانب ان اقوال کی نسبت پر شک کا اظہار کیا ہے، اس نے روایتی بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "یہ فہم سے بالاتر بات ہے کہ ایک ایسی ہستی جو سراپا تقدس نظر آتی ہے، جس کی کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے وہ اس قسم کی بے تکی کیوں کر ہانک سکتا ہے؟ وہ بھی اس وقت جب کہ ان اقوال کو نقل کرنے والا فرد واحد ہو[1]

بعض صوفیاء نے ان اقوال کی نسبت صحیح مان کر کچھ تاویلات کی ہیں، مگر وہ تاویلات بحث و نظر کے نئے دروازے کھول دیتی ہیں، اس لئے آسان راستہ وہی ہے جو نیکلسن نے اختیار کیا ہے

۳:- اسی طرح کچھ خوفناک اقوال منصور حلاج کی جانب بھی منسوب ہیں، مثلاً ان کا یہ شعر حلول واتحاد کی کس انتہاء کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

مزجت روحك فی روحی کما | تمزج الخمرة فی الماء الزلال
فاذا مسك شیٔ مسنی | فاذا انت انا فی کل حال

ترجمہ:- اے خدا تیری روح میری روح کے ساتھ اسی طرح ضم ہو گئی ہے جس طرح آب شیریں میں شراب گھل مل جاتی ہے، جب تجھ سے کوئی چیز مَس کرتی ہے تو اس کا احساس مجھے بھی ہوتا ہے، اسلئے کہ میں اور تو بہر حال ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔

ان کے انا الحق وغیرہ جملے بھی اسی قسم میں آتے ہیں، ان چیزوں کو صوفیاء کی شطحیات

---

[1] آرنلڈ کی اصل کتاب انگریزی میں ہے، مگر ڈاکٹر ابوالعلاء عفیفی نے اس کا عربی ترجمہ کر دیا ہے، یہ عربی ترجمہ قاہرہ سے "فی التصوف الاسلامی وتاریخہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

میں شمار کیا گیا ہے، جن کی بظاہر کوئی شرعی توجیہ نظر نہیں آتی۔

۴ :- علامہ ابن تیمیہ نے کتاب السلوک کے ص ۳۳۷ پر مقام فنا پر بھی تبصرہ کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ صوفیا مقام فنا کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس مقام پر انسان کائنات کے ساتھ خود کو بھی فراموش کر جاتا ہے پھر وہ شعور کی منزل سے گذر کر لاشعور اور سکر کے اس مقام پر پہونچ جاتا ہے کہ اس کو ایمان کی حلاوت کے سوا کسی چیز کی تمیز نہیں رہ جاتی، اس وقت اس سے حرام وحلال ہر طرح کے افعال واقوال صادر ہو سکتے ہیں، مگر ان کو غلط کہنا صحیح نہیں ہوگا اسلئے کہ یہ ان کے مقام کا مقتضا ہے۔"

علامہ ابن تیمیہ اس پر ریمارک کرتے ہیں کہ " صحیح ہے کہ وہ اس مقام پر معذور ہیں، ان کو ان افعال واقوال کے صدور پر خطا دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی ان امور میں پیروی جائز نہیں ہے اور نہ ان کے قول وفعل کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ اس خاص وقت میں اسی طرح تکلیف شرعی سے فروتر ہیں جس طرح کہ مجنوں اور غافل انسان "

۵ :- علامہ ابن تیمیہ اتحاد وحلول کے قائلین پر بھی سخت برہم ہیں انھوں نے کتاب السلوک کے ص ۳۴۷ پر اتحاد وحلول کے نظریے کو کفر وضلال سے تعبیر کیا ہے۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ یہ نظریہ برہمیہ جماعت سے جاہل صوفیوں میں داخل ہوا، برہمی حضرات بھی اتحاد کے قائل ہیں، جس کے بعد انسان کسی عمل یا فرض کا مکلف نہیں رہ جاتا۔

اس موقع پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ تصوف کا منفی رخ اولاً تمام سلاسل میں موجود نہیں ہے بلکہ کسی کسی سلسلے میں ہے، ثانیاً اس کا منفی رخ مثبت کے مقابلے میں انتہائی کمزور رہے محققین صوفیا ہر دور میں اس کی نفی کرتے رہے ہیں۔

میرے نزدیک وہ لوگ حد سے گذرے ہوئے ہیں جنھوں نے ان بعض منفی پہلوؤں کو دیکھ کر تصوف کو افیون یا سامان ہلاکت قرار دیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کل قیامت میں جب ان کا سامنا ان اولیاء اللہ اور اکابر صوفیاء سے ہوگا اور وہ ان سے اس ظلم وزیادتی کی وجہ دریافت کریں گے تو ان کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ میں تو حضور کی اس حدیث پر اپنا پختہ ایمان رکھتا ہوں کہ من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنتہ للحرب، او کما قال (جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی مول لی اس کیلئے میری طرف سے اعلان جنگ ہے۔

سلفی تصوّف

کتاب و سنّت کی روشنی میں

مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلمیذ خصوصی علامہ ابن قیمؒ تصوف کے مخالف ہیں، اور یہ چیز عام طور پر ان علماء کے دلوں اور دماغوں پر چھائی ہوتی ہے جن کو ان دونوں بزرگوں سے محبت اور عقیدت ہے اور اس وقت عرب دنیا میں کئی وجوہ کی بنا پر ان دونوں کا علمی سکہ چل رہا ہے علمائے عرب سے ہماری ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں، ۱۹۵۵ء میں حرمین شریفین کی حاضری نصیب ہوئی اور پھر ۱۹۷۳ء میں دوبارہ یہ شرف حاصل ہوا پھر ہم بغداد گئے، جہاں ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت ہوئی، ممالک عرب کے بہت سے اہل علم وفضل سے ملنا ہوا اسی طرح دوبارہ دوبئی جانا ہوا اور ایک بار بحرین کا سفر ہوا، ان سب مقامات پر ہم نے عرب علماء سے تصوف اور اہل تصوف پر گفتگو کی اور بہت سے مواقع ایسے حاصل ہوئے کہ مدارس عربیہ کے جلسوں میں عرب علماء سے ملنا ہوا، دیوبند، ندوہ، عمرآباد اور کیرلا کے علمی اجتماعات میں عرب علماء کے ساتھ مل بیٹھنے اور علمی مذاکرات کی نوبت آئی، ہم نے تصوف پر خوب گفتگو کی وہ تصوف جو امام ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ اور شیخ الاسلام مدنیؒ اور ہمارے علمائے دیوبند کے درمیان دائر وسائر ہے اس کو ہم نے پیش کیا، البتہ اتنی احتیاط رکھی کہ تصوف کا لفظ نہیں استعمال کیا بلکہ احسان اور اس کے مشتقات پر گفتگو کی، اور جب حدیث جبریل کو ہم نے پیش کیا جس میں ایمان اسلام اور احسان کی

حقیقتیں بیان کی گئی ہیں اور پھر اپنے بزرگوں کے پیش کردہ سلوک کی نشاندہی کی تو ہمیں گفتگو میں بڑی کامیابی ہوئی اور علمائے عرب میں وہ طبقہ جو جدید مغربی فکر سے واقف ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ عرب نوجوانوں میں آزاد خیالی آوارہ مزاجی اور دین سے دوری اور بظاہر ایمان و اسلام کے باوجود احسانیات سے مہجوری بڑھتی جارہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ قلب سقیم کو قلب سلیم کیسے بنایا جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس جنوبی ہند کے ایک جلسے میں علامہ شیخ علی بن صالح محوتی یمنی شارجہ کے چیف جسٹس سے ملاقات ہوئی اور تصوف پر کھل کر گفتگو کی تو انھوں نے صاف اعتراف کیا کہ اگر یہی تصوف ہے تو اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ اس شخص سے ہماری گیارہ ملاقاتیں ہوئیں، مگر یہ عجیب بات ہم نے دیکھی کہ یمنی ہونے کی وجہ سے علیؓ اور اہل بیت نبویؐ سے اور ذریت محمدیہ نبویہ سے ایک نفسیاتی تعلق ہے جب وہ ہم سے متأثر ہوئے تو ہم کو اپنے بزرگوں کے افادات پر یقین بڑھتا چلا گیا، ایک مرتبہ ہم نے اس شیخ سے پوچھا ہماری آپ کی یہ کون سی ملاقات ہے فرمایا یہ دسویں ملاقات ہے اور آیت کا ٹکڑا پڑھ دیا تلک عشرۃ کاملۃ ہم نے عرض کیا یہ آیت اس محل پر تو نازل نہیں ہوئی ہے، اس آیت کا اس موقع پر پڑھ دینا نہ تفسیر ہے نہ تاویل ہے بلکہ اس کو اعتبار کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون علیہ الملام کا قصہ پڑھتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جس طرح اس عالم کبیر میں یہ دو شخصیتیں گذر گئی ہیں حضرت موسیٰ علیہ وعلی نبینا السلام کی شخصیت حق کا مرکز ہے دوسری شخصیت فرعون علیہ ما علیہ باطل کا مرکز ہے اب ذہن اس پر منتقل ہوا کہ انسان کا وجود ایک عالم صغیر ہے اس کے باطن میں دو چیزیں ہیں روح ہے اور نفس ہے، روح کا غلبہ اور نفس کی مغلوبیت صلاح و کامیابی ہے، اور اسکے برعکس ناکامی و نامرادی ہے اور فساد اور شر کا غلبہ ہے یہی ہے جس کو صوفیہ صافیہ نے اعتبار کہا ہے۔

ایک مرتبہ جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس میں ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ سے ملاقات ہوئی، دسترخوان پر ان کے ساتھ مجھے بٹھایا گیا، جامعہ کے سکریٹری جناب کاکا محمد عمر ثانی مرحوم و مغفور نے میرا خصوصی تعارف کرایا، کہا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے

فارغ التحصیل ہیں ہمارے جامعہ میں تفسیر، عربی ادب اور تاریخ کے استاذ رہ چکے ہیں
سید ابوالاعلیٰ مودودی کے رفیق ان کی تحریک اسلامی کے رکن اور کارکن رہ چکے ہیں
برسوں دعوتی اور اصلاحی کام کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے ساتھ پاکستان نہیں گئے
جنوبی ہند کی قدیم اور مشہور درسگاہ کلیہ عربیہ باقیات صالحات ویلور مدراس میں
دوبارہ مدرس ہو گئے بیس سال کے بعد درس حدیث دیکر نکلے۔ اب ایک خاص
کام میں لگے ہوئے ہیں یہ خود آپ کو اپنے کام کا تعارف کرائیں گے۔ ڈاکٹر نے پوچھا کیا
کام جواب کر رہے ہیں تو میں نے عرض کیا تعلیم و تبلیغ کے بعد ہمیں تجربہ ہوا کہ کوئی
خلا ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں دین کے شعبے کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں
وہ خلا تزکیہ کا فقدان ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا تزکیہ کیا ہے میں نے عرض کیا اس کی
دو جہتیں ہیں ایک جہت سلبی اور منفی ہے وہ ہے تخلیہ عن الرزائل۔ اور دوسری
جہت مثبت اور ایجابی ہے۔ تحلیہ بالفضائل مثلاً ایک شخص ہے اس میں رذیلہ بخل
ہے اس کو اس کے قلب سے کیسے نکالا جائے اور اس کے بدلے فضیلت سخاوت
کیسے دل میں داخل کیا جائے حسّی اور عقلی دلائل سے اس پر ایک صفت کا مذموم ہونا
اور دوسری کا محمود ہونا ہم نے ثابت کر دیا لیکن اس کے قلب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔
اب کیا کیا جائے اس کے لئے وجدان قلبی کو بیدار کیا جائے اور قرآن و حدیث سے
جو کچھ اور جیسا کچھ مستفاد ہوتا ہے اس کو ایسے اسلوب کے ساتھ جو سادہ اور فطری
اسلوب بیان ہو بتایا جائے تو اس کے قلب پر اثر ہو جاتا ہے یہ وجدانیات کا فن ہے
جس میں قلب کی صلاحیتوں کو ترتیب معنوی کے ساتھ ابھارا جاتا ہے اس کے مناہج
ہیں مدارج ہیں معارج ہیں اس پر علامہ ابن قیم کی مدارج السالکین اور اغاثۃ اللہفان
اور طریق الہجرتین سے ہم نے ایسے افادات مرتب کر لئے ہیں جن سے ہم کام کرتے ہیں
اس پر ڈاکٹر بہت مسرور ہوئے اور فرمایا ہم آپ کے ساتھ مل بیٹھنے کے آرزومند
ہیں ہم نے عرض کیا اللہ ملائے اور اچھے حالات میں ملنا نصیب ہو۔ ایسے بیسیوں واقعات
ہیں جو علمائے عرب کے ساتھ پیش آئے۔ علامہ عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کہا سے

دہلی میں ملاقات کی جب وہ اپنی طویل جلاوطنی کے بعد واپس ہوئے ہم نے ان کے تلامذہ
سے استفادہ کرلیا تھا۔ مولانا خواجہ عبدالحیٔ فاروقی فاضل دیوبند شیخ التفسیر جامعہ ملیہ دہلی
سے ہم ملے اور انکا مطبوعہ لٹریچر قرآن سے متعلق ہم نے پڑھ لیا پھر حضرت مولانا شاہ
احمد علی مفسر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سے تعارف ہوا وہ دیوبند آتے جاتے تھے دارالعلوم
کی مسجد میں بعد نماز عصر تقریر فرماتے اور قرآن پاک پر توجہ دلاتے رہتے تھے انہوں نے
فارغ شدہ علماء کے لئے ایک چار مہینے کا درس قرآن کا کورس بنایا تھا بحمد للہ ہم نے
اس میں شرکت کی مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ دونوں شخصیتیں فیض یافتہ تھیں پھر جب
ہم وہاں سے فارغ ہوکر نکلے اسی سال دارالعلوم دیوبند میں دورۂ تفسیر کھولا گیا پھر ہم
جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس، جنوب ہند میں قرآن کے اور تفسیر کے مدرس ہوگئے، برسوں
پڑھانے کے بعد مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی، بیس دن ہم نے ان
کی صحبت پائی، حجۃ اللہ البالغہ کا درس سنا، ہمارے یہ بزرگ حجاز مقدس مکہ مکرمہ میں بارہ برس
رہے نجدی الفکر اونچے علماء سے روابط ہوگئے فرمایا کہ ایک بار بہت بڑے عالم نے کہا
کہ ہم علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابیں پڑھتے ہیں وہ ہمیں بہت کم سمجھ میں آتی ہیں، مولانا سندھیؒ
نے فرمایا ہم اس کا انتظام کریں گے اس کے بعد ایک ہفتے کی محنت میں ایک رسالہ لکھ دیا
جس کا عنوان قرار دیا۔ وہ اصول و مبادی جن کے سمجھنے پر علامہ ابن تیمیہ اور ان کے معاصرین
کے علوم کا سمجھنا موقوف ہے یہ رسالہ اس نجدی عالم کو مولانا نے بند کمرے میں پڑھایا، کہنے لگے
مطمئن رہو کسی کو اس کی خبر نہیں ہوگی کہ میں پڑھا رہا ہوں اور آپ پڑھ رہے ہیں، جب
مولانا اس رسالے کے درس سے فارغ ہوئے تو وہ عالم بہت مسرور ہوا، اپنے گھر
پہونچ کر اس نے علامہ ابن تیمیہ کی کتاب منہاج السنہ کا مطالعہ کیا، پھر حاضر ہوکر مولانا
سندھی سے کہا میں پہلے منہاج السنہ کی پانچ سطریں پڑھتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتی
تھیں، اب بے تکلف میں نے پانچ ورق پڑھ لی ہے، اور سب کچھ سمجھ میں آگیا ہے مولانا سندھی
نے فرمایا یہ میرے رسالے کا فیض ہے، یہ رسالہ منطق و فلسفے پر مشتمل ہے آپ لوگ اسکے
پڑھنے کو ناجائز سمجھتے ہیں، اب ہم نے جو محنت کی تب آپ کی سمجھ میں بات آئی، بہرحال

مولانا سندھی نے ایسے قصے سنائے جس سے ہمیں یقین ہوگیا کہ علامہ ابن تیمیہ کی کتابوں سے ایسی چیزیں نکالی جاسکتی ہیں جو ہمارے لئے مفید مطلب ہیں، آج کل مدارس عربیہ میں بالعموم منطق و فلسفے سے دلچسپی کم ہوتی چلی جارہی ہے اس کا برا نتیجہ ہوگا، اللہ اس سے بچائے، معقولات قدیمہ کا جو حصہ دیوبند میں لازمی ہے اس کا پڑھ لینا تو ضروری ہے تاکہ کلام و تصوف سمجھنے میں آسانی ہو، منطق و فلسفہ جانے بغیر کلام اور لٹریچر کا سمجھنا مشکل ہے۔ تصوف کو قدیم زمانے میں مدون کیا گیا اور جب علم کلام سے آدمی حیران ہوکر تھک جائے تو اس کی تصوف سے حیرانی دور ہوتی ہے۔

ہندوستان میں حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی وہ بزرگ شخصیت گذری ہے جس نے قرآن و حدیث فقہ اور تصوف کی جامعیت پر ایک تحریک دینی اٹھائی جس کا علمی و عملی نمونہ دارالعلوم دیوبند ہے، ان کی چیزوں کو سمجھنے کے لئے معقولات قدیمہ کا لازمی حصہ سمجھنا ضروری ہے اسی کے ساتھ ساتھ ہمارے نوجوان علماء عربیت سے آشنا ہوں اور عربی میں شاہ ولی اللہؒ اور ان کے سلسلے کے بزرگوں کی کتابوں کو پیش کریں تو روحانی ربانی احسانی تحریک عربوں میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔

اسی طرح اہل حدیث کے وہ علماء جو شاہ صاحب سے خصوصی ربط رکھتے ہیں خصوصاً مولانا سید شاہ نذیر حسین محدث دہلوی اور مولانا سید عبدالجبار غزنوی اور دورۂ اخیر میں مولانا شیخ ابراہیم سیالکوٹی پنجاب میں اور مولانا سید شاہ اسمٰعیل مدراسی وغیرہم معترفین تصوف میں سے ہیں جن کا ہم تذکرہ تذکرۃ المحسنین میں کریں گے۔ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَة۔

اس دور میں علمائے دیوبند میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی شخصیت گذری ہے جس نے علوم اربعہ قرآن و حدیث، فقہ اور تصوف میں ایک ذخیرہ چھوڑا ہے، یہاں ہم ایک واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مالٹا کی قید سے رہا ہوکر آئے تو ملنے کے لئے مولانا تھانویؒ حاضر ہوئے، مولانا شیخ الہند کے دست گرد رہ چکے تھے، اور ان کی سیاسی تحریک میں شامل ہوئے پھر بعد میں الگ ہوکر بیٹھ گئے، وہ آئے اور مل کر واپس ہوگئے تو لوگوں نے شیخ الہند سے عرض کیا کہ اپنی سیاسی

تحریک ان کو دلائل سے سمجھا کر اپنے ساتھ ان کو لینا چاہئے، شیخ الہندؒ نے فرمایا ایک شخص اپنے کو صاحبِ رخصت سمجھتا ہے اور اس عزیمت کی راہ کا اپنے کو قابل نہیں سمجھتا ہے تو میں نے اس کو چھوڑ دیا، زبردستی اپنے ساتھ لینے کا ارادہ نہیں کیا، صاحب علم وفضل ہے، گوشۂ عافیت میں بیکار تو نہیں بیٹھے گا، کتابوں کے ڈھیر لکھ کے لگا دیگا، پس ہم مولانا تھانوی کی کتابوں کو حضرت شیخ الہند کی کرامت سمجھتے ہیں

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ آپ کتابیں تصنیف نہیں کرتے، فرمایا کہ مولانا تھانوی نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بہت کافی ہیں، قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف پر کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ وہ حضرت شیخ الہند کے تلمیذ اور حضرت گنگوہی کے فیض یافتہ تھے، حضرت مولانا شاہ امداد اللہ فاروقی تھانوی، مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، تصوف میں ان کی لکھی ہوئی چیزیں بہت کام کی ہیں۔

ہم مولانا تھانویؒ کی کتابوں کا ایک تعارف کراتے ہیں، سب سے پہلی کتاب تعلیم الدین ہے جس کا نصف حصہ تصوف وسلوک سے متعلق ہے، یہ ہمارے نزدیک تصوف کی پہلی کتاب ہے جس کو پڑھنا چاہئے، پھر ایک ضخیم وفخیم کتاب تکشف ہے جس میں پوری طرح فن تصوف پیش کیا گیا ہے، اصول وفروع مبادی ومقاصد اور تمام متعلقات کو جمع کر دیا ہے پانچسو صفحات سے زیادہ پر یہ کتاب مشتمل ہے، اب سوال پیدا ہوا کہ ایک فن ہے جو من جملہ فنون مدون ہوچکا ہے تو اس کے جواب میں مولانا تھانوی کی دوسری کتاب پیش کی جا سکتی ہے رفع شکوک جس میں مولانا نے صوفیہ کی چیزوں کو قرآن سے مضبوط ومربوط کر کے دکھلایا ہے، غالباً یہ بھی چار سو صفحات پر مشتمل ہے، پھر مولانا نے "تشرف" کے نام سے ایک کتاب مرتب فرمائی جس میں ان احادیث کو حل کیا ہے جو صوفیہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، اور اکثر علمائے اہل حدیث اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں، مولانا نے ایسی حدیثوں کو ذکر کرنے کے بعد ایسی صحیح قوی حدیثوں کو ذکر کیا ہے جن سے صحاح ستہ بھری ہوئی ہیں اور صوفیہ کا مصداق قوت کے ساتھ ان صحیح روایتوں سے صحیح ثابت ہوگیا۔

تشرف آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے، یہ تو ان کا علمی تصوف تھا، اب ان کا عملی تصوف

جو آدھی صدی سے زائد ان کے نظام خانقاہی میں برپا رہا اور ان کے زیر تزکیہ شخصیتوں کی اصلاح ظاہر و باطن کی گئی اس کا مجموعہ وہ کتاب ہے جس کا نام تربیت السالکؒ ہے جو سترہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

اسی طرح حضرت اقدس شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے جس میں بہت سے جواہر پارے ہیں سلوک وتصوف اور عرفانیات پر یہ ذخیرہ حرز جان بنانے کے قابل ہے

تیسرے بزرگ مولانا شیخ زکریا محدث کاندھلوی ہیں جنھوں نے آخری عمر میں تصوف کی اشاعت کا فریضہ ادا کیا اور ایک چھوٹی سی "شریعت وطریقت" کتاب تصنیف فرمادی، ان کی ساری کتابوں پر اگر کوئی روشنی ڈالے تو قرآن وحدیث کے ساتھ تصوف کے معارف کا خاصہ ذخیرہ ان میں موجود ہے جہاں تک ہمارا تحقیقی خیال ہے کہ بزرگانِ دیوبند میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تصوف کے علمی اور عملی مسئلہ میں ناآشنا رہا ہو ہم نوجوان علماء سے اس کی امید رکھتے ہیں کہ وہ ان بزرگوں کے لٹریچر سے فیض یاب ہوں گے۔

ہمارے بزرگوں میں علامہ سید انور شاہ محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں، اپنی قوت حافظہ، فہم سلیم اور تبحر علمی کے اعتبار سے ممتاز شخصیت رکھتے تھے ان کے بارے میں ہم چند کلمات کہنا چاہتے ہیں، جنھوں نے اپنے علم وفضل سے متاثر کیا اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ان کے افکار میں اصلاح اور تربیت سے نوازا، حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ میں مولانا سعید احمدؒ اکبرآبادی ہیں جو اس بات کے راوی ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کے توسط سے شاہ صاحب کی بارگاہ علمی میں رسائی پائی، ایک مرتبہ جب مولانا سعید ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ملے تو انھوں نے کہا کہ میرے چند شکوک وشبہات ہیں کیا حضرت شاہ صاحب ان پر توجہ فرمائیں گے اور حل فرمادیں گے، چنانچہ اقبال نے چند چیزیں لکھ کر حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجیں تو اطمینان بخش جواب پاکر وہ مطمئن اور مسرور ہوئے، مولانا سید یوسف بنوری محدثؒ جو شاہ صاحب کے خاص تلمیذ تھے انھوں نے ہم سے بیان کیا کہ ایک مرتبہ دیوبند سے کشمیر جاتے ہوئے راستے میں لاہور میں شاہ صاحب نے قیام فرمایا، اطلاع ملنے پر ڈاکٹر اقبال حاضر خدمت عالی ہوئے حدوث عالم پر چند سوالات ڈاکٹر صاحب نے کئے تو حضرت شاہ صاحب نے مولانا بنوری سے کہا کہ

میرا قصیدہ عربی ضرب الخاتم علی حدوث العالم پڑھو ایک ایک شعر وہ پڑھتے رہے اور شاہ صاحبؒ اس کی تشریح کرتے رہے جب طویل صحبت ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نہایت شاداں وفرحاں حضرت کی تعظیم وتکریم کرکے واپس ہوگئے، ہم یہاں ڈاکٹر صاحب پر تذکرہ نہیں کر رہے ہیں نہ ان پر کوئی تبصرہ مقصود ہے بتانا یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے تصوف کے سلسلے میں کیا کیا کیا ہے ہم نے محسوس کیا کہ اپنی معلومات کو جو اپنے بزرگوں کے بارے میں ہم کو حاصل ہیں پیش کردیں، تمام بزرگوں کا اس وقت تذکرہ نہیں ہو رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم اپنی کتاب تذکرۃ المحسنین میں ان بزرگوں کے بارے میں تفصیل سے واقعات پیش کریں گے۔

ہمارا کوئی بزرگ جو سلسلہ ولی اللہی سے وابستہ ہے بے نسبت نہیں ہے، مولانا مفتی شیخ عزیز الرحمٰن بجنوری مدظلہ العالی جو حضرت شیخ الاسلام مدنی رح کے خلیفہ ہیں انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ تفصیل بتائی ہے کہ کون بزرگ کس سے بیعت وخلافت سے فیض یاب تھے۔

ہمارے حلقہ دیوبند کے ایک ممتاز جلیل القدر فاضل جنھوں نے دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد جدید علوم کی تعلیم پائی اور یورپ کے کسی یونیورسٹی میں دو سال پروفیسر رہے جہاں انھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں اور دہریوں کو عربی زبان کے ساتھ قرآن وحدیث فقہ اور کلام وتصوف کی تعلیم دی وہ سب مسلم نہ ہو سکے بلکہ مسالم بن گئے، ان بزرگ سے ایک مرتبہ میں نے عرض کیا۔ کیا آپ علامہ انور شاہ کشمیری کے تلمیذ تو ہیں مرید بھی ہوگئے ہیں؟ فرمایا کیا وہ مرید بنایا کرتے تھے، میں نے عرض کیا وہ تو اپنے والد ماجد علیہ الرحمہ کے سلسلہ سہروردیہ میں بیعت وخلافت سے فائز المرام تھے پھر دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد حضرت مولانا شاہ رشید احمد ایوبی انصاری گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء وارشاد پر گنگوہ جاکر مولانا گنگوہی سے وابستہ دامن ہوئے ہم نے حیدرآباد میں ایک دیوبند کے فارغ کو دیکھا جو شاہ صاحبؒ کے مرید تھے، ان کو بیعت کرکے ماثورہ درودوں کی تلقین فرمائی جو سلسلہ شاذلیہ کا سلوک باطنی ہے۔

بہرحال وہ بزرگ کہنے لگے، کیا مرید ہونا ضروری ہے؟ میں نے عرض کیا مرید دو قسم کے ہیں

۱:۔ منکم من یرید الدنیا ۔ ۲ و منکم من یرید الاخرۃ اور میں نے دوسری آیت پڑھی
من اراد الاخرۃ وسعی لھا سعیھا تو خاموش ہوگئے، گویا ان آیتوں کو میں نے ان پر پڑھ کر دم کردیا
میں نے پھر عرض کیا کہ آپ نے طویل صحبت پائی انقلابی صوفی علامہ سندھی رحمۃ کی، جب کہ وہ عمر
کے آخری حصے میں تھے، کمالات روحانی میں شاہ ولی اللہ کے راستے سے خوب ــــــ دل
و دماغ کو آراستہ کرلیا تھا آپ نے ان کی صحبت پائی ۔ فکر ولی اللہ کو ان سے اخذ کیا، جب ان
پر مولوی مسعود عالم ندوی نے تنقید فرمائی تو آپ نے اس کا جواب دیا ہم نے دونوں کتابیں
پڑھیں مسعود صاحب مرحوم سے کہا کہ آپ مسعود ہیں اور وہ سعید ہیں دونوں کا مادہ سعد ہے
آپ نے دراصل منطق نہیں پڑھی، فلسفہ نہیں پڑھا اور کلام سے ناآشنا ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے
کہ تصوف کی کتابوں کے مطالعے میں وحشت ہوتی ہے، لیکن ماشاءاللہ آپ کی زندگی میں ہم
احسان کو پاتے ہیں پھر ہم نے ان سے طویل صحبت رکھی اور اپنا فکر احسانی ان پر پیش کیا بہرحال
ہمارے فاضل جلیل مولانا سعید اکبرآبادی مرحوم کو ہم نے توجہ دلائی کہ اب دیوبند کے سارے
مشائخ جا چکے ہیں اور ان کی آخری یادگار شیخ زکریا ابن یحییٰ محدث رہ گئے ہیں جائیے ان
سے رجوع کیجئے ان کے بعد آپ کو کوئی ایسا پیر نہیں ملیگا جو ظاہر و باطن کا جامع ہے محدث
بھی ہے اور صوفی بھی ہے ۔ ایک عرصے کے بعد جب ہماری ملاقات اکبرآبادی سے ہوئی تو
فرمایا آپ کے ارشاد کی میں نے تعمیل کرلی، شیخ کاندھلوی کے پاس میں پہونچا اور درخواست
کی کہ مجھ کو بیعت فرما لیجئے، ارشاد فرمایا، سعید تمھیں بیعت کی ضرورت نہیں ہے تمھیں جن
بزرگوں کی صحبت ملی ہے ان کے اثرات بحمداللہ آپ میں کافی ہیں کچھ تلقینات کرتا ہوں
اس کی پابندی کرو چنانچہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشادات شیخ کاندھلوی
کی پابندی کی۔

جوہانسبرگ ساؤتھ افریقہ میں دارالعلوم دیوبند اور بزرگوں کے خلاف پروپیگنڈا
کرنے ایک رضاخانی مولوی پہونچ گیا اور گجراتی تجار اس سے بہت متاثر ہوگئے، دیوبندی
فکر کے احباب نے اکبرآبادی مرحوم کو بلایا یہ وہاں پہونچے جس جگہ مخالف کی تقریریں ہوتی
تھیں، اسی سے متصل جگہ پر ان کی تقریریں ہونے لگیں جس میں سیدھے سادے طرز پر اللہ

اور رسول کی باتیں اور دین کی ضروری ہدایتیں پیش کی جاتی رہیں، حسن اتفاق کہ محدث کاندھلوی وہاں تشریف فرما تھے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر مولانا اکبرآبادی نے پھر درخواست کی کہ میں بیعت ہونا چاہتا ہوں، تو محدث کاندھلوی نے فرمایا بھائی تمہارا قلب آئینہ ہوچکا ہے اور اب تم کو دین کے کاموں کے لئے یکسو ہوجانا چاہئے، چنانچہ وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کے ڈائرکٹر بنادیئے گئے، ہم نے مولانا اکبرآبادی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ملاقات کی یہ ہمارا ان کو آخری دیکھنا تھا وہ وہاں کی مجلس انتظامیہ کے رکن رکین تھے، وہاں اس کی میٹنگ میں آئے ہوئے تھے، جب وہ مجلس کے کام سے فارغ ہوئے تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے درخواست فرمائی کہ اساتذہ اور طلبہ کی مجلس میں تقریر فرمائیے چنانچہ مولانا اکبرآبادی نے اس فقیر کے اشارے پر حقیقت تزکیہ اور اصلاح باطنی پر پُرزور تقریر کی اور مدارس عربیہ کو اس پر توجہ دلائی کہ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلب سلیم کو صاف وشفاف آئینہ بنادیا ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً

مولانا اکبرآبادی پر کوئی خدا کا بندہ محققانہ کتاب لکھے اور ان کی شخصیت کو اس طرح پیش کرے کہ اس سے فوائد مرتب ہوں

بہرحال ہم تصوف کے متعلق اپنی باتیں پیش کرتے رہے، اب علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے تلمیذ خصوصی ابن قیمؒ کی کتابوں سے ہم نے جو کچھ سمجھا ہے اس کو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں، ان دونوں بزرگوں کا نام لے کر جو لوگ تصوف اور اہل تصوف پر دلآزار جارحانہ تنقیدیں کرتے ہیں غالبا ان لوگوں نے پوری طرح ان کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ ان کا نام لیکر بیباکی کے ساتھ صوفیہ کی مخالفت نہ کی جاتی، ہم نے ابن تیمیہ کا مطالعہ کیا اور اس کے متخصص علماء سے مذاکرہ کیا ہم ایسے ماحول میں رہے، ان حالات میں گھرے رہے کہ ان دونوں بزرگوں کی صرف مدح سنتے رہے، پھر ہم نے ایسے بزرگوں کی صحبتیں پائیں جو ان پر جرح وقدح کرتے رہے پھر ہم نے حسن ظن سے کام لے کر ان کی کتابیں پڑھیں ان دونوں بزرگوں پر تفصیل سے اب کچھ کہنا نہیں ہے صرف یہ بتانا ہے کہ متقدمین صوفیہ حضرت حسن بصری حضرت ابراہیم بن ادہم حضرت فضیل بن عیاض، حضرت معروف کرخی، حضرت بشر حافی

حضرت شقیق بلخی، حضرت جنید بغدادی، حضرت سہل تستری، حضرت ابو طالب مکی حضرت سید عبدالقادر جیلانی رحمہم اللہ کے متعلق ابن تیمیہ فرماتے ہیں: یہ اسلام کے مشائخ ہیں ائمہ ہدایت ہیں، اللہ نے ان کے حق میں امت کے اندر لسان صدق رکھ دیا ہے۔ (جلاء العینین ص۹۱)

پھر دوسری جگہ احمد بن جواری سر سقطی ابو سلیمان دارانی کے متعلق اپنے رسالے السماع والرقص میں فرماتے ہیں کہ وہ اکابر شیوخ صالحین میں سے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ نے الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطٰن کے ص۱۰۳ پر فرمایا ہے یہ سب کتاب و سنت کے مشائخ ہیں، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

علامہ ابن قیم رح نرم مزاج رقیق القلب متین اور سنجیدہ آدمی تھے اور اپنے شیخ کی محبت میں ڈوبے ہوتے تھے قید و بند کی مصیبتوں میں ان کے رفیق رہے جب ان کا انتقال ہو گیا تو بیحد دل شکستہ ہو گئے ایسی حالت میں ان کو منازل سائرین علامہ ہروی کی کتاب ملی اس کا انھوں نے مطالعہ کیا اور اس کی شرح لکھ ڈالی اس کے تین حصے ہیں ایک حصہ وہ تصوف ہے جس میں تصوف کی تائید و نصرت اپنے علمی دلائل و براہین سے کر ڈالی اور دوسرے حصہ میں تصوف کی سادہ باتیں نقل کر دی ہیں اور ایک حصہ وہ ہے جس میں اپنی دانست میں تصوف پر اور اہل تصوف پر سخت تنقید کر دی ہے۔

ہمارا قصہ سنئے ہم جامعہ دار السلام عمر آباد مدراس جنوبی ہند میں بارہ برس رہے اور درس و تحقیق میں لگے رہے یہ اہل حدیث کا تعلیمی مرکز ہے جس میں ہم نے صبر و ضبط اور حلم و حکمت سے زندگی گذاری جب ہمارا اس مدرسے میں تقرر ہوا تھا تو مزاج میں ایک جھجک اور گھبراہٹ پیدا ہوئی ایسے میں ہم نے حضرت اقدس شیخ الاسلام مرشد الانام سید شاہ حسین احمد مدنی حسینی قدس سرہٗ کو خط لکھا، کہ میں ایسے ماحول میں ہوں کہ پریشانی ہوتی ہے۔ تو حضرت اقدس کا جواب آیا: میں دعا کرتا ہوں تم محنت سے پڑھاؤ اور ان لوگوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرو وہ بھی تم سے تعرض نہ کریں گے، بحمد اللہ ہم نے بارہ برس وہاں اطمینان سے گذار دیئے پھر ہم بارہ برس بعد پڑھا کر نکلے اور ایک علمی سیاحت کی، دوران سیاحت سورت پہونچے، وہاں علامہ مفتی سید مہدی حسن جیلانی قادری دیوبندی سے ملے، ان کے دار الفقہ میں ایک طویل صحبت

باتی گفتگو ان کی تصنیفات پر ہوتی رہی جب میں رخصت ہونے لگا تو انھوں نے مدارج السالکین شرح منازل السائرین مصنفہ علامہ ابن قیم مجھے عطا فرمائی اور کہا کہ اس کی تین جلدیں ہیں دو جلدیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ایک جلد میرے پاس نہیں ہے اس کا خوب مطالعہ کرو، میں حیران رہ گیا کہ انھوں نے یہ کیسا پالیا کہ میں منکرین صوفیہ کے حلقہ سے آیا ہوں اب میں سفر میں اس کتاب مستطاب کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا رہا، پھر اسی دوران سیاحت میں دارالاسلام جمال پور پٹھان کوٹ پنجاب پہونچا وہاں آٹھ مہینے رہا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، شیخ امین احسن اصلاحی، سید مسعود عالم ندوی اور ان لوگوں کے ساتھ رہ کر علمی مذاکرات ہوتے رہے، ایک مرتبہ دسترخوان پر میں نے مولانا اصلاحی سے عرض کیا کہ آپ کا ذہنی معدہ امام ابن عربی کے تصوف کو ہضم نہ کرسکے گا البتہ علامہ ابن قیم کی کتاب مدارج السالکین میں جو تصوف ہے وہ آپ کے لئے سریع الہضم ہے اس کا مطالعہ فرمائیے، سب نے تعجب سے کہا ابن قیم نے بھی تصوف پر کچھ لکھا ہے پھر میں نے مدارج السالکین جلد اول اصلاحی صاحب کے حوالے کردی کہنے لگے یہ عجیب و غریب کتاب ہے رات میں نے جو پڑھنا شروع کیا تو کافی حصہ پڑھ لیا اور یہ معلوم ہوا کہ اس فن کی صحیح تعبیر کتاب و سنت میں کی جاسکتی ہے آپ نے مجھ پر بڑا علمی احسان کیا ہے، میرا مملوکہ نسخہ ان لوگوں کے حوالے ہوا، برسوں کے بعد کتاب مجھے واپس ملی، بہرحال علامہ ابن قیم کی باتیں سنئے جس میں تصوفِ حقیقی کی مخالفت تو درکنار دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ طریق کتاب و سنت میں مفید ہے (مدارج السالکین ص۵۵ ج۲)

اور شیوخ عارفین کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ تصوف کتاب و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے اور سند کے طور پر ان بزرگوں کے اقوال نقل فرمائے ہیں، سید الطائفہ جنید بغدادی، ابوحفص، ابوسلیمان دارانی، سہل بن عبداللہ تستری، حضرت ابویزید بسطامی، شیخ احمد بن ابی الحواری، ابوعثمان نیشاپوری، ابوالحسن نوری، محمد ابن فضل، عمر بن عثمان مکی، ابوسعید خراز، ابن عطار اسکندری، ابواسحاق رقی، ادر یعقوب نہرجوری، ابوالقاسم نصرآبادی، ابوبکر طمانی، ابوعمر بن نجید، ابوحمزہ بغدادی، ان کو تو امام احمد بن حنبل صوفی کہہ کر پکارا کرتے تھے، پھر ابن قیم فرماتے ہیں کہ جو لوگ ان صوفیاء سے الگ ہیں وہ رہزن ہیں اور ابلیس کے کارندے ہیں (مدارج السالکین ج۲ ص۳۴)

علامہ ابن تیمیہ نے اپنے رسالے فی السماع والرقص میں لکھا ہے کہ ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا کیا جس کو اس نے پہلے کے یونانی فلاسفہ سے اور بدعتی متکلمین جہمیہ سے اخذ کیا تھا بہت سی علمی وعملی باتوں میں وہ ملاحدہ اسمٰعیلیہ کے راستے پر چلا اور کبھی اس نے صوفیاء کے طرز پر قرامطہ باطنیہ کے خیالات کو ظاہر کیا، علامہ سید سلیمان ندوی رح نے اپنی کتاب خیّام میں لکھا ہے کہ فلسفیانہ تصوف جدید اور افلاطونی الٰہیات کا ایک ہی سرچشمہ ہے، علامہ ابن تیمیہ جلاء العینین میں فرماتے ہیں، ان لوگوں نے تصوف میں گفتگو کی لیکن مسلمانوں کے طریق پر نہیں بلکہ فلاسفہ کے طریق پر اپنے رسالے علم الظاہر والباطن میں ملاحدہ باطنیہ کی تلبیسات کو نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ متکلمین صوفیاء کے کلام میں وہ باتیں راہ پاگئیں ہیں، صوفیہ میں بعض ایسے بدترین لوگ ہوئے ہیں جو ملاحدہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو ضروری نہیں جانتے ہیں یہ لوگ محققین صوفیہ اور ان کے ائمہ کے برعکس ہیں، بہرحال ابن تیمیہ کی اور ابن قیم کی کتابیں ایسی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔

مدارج السالکین میں باب الذوق میں ابن قیم فرماتے ہیں جن لوگوں نے ایمان کا دعویٰ کیا وہ صاحبان ذوق نہ تھے، اللہ نے ان سے فرمایا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ آیت۔ یعنی یہ لوگ کفر کے دائرے سے نکل کر اسلام کے دائرے میں آگئے، ابھی ایمان ان کے دل کے اندر رچا نہیں، صاحب ذوق نہ ہونے کی وجہ سے یہ اسلام کے دائرے سے خارج نہیں ہیں، البتہ صاحب ذوق کا معاملہ دوسرا ہے، ذوق ایک امر باطنی ہے اچھا عمل اس کا نشان ہے، اعمال صالحہ عقائد صحیحہ کے ثمرات ہیں اور یقین سے مجاہدے کے ذریعہ احسان کا مقام پیدا ہوتا ہے (مدارج السالکین ج ۳ ص۵۸)

بہرحال ہمارا حسن گمان یہ ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن قیم رح کو متقدمین صوفیہ اور حقیقی تصوف سے اختلاف نہیں ہے، ہمارے بزرگوں میں حضرت حکیم الامت تھانوی رح فرماتے ہیں عینیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عبد ومعبود دونوں ایک ہوگئے یہ تو کفر صریح ہے (تعلیم الدین ص۹۵) کلید مثنوی میں اس شعر کی شرح میں۔ ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ ؛ زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

صوفیہ کا مشہور مسئلہ وحدت الوجود ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا نے ارشاد فرمایا کہ گو ممکنات موجود ہیں کیونکہ اللہ نے ان کو وجود دیا ہے مگر اللہ کے وجود کے روبرو ان کا وجود ضعیف حقیر اور ناقص ہے اسلئے وجود ممکن کو وجود واجب کے روبرو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم فرور ہے۔ جب یہ کالعدم ہوا تو متعدد وجود ایک ہی رہ گیا وحدت الوجود کے یہی معنی ہیں۔ کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ وجود کا ایک ہونا ہے سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا گو ہے مگر ایسا ہے گویا کہ نہیں ہے اس کو ادعائی وحدت الوجود کہا جاتا ہے اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق میں توحید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں ہے جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبے میں فنا کہلاتا ہے، یہ البتہ مطلوب ومقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدت الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے شہود کا ایک ہونا یعنی واقع میں تو ہستی متعدد ہے مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور بقیہ سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں، پس وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں اختلاف لفظی ہے ایسا ہی میرے مرشد نے کہا ہے (شیخ عرب وعجم شیخ مشائخ صالحین مصلحین شاہ امداد اللہ فاروقی تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ) وحدت الوجود کے معنی چونکہ عوام میں غلط مشہور ہوگئے تو بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا (کلید مثنوی)

مسئلہ وحدت الوجود کی تفصیل جو مولانا تھانوی رہ نے کی ہے اس کو ذہن میں رکھیے اور دیکھئے علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے کیا کہا ہے (مدارج السالکین ج ۳ ص۸۹۔

(طریق الہجرتین ص۳۳۴)

مدارج السالکین جلد اول ص۸۳ پر علامہ ابن قیم کی ایک تقریر ہے، سنئے

جس طرح انوار مخلوقہ اللہ کے نور کے سامنے اور علم خلق علیم حق کے سامنے مخلوق کی قدرت اللہ کی قدرت کے سامنے مضمحل ہے اسی طرح زمان دہر اور وقت دوام الٰہی کے سامنے مضمحل ہے جب سالک پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے تو تمیز کی قوت کمزور ہوجاتی ہے اور حال غالب ہوجاتا ہے تو اہل استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے مافی الوجود الا اللہ

[illegible]

دوام جب ماسوا اللہ پر غالب آتا ہے تو ہر شئی ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے، یہیں سے وحدت الوجود کے ماننے والوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے اسی قسم کے مشتبہ کلمات جو اہل استقامت کی زبان سے نکل گئے لوگوں نے اپنے کفر کا سنگ بنیاد بنادیا چنانچہ ابن تیمیہ نے فنا کی تین قسمیں کی ہیں، پہلی قسم انبیاء اور اولیاء کاملین کا حصہ ہے دوسری قسم قاصدین اولیائے صالحین کو نصیب ہوتی ہے اس کے ضمن میں وہ فرماتے ہیں دوسری قسم ماسوا کے مشہود سے فنا ہے اور یہ اکثر سالکوں کو پیش آتی ہے، اللہ کی محبت اللہ کی عبادت اور اللہ کے ذکر کی طرف انجذاب سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے، محبوب کا استغراق غیر کا شعور باقی نہیں رہنے دیتا، پس موجود کا وجود مشہود کا شہود اور مذکور کا ذکر اس سے غائب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ مخلوق اس کی نگاہ میں فنا ہو جاتی ہے اور صرف اللہ باقی رہ جاتا ہے، چونکہ پہلی قسم کی فناء سے اس فناء کا درجہ کم ہے اس لئے انبیاء اور اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سابقین اولین کو یہ فنا پیش نہیں آئی ان امور کی ابتداء تابعین کے عہد سے ہوئی، مشائخ صوفیہ میں سے حضرت ابویزید بسطامی حضرت ابوالحسن نوری، حضرت ابوبکر شبلی وغیرہ کو یہ احوال پیش آئے اور ان کے سوا حضرت ابوسلیمان دارانی حضرت معروف کرخی اور حضرت فضیل بن عیاض بلکہ جنید بغدادی کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی (العبودیۃ ص۹۸)

غور کیجئے صوفیہ صافیہ کے وحدت الوجود یا وحدت الشہود میں اور ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بیان کردہ اس فنا میں کیا فرق ہے بلکہ یہ دونوں بزرگ کے وسعت خیال کا حال یہ ہے کہ اگر سالک غلبہ حال میں سبحانی ما اعظم شانی اور ما فی جبتی الا اللہ کہدے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق جانتے ہیں (مدارج السالکین ج ۱ ص۸۵)

ان تصریحات کے بعد ہم ایک کتاب کا تعارف کراتے ہیں۔ مدارج السالکین علامہ ابن قیم کی تصوف پر مفصل کتاب ہے، تین جلدوں میں ہے جس کو علامہ سید رشید رضا الحسینی مصری نے اپنے اہتمام سے مصر میں چھپوائی ہے اور اسکے ٹائیٹل پر لکھا ہے، یہ وہ کتاب ہے جس میں تصوف اور معارف اللہ کے حقائق کتاب و سنت اور سلف صالح کے مطابق بیان کئے

گئے ہیں مصر کے مشہور مصنف عالم ہے، شیخ حامد الفقی جو علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم رحمہما کے محبین میں سے ہیں اور ان کے علوم و معارف کے پھیلانے کا بہت شوق رکھتے ہیں ان کو رنج ہے کہ مشائخ صوفیہ سے بکثرت ان کے ارشادات کیوں نقل کئے ہیں، شیخ حامد کو یہی شکایت ابن تیمیہ سے بھی ہے کہ انھوں نے صوفیہ کی تعریف کیوں کی ہے، اللہ اکبر، یہ تو وہی بات ہوئی الناس اعداء لما جھلوا، کیسی دردناک صورت حال ہے کہ ان دو بزرگوں کی ہر بات قابل قدر ہے جو آپ کے نفس کے مطابق ہو اور جب وہ ایسی کوئی بات بیان کریں جس کو آپ کا نفس قبول نہ کرے تو آپ اس کو دلیل کے بغیر رد کر دیں، علامہ سید رشید رضا مصری نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے، انھوں نے تصوف کے متعلق کوئی بہتر خیال ظاہر نہیں کیا ہے مگر مجبوری میں یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ بے شبہ صوفیہ صافیہ اہل حقائق ہیں جن کے سامنے متکلمین وفقہاء کی زبانیں بند ہوجاتی ہیں، حقیقت میں حکمت الٰہیہ کے حامل ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ صوفیہ صافیہ نے اسرار شریعت محمدیہ کے بیان اور اخلاق کی تربیت کے ذریعہ اسلام کی خدمت کی ہے، یہاں ہم ایک واقعہ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ مصری کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اپنے ایک خصوصی جلسے میں بلایا اس زمانے میں پانی کے جہاز سے وہ زحمت اٹھا کر آئے اور ندوے سے بہت متأثر ہوئے پھر ان کو علی گڑھ کالج نے اپنے یہاں مدعو کیا جب یہ مصری بزرگ علی گڑھ پہونچے اور وہاں پورا کالج دیکھا پھر شعبہ عربی شعبۂ دینیات کو ملاحظہ فرمایا، صدر شعبۂ دینیات مولوی عبداللہ انصاری دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور مولانا شاہ محمد قاسم صدیقی نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے داماد تھے، جب سرسید احمد مرحوم نے مولانا نانوتوی کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی اور شعبۂ دینیات کی تشکیل کی فرمائش کی تو مولوی عبداللہ کو بھیج دیا گیا، جب علامہ مصری کالج دیکھتے ہوئے شعبۂ دینیات میں پہونچے اور مولوی عبداللہ صاحب سے عربی میں گفتگو کی، جب انھوں نے شستہ شگفتہ فصیح اور بلیغ عربی میں روانی سے گفتگو کی تو انھوں نے (مصری بزرگ) دریافت کیا، کیا آپ نے ندوے میں پڑھا ہے، انھوں نے کہا نہیں بلکہ میں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی ہے جہاں علوم عقلیہ ونقلیہ قرآن وحدیث

فقہ اور تصوف اور جمیع علوم متداولہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ تو مصری بزرگ نے دارالعلوم دیکھنے کی آرزو کی، مولوی عبداللہ انصاری ان کو دیوبند لے آئے۔ بعد ظہر جلدی میں ایک جلسے کا انتظام کیا گیا مولانا ابوالطیب علامہ مفتی محمد احمد قاسمی مہتمم اور مہتمم ثانی علامہ شیخ حبیب الرحمٰن عثمانی تھے جلسے میں علامہ سید انور شاہ کشمیری نے مہمان مصری کے خیر مقدم میں عربی قصیدہ پڑھا، قصیدہ سن کر سید رشید رضا کو وجد آگیا، شاہ صاحب کے قصیدے سے بہت متأثر ہوئے، پھر شاہ صاحب نے ایک مبسوط تقریر کی اپنا تعارف کرایا کہ دیوبند کا کیا مسلک ہے، بتایا کہ امام شاہ ولی اللہ دہلوی صاحب حجۃ اللہ البالغہ نے تجدید دین کا کام کیا ہے، ان کے تحقیقی منہاج پر قرآن وحدیث فقہ اور تصوف کی ایک نئی تحقیقی شان ہوئی ہے اسی جامع اور محققانہ طرز پر ہمارا مسلک ہے، پھر شاہ صاحب کا اور رشید صاحب کا مذاکرہ چلا جس سے وہ اور محظوظ ہوئے، یہ واقعہ اپنی تفصیل کے ساتھ تاریخ دارالعلوم دیوبند میں دیکھئے۔

اب ہم ان بزرگوں سے جو سلسلۂ ولی اللٰہی کے ترجمان اور نمائندے ہیں امید کرتے ہیں کہ اس ذہنیت کلیہ کی حفاظت کریں گے، جو جامعیت علوم اربعہ پر مبنی ہے واللہ ولی التوفیق وہو خیر الرفیق۔

ہاں اور دو چار باتیں عرض کرنی ہیں، علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ جو شخص منازل السائرین کی شرح کو دیکھ لے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ دو حضرات ابن تیمیہ اور ابن قیم نہ صرف اہل سنت اور جماعت ہی میں ہیں بلکہ امت محمدیہ کے اولیاء میں سے ہیں (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۲۴۷)

علامہ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں کہ ابن قیم کو تصوف میں بڑا مرتبہ حاصل ہے، ان کو اذواق ومواجید کا بڑا حصہ ملا جس پر ان کی کتابیں شاہد ہیں (جلاء العینین ۲۱)

عام طور پر تصوف پر معترض یہ کہتے ہیں کہ تصوف جمود اور تعطل کا نام ہے، ہم چند بزرگوں کا حوالہ دیتے ہیں، ہندوستان میں عہد عالمگیری کے بعد جو تحریک دینی اور تجدید یقینی کی جدوجہد ہوئی، علمی اور عملی انقلاب آیا اس میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادے اور ان کے فیض یافتہ تلامذہ اور مسترشدین کی مجاہدانہ کوششیں اور مجتہدانہ کاوشیں یہ بتا رہی ہیں کہ

کس طرح ان بزرگوں نے جمود کو حرکت سے بدلا اور تعطل کو عملی مساعی سے بدل کر رکھ دیا، اور خصوصاً سید احمد شہیدؒ کی تحریک اسلامی اس کی تاریخ اسپر شاہد ہے، اسی طرح مسلم ملکوں پر نظر ڈالئے کہ مغربی استعمار کے مقابلے میں جن بزرگوں نے اپنی جان ومال کو لٹایا اور قربانیاں پیش کیں ان کی مبسوط تاریخ ہے، سید عبدالقادر امیر جزائری، سید محمد احمد سوڈانی سید احمد سنوسی اس میدان کار میں مصروف جہاد نظر آئیں گے، سید احمد سنوسی ایک مرشد روحانی شیخ طریقت صوفی زاہد ومرتاض کے علاوہ ایک زبردست فوجی سپہ سالار بھی تھے حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات سے اور اسکے نتیجے میں نفس کا تزکیہ اور قرب الٰہی کے ذریعہ جذبۂ شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے وہ سب کچھ تصوف ہی کا ثمرہ ہے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری درجہ شوق شہادت ہے نفسیاتی پہلو سے اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مرغوبات نفسانی عادات حیوانی عادی مالوفات دنیوی مصالح ومنافع اور اغراض وخواہشات کی پستیوں سے وہی شخص نکل سکتا ہے جو مجاہدہ کرکے میدان جہاد میں گامزن ہوتا ہے، اللہ کا عشق پارے کی طرح کیفیت سیمابی اور تجلی حق کی بیتابی پیدا کردیتا ہے، مسلمانوں کی ماضی قریب کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ حرکت میں ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنھوں نے اپنے دل کی بیتابی اور ایمان ویقین کی قوتوں سے ہزاروں انسانوں میں ایک روح پھونک دی، معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کے لئے فتح ونصرت کے حالات میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوئے ہیں اسی لئے کسی غیر معمولی شخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن جب مایوس کن حالات ہوں اور ماحول میں بے یقینی کی کیفیات ہوں تو صرف وہی مرد میدان کش مکش کی طاقت رکھتا ہے جو تعلق باللہ اور مالک حقیقی کے عشق میں سرشار ہو، انیسویں صدی میں جب مسلمان ملکوں پر فرنگیوں کا طوفان منڈلانے لگا تو جو مردان کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے، وہ اکثر وبیشتر مشائخ صوفیہ اصحاب سلاسل تصوف تھے جن کا تزکیہ نفس، سلوک راہ نبوت اور صحابہ وتابعین کی دینی حمیت، کفر کی نفرت، دنیوی خرافات کی حقارت، اللہ کے راستے میں شہادت کی تمنا ان کے پاس سب سے بڑی قوت تھی، الجزائر میں سید عبدالقادر امیر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا ۱۸۳۲ء سے

۱۸۴۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا یورپ کے مؤرخوں نے امیر جزائری کی ہمت و شجاعت اور علمی و عملی خوبیوں کی تعریف کی ہے، علامہ امیر البیان محمد شکیب ارسلان نے (حاضر عالم اسلام جلد دوم ص ۱۷۳) لکھا ہے امیر عبدالقادر جزائری پورے عالم دین، ادیب محرر، مقرر، عالی دماغ، پاک دل اور بلند پایہ صوفی تھے صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً و ذوقاً صوفی تھے، انکی مشہور کتاب المواقف ہے وہ ایسے یکتائے روزگار لوگوں میں سے تھے کہ متاخرین میں اس کی نظیر نہ مل سکے گی دمشق کے زمانہ قیام کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ روزانہ صبح کو اٹھتے فجر کی نماز اپنے گھر کے قریب مسجد میں پڑھتے سوائے بیماری کے کبھی اس معمول میں فرق نہ ہوتا، تہجد کے عادی تھے اور رمضان میں صوفیا صافیہ کے طرز پر ریاضت و مجاہدے میں مشغول رہتے، متقیانہ سیرت اور اخلاق حسنہ پر قائم رہتے ہوئے ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا (حاضر عالم اسلامی ج ۲ ص ۱۷۳)

تاغستان بحر خزر کے مغربی ساحل پر مسلمانوں کا ایک ملک تھا اور شمالی خفقاز کو ملا کر تیس لاکھ کے درمیان وہاں مسلم آبادی تھی ہشام ابن عبدالملک اموی کے زمانے میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا اس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیر اثر تھا، جب روسیوں کا وہاں تسلط ہو گیا تو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مشائخ نقشبندیہ نے جہاد کا علم بلند کیا، اور ایسی جدوجہد کی کہ اسلامی شریعت کے مطابق سارے معاملات فیصل ہونے لگے، جاہلی مراسم و خرافات سب ترک کر دیئے گئے۔

امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ اس جہاد کے علمبردار تاغستان کے علماء و مشائخ تھے جو نقشبندیہ سلسلے کے زاہد و مرتاض صوفی تھے اس حقیقت کو انھوں نے عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان حکام سے پہونچتا ہے جو سرکاری خطابات عہدے اور اقتدار جھوٹی قیادت، عیش و لذت، تمغوں اور مرتبوں کے لالچ میں قوم فروشی کا ارتکاب کرتے ہیں یہ سمجھ کر مشائخ نے ملکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعت کے مطابق ہو نہ کہ جاہلی عادات کے مطابق، اس تحریک کے قائد غازی محمد روسی تھے، وہ علوم دینی میں بلند مرتبہ رکھتے تھے ان کی رسوم جاہلیت

کے خلاف ایک تصنیف بھی ہے جس میں انھوں نے اپنے علاقے کی غیر شرعی رسموں کی نشاندہی اور اصلاح کی ہے، کتاب میں اس علاقے کے دنیا پسند سرداروں پر سخت تنقید ہے ۱۸۳۲ء میں غازی محمد روسیوں سے شہید ہوگئے، ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے ان کے بعد شیخ شامل نے مجاہدوں کی قیادت سنبھالی جو امیر جزائری کے طرز پر تھے، دینی شیخت کے ساتھ سیاسی امارت ہاتھ میں لی تھی، شیخ شامل نے پچیس سال تک روس سے مقابلہ جاری رکھا مختلف معرکوں میں فتح حاصل کی، روسی ان کی شوکت اور شجاعت سے مرعوب تھے، ۱۸۴۵ء میں شیخ شامل نے سارے قلعے فتح کرلئے بڑا جنگی سامان مال غنیمت میں ہاتھ آیا، اخیر میں ۱۸۸۵ء میں اس مجاہد نے ہتھیار کھوئے تصوف اور جہاد کی جامعیت کی ایک مثال سید احمد سنوی کی ذات ہے، جن کا اطالویوں سے مقابلہ ہوا طرابلس کی فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا گیا تھا، نوآبادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز سرداروں نے تنقید کی اور کہا یہ اطالویوں کی ناتجربہ کاری ہے اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے پھر بھی اٹلی والے اس علاقے کو فتح نہ کرسکے۔

یہ سنوسی درویشوں اور ان کے مجاہدانہ مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ اٹلی کو پندرہ برس تک قدم جمانے نہیں دیا، امیر شکیب نے لکھا ہے کہ طریقہ سنوسیہ کا نظام ایک حکومت کا نظام ہے، سید سنوسی کے متعلق امیر شکیب فرماتے ہیں مجھے سید سنوسی میں غیر معمولی صبر ثابت قدمی اور استقامت نظر آئی جو کم لوگوں میں دیکھی گئی، اولوالعزمی کے ساتھ اپنے تقوے اور عبادت کے لحاظ سے وہ اپنے زمانے کے اولیاء میں شمار ہونے کے قابل ہیں،

بہرحال ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ نفس کے تزکیۂ باطن کی پاکیزگی کے بعد ایسا عزم وحوصلہ پیدا ہوجاتا ہے کہ جس کے ذریعہ اسلام کے دشمنوں سے مقابلے کی غیر معمولی قوت آتی ہے، ہم کہاں تک بتائیں کہ اہل تصوف میں جمود وتعطل نہیں ہے بلکہ للّٰہیت کی تحریک ہے جس کو قرآن تبتل کہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ صوفیاء میں بعض اہل رخصت کسی عذر شرعی سے گوشہ گیر ہوگئے ہوں لیکن عزیمت کار سے الگ رہ کر اپنی ہمت باطنی اور دعاؤں سے کام کررہے ہوں۔

اب ہم آپ کے سامنے ہندوستان کی تحریک انقلاب کا مختصر تذکرہ کریں گے، سرزمین ہند میں عہد عالمگیری کے دور میں چند ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے دہلی میں جب کہ مسلمانوں کی حکومت میں زوال کے آثار نمودار ہورہے تھے تو ان بزرگوں نے دین کی تجدید اور انقلاب کی تحریک شروع کی حضرت امام ہمام حکیم الاسلام ابو الفیاض قطب الدین احمد ابن عبدالرحیم المعروف بشاہ ولی اللہ دہلوی کا ظہور ہوا، انھوں نے اپنے دور کے علماء ومشائخ علوم وفنون کے ماہرین اساتذہ سے تحصیل وتکمیل علمی وعملی کرلی، پھر ایک مدت دراز تک ان علوم وفنون کی تدریس واشاعت میں عمر گذاری اور حجاز مقدس کا سفر کیا اور حرمین شریفین کے اہل علم وفضل سے استفادہ کیا خصوصاً مدینہ منورہ میں امام شیخ ابو طاہر کردی مدنیؒ سے علم حدیث کی تکمیل کی، اس سے پہلے وہ اپنے والد شاہ عبدالرحیم فاروقی سے اور اپنے شیخ ابوالرضا محمد سے علوم عقلیہ کی تکمیل کرچکے تھے علوم عقلیہ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ علوم دینیہ میں کمال پیدا کیا اور تعلیم کے دونوں درجے تحصیلی وتکمیلی میں پورے فائز المرام ہوئے اور تزکیے میں پورا درک حاصل کیا، حرمین سے ایسی حالت میں واپس ہوئے کہ امت مسلمہ میں دینی تجدید کیلئے سروسامان سے آراستہ وپیراستہ ہوچکے تھے، ہندوستان آنے کے بعد دہلی کو اپنا مرکز بنایا اور قرآن وحدیث فقہ اور تصوف چاروں میں ایسا تجدیدی کارنامہ انجام دیا کہ ان کی جامعیت سے ایک ذہنیت پیدا ہوگئی، قرآن و حدیث کی روشنی میں فقہ اور تصوف کا جائزہ لیا اور ایسا فکر صحیح مہیا فرمایا کہ جس کی بنیاد پر علمی جدوجہد کے ذریعے ایک علمی سوسائٹی بنائی، اس سوسائٹی نے عوام وخواص میں ایک ذہنی اور خارجی انقلاب پیدا کیا آج ہمارے لئے وہ مشعل راہ ہے مسلمانوں کی ذہنی زندگی کی اصلاح کے لئے ہمیں جدوجہد کرنی چاہئے۔ تفسیروں میں حدیث کے مجموعوں میں فقہ کے ذخیروں میں اور تصوف کے لٹریچر میں شاہ ولی اللہ کے فکر کی بنیاد پر تدبر کرنا چاہئے اور ان کے متعلقہ علوم میں تحقیق کرنی چاہئے اور ایسی تنقیح کی جائے کہ جس کے ذریعہ صالح عنصر بیکار حصے سے الگ ہوجائے بے شک تحقیق وتنقیح کے اسی گراں قدر خدمت سے موجودہ اہل تجدد کے پھیلائے ہوئے فتنے کو ختم کیا جاسکتا ہے

شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی پھر شاہ ولی اللہ کے

پوتے شاہ اسمٰعیل اور شاہ اسحاق ان بزرگوں نے جو معتدل اور متوازن علمی وعملی پروگرام بنایا ہے گو اس میں خلل پیدا کیا گیا پھر بھی سوسائٹی اپنے عملی پیکر کے ساتھ موجود رہی اور اس تحریک دینی کے آخری بزرگ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید شاہ حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک ذات ہے ہم ان کے ارشادات پر اپنی اس تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

بیعت اور اس کا ثبوت

بیعت نام ہے اس کا کہ شریعت کی کسی بات کے لئے عہد لیا جائے کہ وہ اس امر کو اللہ کے حکم سے انجام دینگے یا کسی خاص دینی مسئلہ کا کہ وہ اس پر عمل کریں گے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع میں ایسا کیا ہے چنانچہ حدیبیہ کی لڑائی کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لیا تھا کہ اگر دشمنوں سے مقابلہ کی نوبت آئی تو وہ بھاگیں گے نہیں بلکہ جب تک زندہ رہیں گے دشمنوں کا مقابلہ کرینگے اور موت آجائے تو اس کو اختیار کریں گے اور اسلام کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادیں گے اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح میں فرمایا ہے لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذیبایعونك تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحًا قریبًا۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہوگیا، جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے پس اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اطمینان پیدا کر دیا اور ان کو فتح قریب عطا فرمائی۔

اسی طرح سورۂ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں سے بیعت لینے کے متعلق ذکر کیا ہے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ یاایھا النبیّ اذا جاءك المؤمنات یبایعنك علیٰ ان لایشرکن باللہ شیئاً ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن الآیۃ۔ ترجمہ:۔ اے نبی جب مؤمن عورتیں تمھارے پاس آئیں اور عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی ——— ——— اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی۔

زمانہ جاہلیت میں عادت تھی کہ اپنے بچوں کو مرد عورت (ماں باپ) فقر وفاقہ کی وجہ سے قتل کرڈالتے تھے، فرمایا گیا ہے لاتقتلوا اولادکم خشیۃ املاق فاقہ کے خوف سے

اپنے بچوں کو مت مار ڈالو ـــــــ اسی طرح اور برائیوں میں لوگ مبتلا تھے، عہد لیا گیا کہ ان سب سے علیحدہ ہو کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کریں گے، ان آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عورتوں سے بیعت لیجئے اور ان کے لئے استغفار کیجئے، پس معلوم ہوا کہ بیعت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ان بارہ صحابہ کرام میں ہیں جو بیعت عقبہ میں شریک تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو داعی اسلام اور مبلغ (نقیب) بنا کر بھیجا تھا، اسکے علاوہ آپ کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ آپ جنگ بدر میں شریک تھے جن کی مغفرت کا دنیا ہی میں اعلان ہو چکا تھا، یہی حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، صحابہ کی ایک جماعت آپ کے گرد حاضر تھی آپ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

بایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ شیئاً ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادکم ولا تاتوا ببھتان تفترونہ بین ایدکم وارجلکم ولا تعصوا فی معروف فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ ومن اصاب من ذالک شیئاً نعوقب فی دنیا فھو کفارۃ لہٗ ومن اصاب من ذٰلک شیئاً ثم سترہ اللہ فھو الی اللہ ان شاء عفا عنہ وان شاء عاقبہ فبایعناہ علی ذالک (بخاری شریف کتاب الایمان)

ترجمہ:۔ مجھ سے بیعت کرو اس پر کہ اللہ کا کسی کو شریک نہیں گردانو گے، سرقہ اور زنا کا ارتکاب نہیں کروگے اور اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہ کروگے، اور بہتان نہ باندھوگے اور کسی بھی اچھے کام میں نافرمانی اور حکم عدولی نہ کروگے، پس جو شخص اس عہد کو پورا کرے اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے اور جو شخص ان میں سے کسی جرم کا مرتکب ہو جائے پس اگر دنیا میں اس کو اس کی سزا مل گئی تو وہ کفارہ ہو سکتی ہے اور اگر دنیا میں اللہ نے اس کی پردہ پوشی کرلی تو پھر اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے معاف کرے اور اگر چاہے تو سزا دے،
(راوی کہتے ہیں کہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد ختم کر چکے تو ہم نے آپ سے ان باتوں پر بیعت کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف لوگوں سے مختلف چیزوں پر بیعت لی ہے حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی اس بات پر کہ ہم ہر مسلمان کی خیر خواہی کریں گے اور حفاظت کریں گے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے اس سے بچیں گے۔

حضرت سلمہ بن اکوع سے پوچھا گیا کہ حدیبیہ میں کس چیز پر بیعت کی تھی تو کہا موت پر، یعنی اس پر کہ مر جائیں گے لیکن بھاگیں گے نہیں، کبھی بعض خاص باتوں پر بیعت کی، کبھی پوری شریعت پر کسی سے اس پر بیعت کی کہ کسی سے کوئی چیز مانگیں گے نہیں، اس کا اثر یہ تھا کہ صحابۂ کرام میں کسی کا کوڑا گر جاتا تھا یا وہ گھوڑے پر سوار ہوتے تو خود ہی اتر کر اٹھاتے تھے یعنی کسی کو اٹھانے کے لئے نہیں کہتے تھے کہ کہیں یہ بھی سوال نہ ہو، مختلف جگہوں میں مختلف طریقہ سے قرآن اور حدیث میں ذکر آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی کبھی کچھ چیزوں کے لئے کبھی پوری شریعت کے لئے۔

بیعت کوئی نئی چیز نہیں ہے، قرآن وحدیث میں بہت سے واقعات ذکر کئے گئے ہیں جن سے بیعت کا ثبوت ملتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے یہ سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے، بیعت اس بات پر ہوتی ہے کہ شریعت کے حکموں کی تعمیل کرینگے اللہ کا ذکر کریں گے اور شریعت پر چلیں گے، اسی کو بیعت طریقت کہا جاتا ہے، بیعت کے طریقے ہر زمانے میں جاری رہے ہیں اور اللہ کے خاص خاص بندوں نے مسلمانوں سے اس سلسلہ میں عہد لیا ہے۔

بیعت کون لے سکتا ہے

بیعت کا ہر شخص کو حق نہیں، بیعت لینے کا اسی کو حق ہے جو فسق وفجور سے بچتا رہا ہو اور کسی پیر کے پاس رہ کر کتاب وسنت کی روشنی میں تزکیۂ قلب حاصل کر چکا ہو اور اپنے مرشد سے نسبت باطنی حاصل کی ہو، ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ پر زمانۂ سابق میں بیعت کی جاتی تھی تمام صحابۂ کرام میں یہ اوصاف پائے جاتے تھے، مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے خصوصاً یہ سلسلہ زیادہ چلا ہے حضرت علی کے بعد حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ۔

شیخ یا مرشد

حضرت علی رض کے بعد حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء رحمہم اللہ میں سے جو بیعت لیتے ہیں ان کو پیر کہتے ہیں، پیر کے معنی بڈھے کے ہیں اور عربی میں اسے شیخ کہتے ہیں۔

چونکہ عموماً وہ شخص جو زیادہ دنوں تک اللہ اور رسول کی اطاعت میں وقت گذارتا ہے اور تجربہ حاصل کرتا ہے اور پھر اشاعت و تبلیغ کا کام کرتا ہے بوڑھا ہوتا ہے اسی لئے اسکو پیر کہا جاتا ہے، پیر کسی شخص کا نام نہیں ہے کسی مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ جو شریعت کا پابند اور عرصۂ دراز تک ریاضت کئے ہوئے ہو وہ اللہ کی کثرت سے اطاعت کرتا ہو، اور دنیا کا حریص نہ ہو اس قدر عبادت کی ہو کہ اسے نسبت پیدا ہو گئی ہو وہی پیر ہوتا ہے مگر عرصۂ دراز گذرنے کے بعد جس طرح ہر جماعت میں کھرے کھوٹے ہوتے ہیں، اسی طرح طریقت کے اندر بھی کھرے کھوٹے پیدا ہو گئے

جو شخص شریعت پر نہ چلتا ہو، اور سنت کا تابعدار نہ ہو وہ شخص بیعت لینے کا مستحق نہیں ہے۔ حکم ہوا ہے۔ یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّدقین ،
اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اللہ سے اور سچوں کے ساتھ رہو، پیر وہ ہوتا ہے جو ہر طرح سچا ہو جس کے اندر فریب نہ ہو، پیر اس شخص کو بنایا جاتا ہے جو سچا ہو اللہ کے ساتھ اور رسول اللہ کے ساتھ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یاایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ وجاھدوا فی سبیلہ لعلکم تفلحون۔ اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اللہ تعالیٰ سے یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ تلاش کرو اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

ایمان کا درجہ اول ہے اور ثانوی درجہ تقویٰ کا ہے اور تیسرا درجہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ کا ہے، محققین کی رائے ہے کہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ سے مراد مرشد تلاش کرنا ہے چوتھا حکم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو، سب سے پہلا جہاد یہ ہے کہ اپنے نفس کے خلاف جہاد کرو

طریقت وتصوف سنت قدیمہ ہے

طریقت وتصوف نئی چیز نہیں ہے بلکہ پرانی ہے، عرصہ سے چلی آرہی ہے، صحابۂ کرام فرماتے ہیں کہ آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجمع میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا، ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہیں تھا اس کے کپڑے نہایت سفید تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب گھٹنے سے گھٹنے ملاکر بیٹھ گئے ہم نے تعجب کیا وہ باہر سے آئے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تھے کیونکہ ایسے آدمی کے جو سفر کرکے آیا ہو کپڑے بہت میلے اور گندے ہوتے ہیں، اس نے سوال کیا ما الایمان؟ ایمان کیا ہے، آپ نے فرمایا ان تومن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ وتومن بالبعث بعد الموت والقدر خیرہ وشرہ اوکما قال ایمان یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اسکے رسولوں پر اور فرشتوں پر اور قیامت پر اور اچھی بری تقدیر پر۔ اس کے بعد سوال کیا اسلام کیا چیز ہے۔ فرمایا ان تشہدان لا الہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ ولاتشرک بہ شیئا وتقیم الصلوٰۃ وتعطی الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیہ سبیلا۔ یعنی تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ ایک ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، اور روزہ رکھو اور استطاعت ہو تو حج کرو۔

اس کے بعد سوال کیا کہ احسان کیا چیز ہے فرمایا تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھتے ہو، اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو وہ تم کو بہرحال دیکھ رہا ہے، احسان کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ کیا گیا ہے ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین دوسری آیت ھل جزاء الاحسان الا الاحسان، اس کی اور بھی آیتیں ہیں، آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک کہ احسان نام ہے اس چیز کا کہ خدا کی عبادت مکمل خضوع اور خشوع کے ساتھ انجام دو اور اس طرح عبادت کرو جس سے ظاہر ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو جیسے غلام آقا کو دیکھتا ہے تو نہایت توجہ سے کام کرتا ہے کوتاہی نہیں کرتا، ہر عبادت کی تکمیل اس طرح کرو جیسے تم اپنے آقا اور مالک کے دیکھنے کے وقت کرتے ہو اگر تم کہو کہ ہم اللہ کو نہیں دیکھ سکتے تو یہ خیال کرو کہ اللہ تعالی تمہیں دیکھ رہا ہے۔

غلام کام کی تکمیل اس واسطے کرتا ہے کہ آقا اس کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔

اسی احسان کے حاصل کرنے پر تمام تر تصوف کا مدار ہے آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضور کی مجلس میں ایمان کے ساتھ حاضر ہوتے ہی احسان حاصل ہوجاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت اتنی قوی تھی کہ جو حاضر ہوتا تھا اس کے قلب پر ایسا اثر پڑتا تھا کہ تمام چیزوں کو بھول جاتا تھا اور اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا تھا

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کئی روز حاضر نہ ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ اپنے آدمیوں کو یاد کرتے تھے جب وہ ایک دو وقت نہیں آئے تو فرمایا حنظلہ کیوں نہیں آئے، لوگوں کو کچھ معلوم نہ تھا حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں اور خبر لاتا ہوں، چنانچہ وہ ان کے گھر گئے گھر والوں سے پوچھا کہ حنظلہ کہاں گئے، ان کی بیوی نے کہا کہ گھر میں سر جھکائے گوشے میں بیٹھے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں اندر جاکر دیکھوں؟ اندر گئے تو دیکھا بیٹھے ہیں اور رو رہے ہیں، پوچھا آنحضرتؐ کی خدمت میں کیوں نہیں آئے، حضرت حنظلہؓ نے کہا: میں منافق ہوگیا ہوں، حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کیسے؟ انھوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کی مجلس میں ہوتا ہوں تو دنیا کی ساری باتیں فراموش ہوجاتی ہیں اور خدا سے تعلق رہتا ہے اور جب گھر آتا ہوں، بال بچوں میں لگ جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں رہتی، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میری بھی یہی حالت ہے، پھر یہ بھی بیٹھ کر رونے لگے اور پھر فرمایا کہ ہماری تمام مشکلات کو حل کرنے والے وہی آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کے پاس چلو رونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، یہ بات ان کے سمجھ میں آگئی چنانچہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہماری ایسی ایسی حالت ہوتی ہے آپ نے فرمایا اگر تم ہر وقت ایسے ہی رہو جیسے میرے سامنے رہتے ہو تو فرشتے تم سے مصافحہ کرنے لگیں مگر یہ حالت وقتاً فوقتاً ہی ہوسکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایسی ہے جیسی آفتاب اور صحابہ کے پاک وصاف دل گویا آئینے تھے جب بھی آفتاب نبوت کے سامنے پہونچتے تھے اور حالت ہوجاتی تھی اور جب الگ ہوتے اس میں فرق آجاتا تھا

مشاغل صوفیہ اور تزکیۂ نفس

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چار کام سپرد کئے گئے تھے، جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے یتلوا علیہم ایاتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتاب والحکمۃ

۱:- قرآن حکیم کی آیتیں سناتے تھے، اس کا ذکر قرآن میں چار پانچ جگہ ہے۔

۲:- اللہ تعالیٰ کا کلام سکھلاتے تھے۔

۳:- حکمت کی باتیں بتلاتے تھے۔

۴:- اور چوتھا کام یہ کہ دلوں کے میل کچیل دور کرتے تھے اور ان کو پاک وصاف کرتے تھے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی طاقت سے اہل ایمان کے دلوں کے میل کچیل دور ہوجاتے تھے، غیر اللہ کی محبت اور ہر قسم کی برائی دور ہوجاتی تھی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا یہ اثر تھا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آپ صلعم مدینہ منورہ میں داخل ہوتے تھے تو ہر چیز روشن معلوم ہوتی تھی، جب تک آپ رہے سب چیزیں روشن معلوم ہوتی رہیں وفات کے بعد جب ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر مٹی ڈالی تو وہ روشنی جاتی رہی، اور کہتے ہیں کہ ابھی ہم نے ہاتھوں سے مٹی نہیں جھاڑی تھی کہ خود ہمیں اپنے دل اوپر معلوم ہونے لگے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت کے آفتاب تھے صحابۂ کرام نے ان سے روشنی حاصل کی، اسی بنا پر اہل سنت والجماعت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو شخص اسلام کے ساتھ چند منٹ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں رہا ہو وہ بعد کے آنے والے بڑے سے بڑے متقی اور ولی سے بھی افضل و اعلیٰ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی طاقت بجلی سے بھی زیادہ طاقتور تھی، دل ودماغ روشن کرنے والی، اس لئے ریاضت کی زیادہ ضرورت نہ ہوتی تھی، ضرورت اس بات کی تھی کہ اخلاص کے ساتھ مجلس میں حاضری ہوجائے مگر جیسا کہ حضرت انس رض نے فرمایا آپ کی جدائی کے بعد وہ روشنی نہیں رہی، اسی طرح صحابۂ کرام کے زمانہ سے جتنا زمانہ دور ہوتا گیا روحانی اور قلبی صفائی میں کمی ہوتی گئی، جس طرح صاف برتن کے صاف کرنے کے لئے کسی

زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہوتی میل کچیل جلد دور ہوجاتا ہے اسطرح صحابہ کے صاف قلوب کو صاف کرنے کیلئے کسی خاص ریاضت کی ضرورت نہیں تھی مگر جیسے جیسے میل بڑھتا اور جمتا گیا ریاضت کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔

احسان صفائی قلب اور تصوف

بس اسی دل کی ہی صفائی حاصل کرنے کا نام احسان ہے اور یہی تصوف کا مقصد ہے، تصوف کا مقصد کوئی نئی چیز نہیں ہے، حدیث جبرئیل میں جو چیز مذکور ہے وہی سچ ہے مگر بُعد کی وجہ زمانے کی طبیعتوں میں میل زیادہ ہوگیا جس کی وجہ سے مانجھنے کی ضرورت زیادہ ہوگئی۔

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جو اصول تصوف میں ذکر کیئے گئے ہیں یعنی بارہ تسبیحیں ذکر جہری یا انفاس مراقبہ وغیرہ اس کا بھی کسی حدیث میں ذکر نہیں ہے انکا یہ اعتراض غلط ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جہاد کے لئے تلوار تیر وکمان نیزہ وغیرہ کا تذکرہ آتا ہے اور بندوق مشین گن گولہ بارود اور ہوائی جہاز کا کوئی تذکرہ نہیں آتا، آج اگر مسلمانوں کو شرعی جہاد کی ضرورت پڑے تو آپ یہ کہیں گے کہ جنگ تلوار سے کرنی چاہیئے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جنگ فقط تلوار، نیزہ، تیر وکمان سے کرتے تھے، ہرگز آپ ایسا نہیں کر سکتے اور اگر آج ایسا کریں گے تو دشمن آپ کو دور ہی سے فنا کردیگا مشین گن اور توپوں وغیرہ سے اگر دشمن حملہ کرے تو ہم کو بھی وہی چیز اختیار کرنی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم فرمایا ہے اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ الخ جو تم سے قوت ہوسکے دشمنوں سے مقابلہ کے واسطے تیار کرو

مقصود جہاد سے اعلائے کلمۃ اللہ ہے جس چیز سے بھی ہو اور جس چیز کی ضرورت پڑے اس کو استعمال کرو جس سے دشمن کو شکست دے سکو اس کو مہیا کرو اور مقابلہ کرو

اسی طرح جس زمانے میں آقائے نامدار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے تو اس زمانے میں تھوڑی ریاضت کی ضرورت پڑتی تھی اور اسی سے کام ہوجاتا تھا اور جتنے دن زیادہ گذرتے گئے ریاضتوں کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی، اسی وجہ سے چلہ بارہ تسبیح، ذکر جہری اور پاس انفاس وغیرہ قلب کی صفائی کے لئے متعین کئے گئے۔

آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن شریف میں زیر و زبر نہیں تھے، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دور خلافت میں کتابی شکل میں کرایا، حضرت عثمان نے ترتیب دیا مگر زیر و زبر تب بھی نہیں لگائے گئے، صحابۂ کرام کی زبان عربی تھی وہ بغیر زیر و زبر کے پڑھتے تھے جیسے ہم اردو زبان والے اردو کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاتے ہیں، آج کوئی بنگالی برمی یا انڈونیشیا والے سے کہا جائے کہ اردو کی صحیح عبارت پڑھو تو وہ نہیں پڑھ سکتا ہے، جس طرح ہم زیر و زبر کے نہ ہوتے ہوئے صحیح پڑھتے ہیں اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن جس میں نہ زیر نہ زبر نہ نقطہ کچھ بھی نہیں تھا صحابۂ کرام صحیح پڑھتے تھے مگر تھوڑے ہی زمانہ بعد اس کی ضرورت محسوس ہوئی، عجمیوں کی غلط ملط کی وجہ سے لوگ زیر و زبر کے محتاج ہوگئے، پس یہ اعتراض کہ قرآن میں زیر و زبر نہیں لگانا چاہئے کیونکہ یہ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں پائے گئے تو کیا یہ اعتراض کوئی وزن رکھتا ہے، بیشک اس زمانے میں لوگ بغیر زیر و زبر کے تلاوت کر لیتے تھے مگر آج مکہ اور مدینہ والے جن کی زبان عربی ہے وہ بھی بغیر زیر و زبر اور نقطہ کے نہیں پڑھ سکتے، جس طرح ہم محتاج ہیں صرف و نحو کے اسی طرح عرب والے بھی محتاج ہیں اور وہ بھی بغیر زیر و زبر و نقطہ کے نہیں پڑھ سکتے ہیں۔

تو زمانہ کے بدلنے کی وجہ سے احوال بدلتے رہتے ہیں، لیکن وہ احوال جو مقصود کو بدلنے والے نہ ہوں ان کو سنت ہی کہا جائے گا، مثلاً کسی شخص نے روٹی پکانے والے کو متعین کیا تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ لکڑی چولہا، توا سب چیزیں مہیا کریں، لکڑی نہ ملے، کوئلہ نہ ملے تو اوپلہ کو ہی استعمال کیا جائے، غرض جس چیز پر روٹی پکانا موقوف ہوا اسی کو طلب کیا جائے۔

مختصر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں احسان حاصل کرنے کیلئے ریاضت کی ضرورت نہیں تھی مگر آج ہمارے مرشدوں نے بتلایا کہ اس طرح سے ذکر کرو اگر کوئی کہے کہ یہ بدعت ہے تو سراسر غلطی ہے۔

ذکر کی تاکید

خدا نے کئی جگہ ذکر کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد ہے واذکروا اللہ قیاما وقعودا، کھڑے اور بیٹھے کی کوئی قید نہیں ہے، اسی طرح لفظ کی کوئی قید نہیں ہے، اسی طرح لفظ اللہ، سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ ضرب کے ساتھ ہو یا بلا ضرب

کے ارشاد خداوندی کے تحت سب داخل ہے، دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے۔
یا ایھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیرا۔ تیسرا ارشاد فاذکرونی اذکرکم، تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا کوئی قید نہیں ہے کہ کس طرح سے ذکر کیا جائے، مطلقاً ذکر کا حکم ہے، ہمارے بڑے تجربہ کار لوگوں نے کہا ہے کہ ذکر سری سانس کے ساتھ اور ذکر خفی روح کے ساتھ کرو، بہرحال ذکر کوئی بدعت نہیں ہے، جیسے حکم دیا تھا جہاد کرنے کا، یہ دشمن کی طاقت کو کمزور کرنے کیلئے جہاد کرو چاہے تلوار سے چاہے تیر سے چاہے توپ یا مشین گنوں سے جس طرح تم انجام دے سکو اور دشمن کو شکست دے سکو،

جیسے قرآن کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے تو زبر زیر لگانا اور عکسی قرآن چھپانا اسی کے حکم میں ہے، تم کو حج کا حکم دیا گیا ہے تو پہلے اونٹوں سے سفر کرتے تھے تو اس کی ضرورت ہوتی تھی اور آج جہازوں اور لاریوں سے سفر کرنا پڑتا ہے، اگر کوئی بیوقوف کہے کہ یہ بدعت ہے میں تو ہندوستان سے اونٹ پر سفر کروں گا تو کیا آپ سفر کرسکتے ہیں، اسی طرح سے جدہ پہونچنے کے بعد لاریوں سے سفر ہوتا ہے، تو مقصود بیت اللہ کی حاضری ہے جس طرح سے ہو اس کو انجام دیا جائے، مقصد میں کوئی فرق نہیں آیا، زمانے کی ضرورت کی حیثیت سے فرق پڑ گیا ہے۔

تو میرے بزرگو آج یہ کہنا کہ تصوف اور سلوک میں جو باتیں ہیں بدعت ہیں یہ غلط ہے اور وہ مامور بہ ہیں ان پر عمل کرنا ہوگا، کیونکہ اصل مقصد تصوف میں احسان ہے اس کے حاصل کرنے کے جو طریقے خلافِ شریعت نہیں ہیں، وہ سب ضروری ہیں، البتہ اگر کوئی شخص کہے کہ مجھکو خدا تک پہونچنے کے لئے قوال ڈھول اور گانے والے کی ضرورت ہے تو یہ خلاف شریعت ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ان چیزوں کی ممانعت کی ہے، تو جن چیزوں سے ممانعت کی گئی وہ سنت میں داخل نہیں ہیں۔

بیعت کے فوائد

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ بیعت کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے یہ شبہ غلط ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا وہ بنی

کتاب صراط مستقیم میں بیعت کے فائدے بتلاتے ہیں کہ جب کوئی شخص برگزیدہ بندے کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے تو اس کی قبولیت کی وجہ سے خدا کی رحمت اس کی کفالت کرتی ہے اور اس کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ سے اس کی معصیت سے حفاظت کی جاتی ہے اگر اس کا مرشد بڑی عزت والا ہے تو اس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ تیرا فلاں مرید فلاں خرابی میں مبتلا ہو رہا ہے اس کو نکالا جائے تو مرشد اس کو مناسب تدبیر سے اس خرابی سے نکالتا ہے، کبھی خود خداوند کریم ہی اس مرید کو خرابی سے بچاتا ہے، کبھی فرشتے کو حکم دیا جاتا ہے یا اور کسی ذریعہ سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے مثلاً مرشد کی صورت میں آکر فرشتہ اسے بچاتا ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ زلیخا کے ساتھ مشہور ہے کہ اس نے سات کوٹھڑیوں میں بند کرکے وصال چاہا اور ان پر جبر کیا، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا، معاذ اللہ میں اپنے مالک کی نافرمانی کروں اس کی بیوی پر ہاتھ ڈالوں اس نے مجھ پر بڑے بڑے احسانات کئے ہیں میں ظالم نہیں ہوسکتا ہوں، اس نے بہت مجبور کیا پھسلایا اور پیچھا کیا اور قریب تھا کہ برائی میں مبتلا ہوجائیں، چنانچہ فرمایا گیا ہے ولقد همت به وهم بها لولا ان رای برهان ربه الخ تو اللہ تعالیٰ نے حفاظت کے واسطے حضرت جبرئیلؑ کو مقرر کیا وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت میں آئے، وہ سامنے کھڑے ہوکر انگلی منھ میں دبائے ہوئے تھے اور اشارے سے کہہ رہے تھے کہ خبردار اس میں مبتلا نہ ہونا، حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اسکی خبر بھی نہ ہوئی اور اللہ نے ان کو بچالیا

حضرت سید شہیدؒ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کامل کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا کسی گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے کسی روحانی ذریعہ سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے، بیعت کے بہت زیادہ فوائد ہیں، قرآن شریف میں ہے ۔ کونوا مع الصادقین آپ دیکھتے ہیں کوئی کسی پارٹی میں داخل ہوتا ہے تو اس پارٹی کے نام بڑوں سے اسکے تعلقات ہوجاتے ہیں، اور وہ بڑے لوگ اس کا خیال رکھتے ہیں وآخرت والے جو خدا کے سچے بندے ہیں تو ان میں یہ بات کیوں کر نہ ہوگی ان میں تعلقات کی ت بہت اونچی ہوتی ہے، اگر تم اللہ کے کسی مقبول بندے کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تو جات

کے تمام بڑوں سے خواہ دنیا میں ہوں یا آخرت میں سب سے تعلق ہوجاتا ہے اور وہ لوگ دعا کرتے ہیں اپنی ہمت سے خبرگیری کرتے ہیں۔

شریعت وطریقت

میرے بھائیو! نہ بیعت بدعت ہے اور نہ طریقت بدعت ہے اور نہ طریقت شریعت سے جدا ہے، طریقت شریعت کی خادم اور اس کی تکمیل کرنے والی ہے، یہ بڑے بڑے لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ بہاء الدین، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ۔ ان بزرگوں نے طریقے جاری کئے ان طریقوں میں کوئی ذرہ برابر شریعت کے خلاف نہیں ہے ان طریقوں سے مقصود قربت اور آخرت کا حاصل کرنا ہے۔

نام کے پیر

مگر جیسے ہر جماعت میں کھرے کھوٹے ہوتے ہیں، اس جماعت میں بھی کچھ ایسے لوگ داخل ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے خرابی پیدا ہو رہی ہے، دین کو جال بنا کر دنیا حاصل کرنے والے ہر جماعت میں اور ہر زمانے میں ہوتے آئے ہیں اس لئے بیعت ہونے کے وقت مرشد کا انتخاب سوچ سمجھ کر کھرا کھوٹا دیکھ کر کرنا چاہئے، حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ہے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　پس بہر دستے نہ باید داد دست

بہت سے شیطان آدم کے بھیس میں آتے ہیں اس لئے ہر ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہئے۔

تم کو سوچنا اور سمجھنا چاہئے کہ جب تمہارا کچہری میں مقدمہ ہوتا ہے تو ہر وکیل کو وکیل نہیں بناتے، اور جب کبھی تم بیمار ہوتے ہو تو ہر ڈاکٹر کو معالج نہیں بناتے اور نہ ہر حکیم کے پاس جاتے ہو بلکہ سوچتے ہو کہ اچھے سے اچھا ڈاکٹر اور اچھے سے اچھا وکیل حاصل کریں، جب دنیا میں یہ معاملہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کے واسطے ہر کس و ناکس کے ہاتھ پر کیسے بیعت کرنا صحیح ہوگا۔

عورتوں سے بیعت لینے کی صورت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مردوں کی بیعت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کرتے تھے، اور اگر مجمع بڑا ہوتا تو کپڑا پکڑا کر بیعت لیتے تھے، مگر عورتوں کی بیعت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں لی، حضرت

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، بخاری میں یہ روایت کئی جگہ ہے کہ وَاللہ مَامَسَّت یدُ رسول اللہ یدَ النساء اذا یبایعھن خدا کی قسم حضورؐ کے ہاتھ نے کسی عورت کا ہاتھ کبھی نہیں چھوا۔ بیعت کے وقت پردہ کرکے باہر سے بیعت کرتے تھے زبان سے یا کپڑے سے حضورؐ سے بڑھ کر متقی، پرہیزگار کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے، لیکن حضورؐ تو کسی اجنبی عورت کو سامنے نہ کرتے تھے اور نہ ہاتھ سے ہاتھ ملاکر بیعت کرتے تھے مگر آج یہ گمراہ اور شیطان کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے آؤ، تم پردہ اٹھاؤ، ہم تم کو محشر میں کیسے پہچانیں گے جب تک تمھارا چہرہ نہ دیکھیں گے تم تو ہماری بیٹیاں ہو، تم تو پوتیاں، نواسیاں ہو یہ تمام شیطانی کارروائیاں ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کے آقا تھے، سب عورتیں آپ کی بیٹیاں تھیں اور ازواج مطہرات کے بارے میں فرمایا گیا ہے ازواجہ امہاتھم جس کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی تمام بیویاں کل مومنین کی مائیں تھیں تو ہم آپ کی اولاد کے درجے میں ہوئے، مگر اس کے باوجود حضورؐ تو بے پردہ سامنے نہیں آتے، ہاتھ سے ہاتھ نہیں لاتے لیکن آج ایسے غلط کار لوگ (پیدا ہوگئے) ہیں جو پردہ مٹواتے ہیں، بدن دبواتے ہیں اور تنہائی میں جمع ہوتے ہیں، یہ سب غلط ناجائز اور حرام ہے، جو یہ کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے پیر نہیں ہے بلکہ گمراہ شیطان ہے اس سے بچنا چاہیے، ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق او کما قال اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کسی مخلوق کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک سریہ کا سردار بنایا اور حکم دیا کہ اس کی تابعداری کرو، سب راستے میں جارہے تھے کہ ایک جگہ پہونچ کر ایک شخص نے سردار سے کچھ مذاق سے کہا، اس پر ان کو غصہ آگیا انھوں نے حکم دیا کہ لکڑیاں جمع کرو، پھر حکم دیا کہ ان میں آگ لگاؤ، پھر کہا اس میں کود و کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ تم میری تابعداری کرنا، بعض لوگوں نے کہا کہ ہاں حضورؐ نے حکم دیا ہے اور انھوں نے کودنے کا ارادہ کیا، اور بعض لوگوں نے کہا کہ ہم نے آگ سے ہی بچنے کے لئے حضورؐ کی تابعداری

کی ہے، ہم اپنے آپ کو آگ کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں، چنانچہ یہ لوگ کودنے سے جھجکے، اور دوسروں کو بھی منع کیا، اس سلسلہ میں اختلاف ہوتا رہا تا آنکہ آگ بجھ گئی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، اور سردار کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوگیا، جب واپس ہوئے اور حضورؐ کی خدمت میں اس معاملہ کا ذکر کیا تو آپ بہت خفا ہوئے، آپ نے دونوں کو ڈانٹا، سردار کو بھی، اور ان لوگوں کو بھی جنھوں نے کودنے کا ارادہ کیا تھا، پس معلوم ہوا کہ خلاف شریعت کسی کی تابعداری جائز نہیں، اگر کوئی مرشد کہے کہ بت کو سجدہ کرو تو ہرگز اس کی تابعداری نہیں کرنی چاہیئے اور نہ مرشد کو ایسی بات کہنی چاہیئے اگر وہ کرتا ہے تو پیر نہیں شیطان ہے۔ بعض بے وقوف کہتے ہیں ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

اور اس کے غلط معنی بیان کرتے ہیں، اگر مرشد شریعت کے خلاف کرتا ہے تو اس کی تابعداری ہرگز نہیں کرنی چاہیئے،

بہرحال بیعت کرنا امر شرعی ہے اور سلوک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری اور خدا کی خوشنودی ہی کا نام ہے، جو کچھ کمال ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری میں ہے، آپ سے محبت کرنا آپ کی حکم کی ہوئی باتوں پر چلنا اسی میں نجات ہے، اسی میں کمالِ اطاعت ہے۔

بقیہ ص ۱۶۱ : احسان وسلوک میں حضرت مدنی قدس سرہٗ کا مقام رفیع

دوستاں تضیع عمرت می کنند ٭ نخل عمرت را با فسوں می کنند

یہ جلسے بازیاں اور اٹکھیلیاں آج اچھی معلوم ہو رہی ہیں مگر موت کے قریب اور بعد ان پر لعنت ہزار لعنت بھیجنی ہوگی، ان میں جہاں تک ہو سکے کمی کیجئے لاتلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ پر غور کیجئے المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا والباقیات الصّٰلحٰت کو پس پشت نہ ڈالئے یہ جوانی کی عمر اور صحت عظیم الشان نعمت ہے اس کو ضائع ہونے سے بچائیے۔ (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۱۴۲)

"اللہ بس باقی ہوس"

حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کا مقام رفیع

لکل فن رجال یہ ایک مقولہ یا محاورہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی فن کے کسی مسئلہ پر غور و فکر، بحث و تبصرہ وہی کرسکتا ہے جس کو اس فن سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہو پھر وہ فن جو کہ اصطلاحی فنون کی طرح کسبی نہیں بلکہ ایک اعتبار سے وہبی ہو اور فن کے ماہر و محقق کے بارہ میں خامہ فرسائی وہ کرے جو اس کی ابجد سے بھی ناواقف ہے اگر یہ المیہ نہیں تو اعجوبہ ضرور سمجھا جائے گا، لیکن بعض دفعہ عشق و محبت، عقیدت و ارادت کچھ ایسی باتیں بھی کہلوا دیتی ہے جو اگرچہ غیر مناسب ہوتی ہیں مگر محبوب کی نظر میں وہ دیوانہ فرزانہ سمجھا جاتا ہے جیسا کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کرنے والے گناہ گار کی توبہ کی مثال میں اس صحرا نورد مسافر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ عالم اسباب سے مایوس ہونے والے کو جب گمشدہ متاع عزیز مل جائے اور وہ اللّٰھم انت ربی وانا عبدک کی بجائے اَنَا ربک وانت عبدی کہہ ڈالے تو وہ مجرم نہیں بلکہ مقرب بارگاہ صمدی ہو جاتا ہے یہی کیفیت اس خاکروب دربار مدنی کی ہے کہ حضرت مدنی کے احسان و سلوک پر کچھ نہ لکھنے کی اہلیت کے باوجود الٹی سیدھی چند باتیں تحریر میں لانے کی سعادت اسی امید قبولیت پہ پیش کر رہا ہے۔ واللہ الموفق

زاھد الحسینی غفرلہ

از بستر علالت جمادی الاول ۱۴۱۳ھ

پاکستان

دنیا میں یہ عام طریقہ رائج ہے کہ کسی قابلِ قدر شخصیت کے تعارف میں اس کی ایک خاص معروف وصف کی بنا پر اسے سمجھا جاتا ہے، خواہ اس ذات بابرکات میں کئی اوصاف حمیدہ موجود ہوں جیسا کہ محدث کبیر عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو ایک محدث کی حیثیت سے دنیا جانتی ہے مگر ان کی مجاہدانہ حیثیت سے اکثر لوگ بے خبر اور ناواقف ہیں، حالانکہ وہ اپنے دور کے مجاہد جلیل تھے، ان کی محدثانہ، متصوفانہ حیثیت مُسَلَّم، مگر ان کا ممتاز وصف جہاد فی سبیل اللہ تھا، جیسا کہ وہ اپنے دور کے ممتاز سالک عاکف الحرمین فضیل بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرماتے ہیں

یَا عَابِدَ الْحَرَمَیْنِ لَوْ اَبْصَرْتَنَا لَعَلِمْتَ اَنَّكَ فِی الْعِبَادَةِ تَلْعَبُ

من کان یخضب خدّہٗ بدموعہ فنحورنا بدمائنا تتخضب

یہ ایک طویل منظوم خط کے دو اشعار ہیں جن سے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی وہ حیثیت آشکارا ہوتی ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں۔

اسی طرح مشہور فلسفی ابن رشد اندلسی کو ایک فلسفی کی حیثیت سے دنیا جانتی ہے مگر ان کی فقیہانہ حیثیت سے دنیا ناواقف ہے، ان کی تالیف بدایۃ المجتہد دیکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح ائمہ اربعہ کے مدونہ فقہ کے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس پر عمیق نظر رکھتے تھے، اور ابن رشد ہی علم حدیث میں اپنے دور میں ایسے فائق تھے کہ موطا امام مالک کے حافظ تھے۔

یہی حال قطب الارشاد والتکوین حضرت مدنی قدس سرہٗ کا ہے، دنیا میں آپ دارالعلوم جیسے عظیم علمی ادارہ کے شیخ الحدیث اور علماء ہند کی عظیم تنظیم جمعیۃ العلماء ہند کے صدر اور اپنے دور کے مجاہد جلیل کے طور پر ممتاز بلکہ منفرد حیثیت کے مالک تھے، لیکن ان تمام اوصافِ کمال سے رفیع آپ کا وہ مقام تھا جو آپ کو احسان وسلوک میں حاصل تھا جیسا کہ دور حاضر کے امام الاولیاء مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہٗ نے خلوت اور جلوت میں کئی بار فرمایا تھا۔

"کہ میں نے اپنی سابقہ زندگی میں چودہ بار حرمین کی زیارت کی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ بصیرت عطا فرمائی ہے کہ امت کے اولیاء کرام کو پہچان سکتا ہوں، میں نے

چودہ بار حرم کعبہ میں موجود اولیاء کرام کو دیکھا مگر میں نے حضرت مدنی کے ہم پلہ کسی کو نہ پایا، اور ساتھ میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں: شاگرد ہوں نہ مرید ہوں ۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رح نے حضرت حاجی امداد اللہ رح سے نقل فرمایا ہے کہ،

حرم کعبہ شریفہ میں اکثر اوقات ۳۶۰ اولیاء کرام موجود رہتے ہیں۔

حضرت لاہوری رح اگرچہ حضرت مدنی کے نہ تو شاگرد تھے نہ مرید تھے مگر سیاسیات میں آپ کے پیرو کار تھے، لیکن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے برادر بزرگ اور مفتی عتیق الرحمٰن کے عم محترم مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہم جو سیاسی نظریات میں حضرت مدنی کے خلاف تھے مگر حضرت مدنی کے احترام میں ان کا یہ حال تھا کہ بجائے ولایتی کپڑے کے دیسی کھدر کا لباس زیب تن فرمایا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ،

"میں محض مولانا کی تکلیف کے خیال سے کھدر پہنتا ہوں ورنہ میں اس کو ضروری نہیں سمجھتا، مولانا حسین احمد کا دل جتنا روشن ہے آج کسی کا نہیں، تم یا کوئی اور کیا جان سکتا ہے کہ مولانا حسین احمد کیا ہیں اور ان کا کیا مقام ہے۔

(ماہنامہ برہان دہلی بابت اگست ۱۹۶۱ء ص ۶۷)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کا اصلی مقام تو سلوک واحسان میں ممتاز حیثیت کا مقام تھا دوسرے مشاغل ایسے مقام پر فائز ہونے والے عظیم المرتبہ انسان کے لائحہ عمل میں داخل ہوتے ہیں جیساکہ اسی برصغیر میں شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہٗ کا اصلی مقام وسلوک واحسان کی اشاعت اور ترویج تھی، جس کا مرکز آپ کی خانقاہ مجددیہ نقشبندیہ تھی مگر اس وقت کے دین اکبری اور دین الٰہی کا قلع قمع بھی آپ کے فرائض میں تھا، جس کے لئے گوالیار جیسے وحشتناک قلعے میں اسارت کو بطیب خاطر قبول فرمایا۔ دور حاضر کے عظیم صاحب علم اور صاحب قلم حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی زید مجدہم نے قوم سے یہی شکوہ فرمایا ہے کہ۔

ہماری آپ کی بدقسمتی ہے کہ ہم نے جانا نہیں کہ وہ (حضرت مدنی) کیسے باطنی مراتب پر فائز تھے اس کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جو اس کوچہ سے واقف ہوں اور جو اس کا احساس رکھتے ہوں، وقت کے عارفین واہل نظر کی زبان سے میں

نے ان کے لئے بڑے بلند کلمات سنے ہیں، اور ان سب کو ان کی عظمت و بلندی کا معترف اور ان کی مدح و توصیف میں رطب اللسان پایا ہے، مولانا اپنے زمانہ میں ڈاکٹر اقبال کے ان اشعار کا نمونہ و مصداق تھے

ستر دین ما را خبر او درا نظر　　او درون خانہ ما بیرون زدر
ما کلیسا دوست ما مسجد فروش　　او ز دست مصطفےٰ پیمانہ نوش
ما ہمہ عبد فرنگ او عبدہٗ　　او نگنجد در جہان رنگ و بو

ڈاکٹر صاحب نے کبھی کہا تھا سہ

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل　　یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

مولانا کا عمل پہلے مسلک پر تھا یہ واقعہ ہے کہ وسعت افلاک میں مولانا کی زندگی تکبیر مسلسل تھی (ایک سیاسی مطالعہ ص ۳۲)

حضرت مدنی رح کے اصلی مقام کو علامہ ابوالحسن علی ندوی نے بالفاظ دگر یوں ارقام فرمایا ہے:

"جو چیز خاص طور پر محسوس کی وہ دن میں ان کی شگفتگی مستعدی و بیداری ہر ایک کی طرف توجہ و التفات، اور شب کو معمولات کی پابندی، ان آنکھوں نے متضاد مناظر بھی دیکھے، بعض مقامی تحریکوں میں ارادت و عقیدت کا جوش بھی دیکھا ان کی نیاز مندی و اظہار جاں نثاری بھی دیکھا، پھر انھیں آنکھوں نے زود رنج و طوطا چشم عوام کو سخت برہم اور مغلوب الغضب بھی دیکھا اور ان کے ذمہ داروں کو تند و تلخ رُو در رُو کہتے بھی سنا۔

لیکن مولانا کی حالت یکساں پائی، بعض سیاسی تحریکوں کے زمانہ میں بھی مشاہیر کو نیاز مندانہ حاضر ہوتے اور سفارشی خطوط لکھواتے بھی دیکھا، پھر ان کی تلخ نوائیاں اور احسان فراموشیاں بھی دیکھیں، اس کو تنقیدی ذہن کہیے یا حقیقت بینی، کہ طبیعت نے محسوس کیا کہ آنے والوں اور بیٹھنے والوں میں مولانا کے اصل ذوق اور اصل فن سے استفادہ کرنے والے بہت کم نظر آئے۔

زیادہ وقت اشخاص یا جماعتوں کے تذکرے یا سطحی تبصرے یا تعویذ و دعا کی

فرماتےاس میں گذرتا مولانا اپنی فطری عالی ظرفی سے کسی کو گرانی یا ناگواری کا احساس نہ ہونے دیتے مگر۔

جہاں کوئی تصوف و سلوک کا مسئلہ پوچھ لیتا یا کوئی علمی بحث چھیڑ دیتا یا اہل اللہ کا تذکرہ کرنے لگتا، فوراً چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ دل کا ساز کسی نے چھیڑ دیا۔" (ماہنامہ الارشاد مدنی نمبر بحوالہ پرانے چراغ)

رتب مکتوبات شیخ الاسلام مولانا نجم الدین اصلاحی نے ارشاد فرمایا کہ:

"حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کے بارے میں بہتوں کو یہ فیصلہ کرنے میں مشکل آئی کہ وہ کون سے مرکزی صفات تھے جو آپ کی زندگی میں سب سے نمایاں اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں، چنانچہ کسی نے بہت بڑا مفسر اور محدث جانا، کسی نے ایک عالم اور شیخ طریقت سمجھا، کسی نے سیاسی راہنما اور مجاہد قرار دیا، اس میں شبہ نہیں کہ مولانا رہ میں وہ سارے کمالات تھے جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے، لیکن مولانا مدنی" میں ان تمام باتوں سے زیادہ آپ کا وہ روحانی مقام تھا جس سے عام طور پر دنیا ناواقف تھی اور ناواقف رہ گئی، اس کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ لوگوں نے تزکیہ نفس اور تطہیر قلوب کو ایک ثانوی چیز سمجھا اور صرف تعلیم کتاب وحکمت ہی کے اندر ساری تگ ودو محصور کردی حالانکہ تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود محسوس ہوتی ہے اور دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم سے بھی نہیں پیدا ہوتا، بلکہ یہ دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا۔" (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۴۴)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے بارہ میں طالبین اور سالکین کی راہ نمائی کے لئے اکابر اولیاء اللہ نے راہ نمائی فرمائی جس میں بطور اختصار ایک واقعہ درج ذیل ہے۔

ایک مولانا صاحب کو کچھ اشکال درپیش تھے تو انھوں نے خواب میں حضرت شاہ اہل اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی اور اپنی حالت کا تذکرہ کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا، ہمارے حسین احمد کو لکھو۔" (مکتوبات ج ۳ ص ۱۵۱)

(ف) حضرت شاہ اہل اللہ شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے بھائی تھے، رحمۃ اللہ علیہم

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے سید عالی نسب ہونے کی نسبت سے سلوک اور احسان ان کا خاندانی ورثہ ہی کہا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مناصب رسالت میں سے تمام مناصب میں حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، تلاوت کتاب اللہ، تعلیم کتاب اللہ اور تزکیۂ باطن، ان تمام امور میں آپ بفضلہ تعالیٰ اپنے زمانہ کے فرد وحید تھے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ کے آبا و اجداد رحمۃ اللہ علیہم ان مناصب سے عموماً اور تزکیۂ باطن سے خصوصاً سرفراز تھے، درمیانی کچھ حصہ فترت کا چھوڑ کر نسلاً بعد نسلٍ سارا خاندان خانقاہی نظام میں نہ صرف منسلک تھا بلکہ اپنے علاقہ میں مسند نشینی سے مشرف تھا، جیسا کہ حضرتؒ نے فرمایا۔

"خاندان کے افراد اہل معرفت و طریقت تھے، صرف اخیر دو تین پشتیں دنیادار زمین داروں کی ہو گئی تھیں، نیز یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ شاہان دہلی سے خاندان کو چوبیس گاؤں دیئے گئے تھے، شاہ مدن رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شاہ نور اشرف مرحوم نے سجادہ اور طریقت کو سنبھالا، اور دوسرے بیٹے تراب علی مرحوم نے جائیداد کا انتظام سنبھالا، اس طرح خاندان میں دو پٹیاں قائم ہو گئیں۔"

(نقش حیات جلد ا ص ۸۵)

اگرچہ شاہ نور اشرف مرحوم نے خانقاہ کو قائم رکھا اور لوگ ادھر رجوع کرتے رہے مگر کچھ مدت بعد وہ خانقاہ صرف رسمی خانقاہ رہ گئی، بعد کے سجادہ نشین حضرات نے نہ تو خود مجاہدات و ریاضت کی طرف توجہ دی اور نہ ہی طالبان سلوک کی روحانی تربیت پر توجہ دی، بلکہ صرف پدری نسبت ہی کو کافی سمجھا، اگرچہ اس وقت تک خاندان کا کوئی فرد کسی دوسرے خاندان طریقت سلسلۂ بیعت میں منسلک نہ ہوا تھا مگر اب حالت ایسی ہو گئی کہ طالبان سلوک و احسان کسی دوسری خانقاہ کی طرف رجوع کریں، چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت مدنیؒ کے والد ماجد سید حبیب اللہ نور اللہ مرقدہما نے قدم اٹھایا اور اپنے زمانہ کے ولیٔ کامل حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل کیا، اس گناہ گار کے خیال میں مولانا حبیب اللہ صاحبؒ کا یہ بیعت فرمانا بھی گنگوہ شریف کی نسبت کی ابتداء تھی جہاں سے آپ کے تینوں صاحبزادوں کو روحانی آب حیات سے سیراب ہونا تھا۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا ہے کہ

• ہماری اس صدی کے آغاز میں اگرچہ انگریزوں کے دم قدم سے مادیت کے اس ملک میں قدم جم گئے ___ اور اہل دل برملا درد سے کہہ رہے تھے

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

پھر بھی عشق الٰہی کی کہیں کہیں دکانیں قائم تھیں جہاں سے جذبہ وشوق اور درد و محبت کا سودا ملتا تھا، ان دکانوں میں دو دکانیں خاص طور پر مرجع خاص و عام تھیں ایک گنگوہ میں اور ایک گنج مراد آباد میں، دونوں نے اپنی اپنی جگہ درد و محبت اور اتباع سنت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور اس جنس نایاب کو وقف عام کر دیا تھا ،

(تذکرہ مولانا فضل الرحمٰن از علامہ ندوی ص ۱۰)

چنانچہ حضرت مدنیؒ کے والد ماجد نے حضرت گنج مراد آبادی سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت فرمائی اور حضرت کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق نے اپنے والد ماجد کی اجازت سے حضرت گنگوہی سے شرف بیعت حاصل کیا، اور جب حضرت کے والد ماجد نے ہجرت مدینہ منورہ کا ارادہ فرمایا تو حضرت شیخ الہندؒ کے مشورہ سے بلکہ حکم سے حضرت گنگوہی سے بیعت ہو گئے، جب کہ آپ کے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب اس سے پہلے بیعت ہو چکے تھے، اگرچہ حضرت مدنی کا قلبی میلان حضرت شیخ الہندؒ کی طرف تھا، مگر حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا محمد صدیق سے فرمایا ،

• ان دونوں مولانا سید احمد (بانی مدرسہ علوم شرعیہ) اور (حضرت مولانا) حسین احمد کو حضرت گنگوہی سے بیعت کرادو، خدا جانے یہاں سے جانے کے بعد کس کے پلے پڑ جائیں کہیں کسی بدعتی سے وابستہ نہ ہو جائیں　　(نقش حیات ص ۸۰)

چنانچہ حضرت مدنی اور حضرت مولانا سید احمد صاحب نور اللہ مرقدہما گنگوہ حاضر ہوئے اگرچہ حضرت گنگوہیؒ بیعت فرمانے میں بہت زیادہ ردو قدح فرمایا کرتے تھے مگر ان دونوں کو بیعت فرمالیا اور پھر یہ فرمایا۔

"میں نے تو بیعت کرلیا اب تم مکہ معظمہ جا رہے ہو وہاں حضرت قطب عالم حاجی امداد اللہ موجود ہیں ان سے عرض کرنا وہ ذکر تلقین فرمادیں گے (نقش حیات ص ۸۸)

(ف) حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز کا تعارف حضرت گنگوہی نے یوں فرمایا:

"اس عاجز کو جو معلوم کرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ کے قطب الارشاد تھے، آپ کا لقب عالم بالا میں مخدوم العالم ہے، آپ ولایت النبوۃ و مقام محمدی میں نہایت راسخ القدم ہیں (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۳)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب سے شرف ملاقات کا ذکر یوں فرمایا:۔

"اواخر ذی قعدہ ۱۳۱۶ھ میں حاضری مکہ مکرمہ نصیب ہوئی، موصوف اس وقت بہت ضعیف ہو گئے تھے، حضرت گنگوہی رہ کا سلام و پیام سن کر بہت خوش ہوئے اور دیر تک نہایت محبت سے تذکرہ فرماتے رہے اور فرمایا تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر زندگی میں ملاقات ہو جاتی۔" (نقش حیات ص ۸۹)

حضرت گنگوہی کا ارشاد سنکر حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ ہمانے:

"پاس انفاس کی تلقین فرمائی اور فرمایا کہ روز صبح کو یہاں آ کر بیٹھا کرو اور اس ذکر کو کرتے رہو۔" نقش حیات ص ۸۹)

اگرچہ حضرت مدنی رہ کی اس بیعت اور روحانی تعلق میں روحانی سلسلہ کا ذکر نہیں مگر آپ نے ایک مکتوب گرامی میں فرمایا:۔

نیز میرے مرشد و آقا حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہیں انھوں نے اگرچہ مجھکو چاروں طریقوں میں بیعت فرمایا تھا، جن میں سے طریقہ نقشبندیہ مجددیہ بھی ہے مگر اصلی طریقہ اور عام تعلیم حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی چشتیہ صابریہ تھی۔"

(مکتوبات جلد ا ص ۳۹۶، ج ۳ ص ۶۱، ۶۲)

اور یہی بات حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے متعلق ارباب طریقت میں مشہور ہے جیسا کہ انوار العاشقین میں درج ہے کہ۔

"متاخرین سلسلہ چشتیہ صابریہ میں باوجود قیام مکہ معظمہ کے وہاں حاضر ہو کر شہرت کا ہونا نادر ہے، مگر حضرت ممدوح کے برابر مشائخ میں کسی کو اس درجہ شہرت نہیں ہوئی۔" (ص ۸۰)

قطب الارشاد حضرت گنگوہی رح کے منظومہ شجرہ طریقت میں پہلا شعر یہ ہے۔

یاالٰہی کن مناجاتم بفضل خود قبول ؛ از طفیل اولیائے خاندان صابری

چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز کی برکت سے طریقہ صابری حجاز سے نکل کر دوسرے اسلامی ممالک میں پھیلا، پنجاب کے مشہور پیر طریقت حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی قدس سرہٗ العزیز کو آپ نے طریقہ صابریہ میں خلافت سے نوازا تھا۔

حضرت مدنی رح کے اس روحانی سفر کی سرگذشت حضرت ہی کے قلم سے درج ذیل ہے

: چنانچہ حرم محترم (مسجد نبوی) میں بیٹھ کر پاس انفاس کیا کرتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں حضرت قطب عالم گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز سے محبت اور تعلق قلب میں بڑھنا شروع ہوا اور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح بعض درخت جلد جلد بڑھتے ہوئے دکھلائے دیتے ہیں اسی طرح حضرت گنگوہی کی محبت بڑھ رہی ہے

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلسلہ چشتیہ قدس اللہ اسرارہم کی نسبت کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور گریہ کی حالت طاری ہونی شروع ہوگئی، اس اثنا میں رویائے صالحہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت با سعادت خواب میں بکثرت ہونے لگی، نیز ذکر کی وجہ سے جسم میں بے اختیاری حرکات بھی ہونے لگی، مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوۃ میں چونکہ مجمع لوگوں کا ہر وقت رہتا ہے اس لئے ایسا وقت مقرر کیا جس میں کم سے کم مجمع رہے، وہ وقت آفتاب نکلنے کے ایک گھنٹہ بعد کا تھا ــــ مگر جب آثار ذکر جسم پر زیادہ ظاہر ہونے لگے تو لوگوں سے شرم کی وجہ سے شہر کے باہر جنگل میں جانے لگا، مسجد شریف کی مشرقی جانب جدھر بقیع شریف ہے آبادی نہیں ہے ادھر نکل جاتا تھا (آج سے تقریباً سو سال پہلے) اور کبھی مسجد الاجابۃ میں، یہاں پر بعض ادعیہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقبول ہوئی ہیں، اور کبھی اس کے قریب کھجوروں کے جھنڈوں میں تنہا بیٹھ کر ذکر کرتا رہتا تھا

اسی حالت پر ایک مدت گذری جو حالتیں یا رویا صالحہ پیش آتیں تھیں ان کو قلم بند کرکے گنگوہ شریف بھیجا کرتا تھا۔

ایک روز مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بانتظار جماعت بوقت ظہر یا بوقت عصر بیٹھا ہوا تھا یکبارگی ایسا معلوم ہوا کہ میرا تمام جسم حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا جسم ہوگیا ہے، یہ حالت اس قدر قوی ہوگئی کہ میں اپنے جسم کو اپنا نہیں پاتا تھا، اور تعجب سے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹتا تھا کہ دیکھوں یہ میرا جسم ہے یا نہیں اگر نہ ہوگا تو تکلیف محسوس نہ ہوگی، یہ حالت تھوڑی دیر گھنٹہ دو گھنٹہ رہی پھر زائل ہوگئی میں نے اس حالت کو بھی لکھا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ حالت فنا فی الشیخ ہونے کی ہے۔ (نقش حیات ص ۹۲)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۶ھ میں بیعت ہوئے اور ۱۳۱۸ھ یعنی تقریباً دو سال میں اسقدر ترقی فرمائی کہ کئی مقامات سلوک جن کی مختصر سی کیفیت درج کی جاتی ہے

۱۔ سلوک کا سب سے پہلا اثر مرشد اور ہادی کی محبت ہوتا ہے کیونکہ محبت روحانی ہی سے عمل اور اقتدار کا جذبہ متحرک ہوکر روحانی اور عملی انقلاب آتا ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں تعلیما للامۃ یہ بھی فرمایا کرتے تھے اللّٰھم ارزقنی حبّک وحب من ینفعنی حبہ عندک اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ کان من دعاء داؤد علیہ السلام اللھم انی اسئلک حبک وحب من یحبک اور اس محبت کا اس قدر غلبہ ہوجائے کہ سالک یہ یقین کرے کہ اس وقت ساری زمین پر مجھے اپنے مقصد تک پہونچانے والا سوائے میرے مرشد کے کوئی نہیں۔ حضرت ــــــــــ حافظ ضامن حسن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:۔

"سالک کو چاہیئے کہ اس امر پر پورا یقین رکھے کہ اس وقت ساری دنیا میں مجھے میرے مقصد تک پہونچانے والا سوائے میرے مرشد کے اور کوئی نہیں اگرچہ دوسرے کامل اولیاء کرام اور مرشدان عظیم بھی موجود ہوں مگر اس کا یہ یقین اپنے شیخ کے ساتھ مستحکم ہو ورنہ ہلاکت کا خطرہ ہے۔" (امداد السلوک ص ۷)

۲۔ سالک جب ممکنات پر عبور کرتا ہے تو اس کی بصیرت روحانیہ میں جمادات نباتات وغیرہ کی مثالی شکل میں ترقی کی منازل محسوس ہوتی ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام

کو قرب خداوندی کی جو ندادی گئی وہ پودے ہی سے تھی جیسا کہ فرمایا فلما اتٰھا نودی من شاطئ الواد الایمن فی البقعة المبارکة من الشجرة ان یموسیٰ انی انا اللہ رب العلمین (القصص ۳۰) قرآن عزیز ہی میں کلمہ طیبہ کی مثال کشجرة طیبة (ابراہیم ۲۴) فرمائی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات روح الامین علیہ السلام کا محل رویت قرآن عزیز نے عند سدرة المنتھی (النجم ۱۴) فرمایا۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا سالک کو جب عبور عنصر آب پر ہوتا ہے تو یہ اس کے آثار ہیں۔ (مکاتیب ص ۴۴)

۳۔ آپ کا ارشاد کہ سلسلۂ چشتیہ کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں، ان آثار میں سے سوز و گداز ہے جس کا اثر گریہ و زاری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایسے سعادتمند کو مبارکباد دیا کرتے تھے، اور قرآن عظیم میں تو انبیاء علیہم السلام کے بکاء کا بھی ذکر ہے جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۵۸ میں ہے، اس گناہ گار کے نام ایک مکتوب گرامی میں فرمایا۔ رونا سلطان الاذکار کی شاخ ہے (مکتوبات ج ۳ ص ۱۱۷)

۴۔ چونکہ رویائے صالحہ علوم روحانی اور فیضان آسمانی کا وہ ابتدائی حصہ ہیں جو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی تھیں اور اب تا قیامت امت کے سعادت مندوں کو ان کے مقام عروج میں یہ سعادت میسر ہوتی رہے گی، سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے لم یبق من النبوة الا المبشرات قالوا وما المبشرات قال الرؤیا الصالحة رواہ البخاری وزاد مالک بروایة عطاء بن یسار یراھا الرجل المسلم او تری لہ (مشکوٰة)

۵۔ جب ذاکر ذکر زیادہ کرتا ہے تو ذکر اس کے بدن اور اس کے دل پر اثر انداز ہو جاتا ہے، قرآن عزیز میں ارشاد فرمایا اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم ثم تلین جلودھم وقلوبھم الی ذکر اللہ۔ الزمر ۲۳ جب دل اور چمڑے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف جھکنے لگ جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ بدن میں غیر ارادی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کیفیت تقریباً ہر سچے ذاکر کو بفضلہ تعالیٰ حاصل ہو جاتی ہے۔

۶ و ۷۔ اگرچہ فنا فی الشیخ کی اصطلاح عمومی طور پر متعارف نہیں مگر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث سے بطور اشارة النص کے اسے ثابت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کی حقیقت

غایت تناسب مرید و شیخ میں ہے جو کہ غایت اطاعت و محبت سے پیدا ہوجاتا ہے (التکشف ص ۲۹۲)

عارف باللہ سید اسماعیل شہید نے فرمایا ہے من التجلیات الصوریۃ الشہودیۃ .... ادعن کونہ مطاعا اطاعۃ ناشئۃ من صمیم قلب المطیع ومن فنائہ فیہ بما ھو مطاع عندہ کذلک کالشیخ ۔ حضرت شہید نور اللہ مرقدہ کی اس عبارت سے فنا فی الشیخ کا مسئلہ واضح ہو رہا ہے جس کی تشریح اہل دل ہی کر سکتے ہیں (واللہ اعلم)

دربارہ سفر گنگوہ شریف آپ کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے شوال ۱۳۱۸ھ میں گنگوہ شریف آنے کا حکم فرمایا، چنانچہ آپ کچھ مدت کے بعد حاضر ہوئے آپ کے برادر بزرگ بھی حاضر خدمت ہوئے، حضرت نے خانقاہ قدوسیہ کے دو حجروں میں آپ کو قیام کی سعادت بخشی اور مراقبہ پر دل جمعی سے عمل کرنے کی ہدایت فرمائی چنانچہ حضرت مدنی نے فرمایا:

> میں نے تعلیم شدہ مراقبہ پر عمل کرنا شروع کر دیا، عصر کے بعد جب کہ صحن میں مجلس عمومی فرماتے تھے تو اسی مراقبہ میں حجرہ قدوسیہ کے برآمدہ میں ستون کے پیچھے تقریبا دو تین گز فاصلہ سے میں مشغول ہوجاتا تھا، مغرب کے وقت تک میں وہاں ہی مشغول رہتا تھا، اس مراقبہ سے مجھکو نہایت قوی اور بہت زیادہ فائدہ ہوتا تھا" (نقش حیات ج ۱ ص ۱۴)

اعطاء خلافت :۔ اسی قیام کے دوران آپ نے خواب دیکھا کہ "کوئی شخص یہ کہہ رہا ہے کہ چالیس دن گذرنے کے بعد مقصود حاصل ہوگا" چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ٹھیک اسی تاریخ کو خلافت سے نوازا، حضرت مدنی نے عرض کیا کہ سلسلہ نقشبندیہ کا سلوک بھی طے کرنے کی خواہش ہے مگر حضرت نے فرمایا:

> "جو تعلیم میں نے دی ہے وہ سب کی بالکل آخری تعلیم ہے، یہاں پر تمام سلاسل مل جاتے ہیں اسی کو مشق کرو"

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا:۔

"اسی میں جد وجہد کرکے پیر مرید سے بڑھ جائے یا مرید پیر سے بڑھ جائے (ص ۱۵)

فائدہ :۔ پیر سے مرید کا روحانی مدارج میں بڑھ جانا یہ فضل کہلاتا ہے جیسا کہ حضرت

گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ شیخ عبدالقدوس قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ شیخ مرید کو لے جاتا ہے اور فضل یہ ہے کہ مرید شیخ کو لے جاوے۔ پدر مفلس کو اگرچہ زکوٰۃ درست نہیں، مگر صدقہ نافلہ جائز ہے (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۷)

حضرت مدنی کا قیام گنگوہ شریف میں تین ماہ سے کچھ دن کم رہا۔ مگر بہت بڑی روحانی دولت سے مالامال ہو کر منبع انوار روحانی اور مہبط انوار ربانی کو واپس تشریف لے گئے، اگرچہ آپ مدینہ منورہ ۱۳۲۰ھ کے اوائل میں پہنچے مگر زیادہ وقت دیوبند اور دوسرے مقامات پر رہا گنگوہ شریف سے واپسی پر دوسرے مقامات پر قیام کے دوران ایک مرتبہ سخت روحانی انقباض پیش آیا تو حضرت نے فرمایا کہ۔

"جاؤ کلیر شریف وغیرہ ہو آؤ حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب بھی قبض پیش آتا تو ایسے مقامات پر تشریف لے جاتے تھے۔" (نقش حیات ج ۱ ص)

آپ نے مدینہ منورہ کی روحانی فضا اور ملکوتی سرزمین میں سلوک کی منازل طے کرنے اور ان پر مداومت کی جو سعادت حاصل کی ہے احقر کے خیال میں دوسرے کسی کو کم ہی نصیب ہوئی ہوگی، مدینہ منورہ میں قیام کے دوران حضرت گنگوہی سے خط و کتابت رہی جو اکثر مسائل سلوک پر مشتمل تھی مگر وہ سارے خطوط آپ کی اسارت مالٹا کے زمانہ میں ترکی حکومت نے ضائع کر دیئے تھے (مکتوبات ج ۴، ص ۱۱۵)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلوک

اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ تمام طریقوں میں مقام رفیع کے مالک تھے مگر اپنے اکابر کی اتباع میں آپ کی حسب تحریر:

ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ اور اشرف طریقہ اختیار فرمایا۔ ان کا ظاہر نقشبندی ہے اور باطن چشتی ہے ؎

بلبل نیم کہ نعرہ زنم درد سر کنم قمری نیم کہ طوق برگردن درآورم
پروانہ نیستم کہ بسوزم بگرد شمع شمعم کہ جاں گدازم و دم بر نیاورم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ: ان لصدرہ ازیزا کازیز المرجل من البکاء

اوکما قال، کیا اسی کی شہادت نہیں دیتی، میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ فرماتے تھے کہ ہمارے مشائخ چشتیہ کے تین دور ہیں اول طبقہ پر زہد غالب ہے، دوسرے طبقہ پر عشق غالب ہے اور تیسرے طبقہ پر اتباع سنت غالب ہے (مکتوبات شیخ الاسلام ج ۳ ص ۶۶، ۶۷)

اس ظاہر و باطن کی تشریح حضرت نے دوسرے مکتوب میں یوں فرمائی:۔

"اگرچہ سلوک چشتیہ میں چست وچالاک اور گامزن ہیں مگر عملی حیثیت سے حضرت مجدد کے قدم بقدم ہیں (ص مذکور)

اس کی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے کہ تزکیہ اور تربیت روحانی میں تو چشتیہ کی پیروی ہے مگر عملی حیثیت سے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی ہے جو کہ نقشبندی تھے جس طرح آپ نے دین اکبری کا مقابلہ کیا اسی طرح ہمارے اکابر نے فرنگی حکومت سے برصغیر کو آزاد کرانے میں مجددی کردار ادا کیا۔

حضرت مجدد اور مزار مجدد سے اکابر کا تعلق یہ ہے کہ

۔ آپ کے مرید خاص حضرت مولانا محمد صدیق صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری اور پھر کچھ دن وہاں قیام کی اجازت طلب کی تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا

"مزار مجدد پر حاضر ہو تو کچھ اس ناکارہ کے واسطے بھی خیال کرنا اور زبانی مزار مبارک پر بہ نشان نام سلام عرض کرنا" (مکاتیب رشیدیہ ص ۳۱)

اور دوسرے مکتوب میں وہاں قیام کی اجازت سے سرفراز فرماتے ہوئے فرمایا:

"قیام بر مزار حضرت مجدد علیہ الرحمۃ بہت عمدہ ہے حق تعالیٰ آپ کا مقصد حاصل فرمادے (ص ۹)

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے سلوک و احسان کی اس سرگذشت سے ظاہر ہے کہ آپ کا سلسلہ سلسلہ چشتیہ صابریہ اور نقشبندیہ مجددیہ تھا۔

۱۳۳۶ھ میں جبکہ حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ اسیر فرنگ تھے احقر نے دس ربیع الثانی بوقت اذان فجر مندرجہ ذیل خواب دیکھا۔

.. احقر مزار مجدد رحمۃ اللہ پر حاضر ہے اور ایک بہت بڑا اجتماع ہے حضرت کے مزار کا رنگ

نسواری ہے جو کہ چمک دار پتھر معلوم ہوتے ہیں اور ان میں سوراخ ہیں جن میں
سبز رنگ کی شاخیں ہیں اور ان پر گل نرگس کھلا ہوا ہے، احقر نے مزار کو بوسہ دیا
اور ایک چھوٹے سے منبر پر پسا ہوا نمک پڑا تھا وہ بہت سارے کر کاغذ میں
لپیٹ لیا۔

یہ خواب اپنے علاقہ کے ایک باخدا مرد درویش سے بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ
" حضرت مدنی اس دور کے مجدد ہیں، قبر سے مراد ان کی نظر بندی ہے اور پھول
سے مراد ان کی وہ برکات ہیں جن سے عالم اسلامی معطر ہو رہا ہے"
اور اس گناہ گار کو شرمندہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مدنی کے روحانی برکات مجددیہ سے
تجھے بھی حظ وافر ملیگا۔

جیسا کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:
" ان شاء اللہ! تیری برکت سے حضرت مجدد کے فیوض و برکات پھیلیں گے"

مکتوب شیخ الاسلام (از قلم حبیب اللہ مدینہ منورہ

چنانچہ مدینہ منورہ کے اٹھارہ سالہ قیام میں آپ پر جن انوار روحانیہ کی بارش ہوئی ہے اس کا خلاصہ
یہ ہے کہ کئی بار سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف خواب میں حاصل ہوا اور چند مرتبہ عالم
بیداری میں بے حجاب زیارت کا شرف حاصل ہوا جیسا کہ ایک واقعہ آپ نے ذکر فرمایا۔
" ایک روز ایک کتاب اشعار کی دیکھ رہا تھا اس میں ایک مصرعہ تھا۔ ہاں اے حبیب
رُخ سے اٹھادو نقاب کو، یہ اس وقت بہت بھلا معلوم ہوا، میں مسجد شریف میں حاضر ہوا اور
مواجہہ شریف میں بعد ادائے آداب وکلمات مشروعہ انھیں الفاظ کو پڑھنا اور شوق دیدار میں رونا
شروع کر دیا، دیر تک یہی حالت رہی جس پر یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ حجاب دیواروں اور جالیوں وغیرہ کا حائل نہیں ہے، اور آپ کرسی پر
سامنے بیٹھے ہوتے ہیں، آپ کا چہرہ مبارک سامنے ہے اور بہت چمک رہا ہے (نقش حیات ص ۱۰۱ ج ۱)
اعطائے خلافت کے بعد آپ نے بیعت طریقت کا سلسلہ کب سے شروع فرمایا، یہ
تا حال احقر کو معلوم نہ ہوسکا البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ قیام مدینہ منورہ کی کیفیت سے آپ کے چشتی

صابری ہونے کے آثار ظاہر ہیں۔ اور اس گناہ گار کے خیال میں برصغیر کو عیسائی حکومت سے نجات دلانے کی تڑپ اور جد وجہد یہ آثار مجددیہ میں سے ہے جن کا ظہور آپ کے محبوب دینی، روحانی علمی راہ نما حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حجاز پہونچنے پر ہوا۔ دنیا کے لوگ اسے سیاست کہیں یا فراست سمجھیں احقر کے نزدیک یہ تو مجددانہ نسبت کا عملی ظہور تھا جس کے لئے آپ اور آپ کے شیخ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہم ما لٹا کے اسارت خانہ میں اسی طرح رہے جس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کیا گیا تھا۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی سالکانہ اور عارفانہ سرگذشت بیان کرنے کے لئے کئی دفاتر درکار ہیں جن کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سفر و حضر، ریل اور جیل، لیل ونہار بلکہ کوئی لحظہ ایسا نہیں گذرا کہ یاد الٰہی اور قرب مطلب سے دوری تو درکنار غفلت میں بھی نہیں گذرا، آپ منازل سلوک طے کرتے کرتے اس مقام کو پہنچ چکے تھے جسے تصوف کی اصطلاح میں منتہی سلوک کہا جاتا ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت قطب الارشاد گنگوہیؒ نے امداد السلوک میں فرمایا۔

> ومقام منتہی آنکہ بصحو وتمکین بود چنانکہ باید اجابت حق نماید ودر شدت وفراخی و منع وعطاء ووفا وجفا بریک حال ماند خوردن وگرسنہ بودن او برابر وبیداری وخواب او یکساں باشد۔ واز حظوظ نفسانیہ فانی بود۔ فقط حقوق ماندہ باشند بظاہر باخلق وبباطن باحق گردد وایں جملہ از احوال فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم واصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین منقول است کہ آں جناب عالی صلی اللہ علیہ وسلم اول درغار حرا خلوت فرمود وآخر کار دعوت خلق کرد واگرچہ مشغول باخلق بودند مگر یک لمحہ از حق تعالیٰ جدا نبودند وجلوت وخلوت برابر داشتند واصحاب صفہ ہم درحال تمکین امرار وزرا شدند کہ مخالطت در ایشاں اثر وضرر نمی کرد (امداد السلوک ص ۹۰)

یعنی سلوک واحسان کی انتہائی منزل جسے حصول مقصد کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ مقام عبدیت کا حصول اور رضائے معبود حقیقی کا مطلوب ہونا، کسی کی مدح اور مذمت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اتباع سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں محو و سرگرم ہونا ہے جیسا کہ قطب الارشاد حضرت گنگوہی نے سالہا سال کی ریاضت کے بعد اپنے مرشد حضرت حاجی صاحب نور اللہ قبورہما

کو اپنی حالت تحریر فرمائی۔

"حضور نے جو بندہ نالائق کے حالات سے استفسار فرمایا ہے، میرے ماوائے دارین اس ناکس کے کیا حالات ہیں اور کس درجہ کی کوئی خوبی ہے کہ جو آفتاب کمالات کے روبرو عرض کروں بخدا سخت شرمندہ ہوں کچھ نہیں ہوں مگر جو ارشاد حضرت ہے تو کیا کروں بناچاری کچھ لکھنا پڑتا ہے، حضرت مرشدمن علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالباً سات سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے، اس سال تک دو سو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر گئے ہیں اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انھوں نے درس جاری کیا، اور احیاء سنت میں سرگرم ہوئے اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں اگر قبول ہوجائے اور حضرت کے اقدام نعلین کی حاضری کے ثمرہ کا یہ خلاصہ ہے کہ جذر قلب میں غیر حق تعالیٰ سے نفع وضرر کا التفات نہیں، واللہ بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے علیحدگی ہوجاتی ہے، لہٰذا کسی کے مدح وذم کی پرواہ نہیں اور ذام ومادح کو دور جانتا ہوں اور معصیت کی طبعاً نفرت اور اطاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہوگئی ہے اور یہ اثر اسی نسبت یادداشت بے رنگ کا ہے جو مشکوٰۃ انوار حضرت سے پہنچا ہے۔ (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰)

حضرت مدنی رح کی ساری زندگی اسی لائحہ عمل کا عکس تھی، تدریس علوم نبوت، اشاعت دین اسلام، عسر اور یسر میں راضی بہ رضا خالق حقیقی، ہجوم معتقدین، مسند حدیث، فرنگی کا جیل وغیرہا تمام حالات آپ کے قلب منور کو معبود برحق کی یاد سے غافل نہ کرسکتے تھے بقول مولانا ابوالکلام:

"حضرت مدنی کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا رہتا ہے۔"

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ مقام رضا پر فائز تھے یعنی ان کا مقصود حقیقی صرف اور صرف معبود حقیقی کی رضا تھا جس کا لازمی اثر یہ ہے کہ اس محنت اور تگ ودو کے بعد بھی اپنے آپ کی نفی کی جائے اور کمالات اگر ہوں تب بھی ان کی نسبت معبود حقیقی اور موجود حقیقی کی طرف کی جائے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں جو عریضہ اپنے حالات

اور واردات کے بارہ میں تحریر فرمایا اسکے آخر میں یہ ارقام فرمایا:

تیرا ہی ظل ہے تیرا ہی وجود ہے میں کیا ہوں کچھ نہیں ہوں اور وہ جو میں ہوں وہ
تو ہے اور میں اور تو خود شرک در شرک ہے (مکاتیب رشیدیہ ص ۱۰)

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے مکتوب گرامی میں فرمایا ہے۔

• میرے محترم یہ سب لطائف وسائل اور ذرائع ہیں، انوار وغیرہ بھی مقاصد اصلیہ نہیں ہیں
وصل اور فراق بھی مقصد اصلی نہیں ہے ؎

وصال و قرب چہ خواہی رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر ازیں تمنائے

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن کے درجہ پر کوئی ولی نہیں پہونچ سکتا ان کی شان میں فرمایا جاتا ہے یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا (الفتح) معیت اور دوام حضور بڑی چیزیں اور انعام عظیم ہیں مگر مقصود اصلی رضائے خداوندی ہے، اگر شاہنشاہ کی دربار داری اور حاضر باشی حاصل ہو جائے اور معاذاللہ رضائے شاہی نصیب نہ ہو تو خسارہ ابدی ہے اور اگر رضائے شاہنشاہی حاصل ہو تو دوری مسافت اور غیر حاضری دربار کوئی چیز نہیں، بسا اوقات مجرمین بھی دربار میں حاضر ہوتے ہیں مگر ان کی یہ حاضری خوش نصیبی نہیں سمجھی جاتی (مکتوبات ج ۴ ص ۱۱-۱۲)

شاید اس لئے حضرت نے ارشاد و تلقین کی طرف زیادہ توجہ نہ دی حالانکہ آپ کی ذات عالی قدر میں اس قدر جذب تھا کہ کوئی بھی اخلاص کے ساتھ دیکھ لیتا تو فریفتہ ہو جاتا تھا بلکہ ایسے عشاق کی تعداد کثرت سے موجود ہے کہ جو بن دیکھے جاں نثاری کو فخر اور سعادت سمجھتے ہیں، اگر حضرت مقام رضا اور مقام عبدیت پر فائز نہ ہوتے تو ان کے متوسلین کی تعداد لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جاتی مگر عجز و انکساری اور حقیقی تواضع نے اس طرف بہت کم توجہ کرنے کی مہلت دی ہے، آپ نے ایک عقیدت مند کو جو ارقام فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے۔

بنے کیوں کر کہ ہے ہر بات الٹی ہم الٹے، یار الٹا، بات الٹی

مخدوما! مریدوں کا زیادہ ہونا، اپنے نام لیوا اور تابعدار زیادہ سے زیادہ بنانا، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہدایت کرنے کی جد و جہد عمل میں لانا، مرشدان طرق اور اہل بیعت کا عظیم الشان

مقصد ہے اور اس زمانہ میں تو اس مقصد کے لئے ایجنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں، پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں اور زیادہ تعداد مریدوں کی بنائی جاتی ہے، رجسٹروں میں ان کے نام درج کئے جاتے ہیں لہذا یہ تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہونی چاہئے کہ آپ اور آپ کے خاندان کے بہت سے عورت مرد میرے مرید ہوجائیں کم سے کم یہ فائدہ ضرور ہی ہوگا کہ ہر طرف آپ لوگ میری تعریفیں کریں گے میرا نام مشہور اور روشن ہوگا، مجھ کو آمدنی ہوگی، اچھا اچھا کھانا وغیرہ ملیگا، نذر نیاز آئے گی، پھر میں کیوں انکار کررہا ہوں، یہ آپ کی محبت ہی کی وجہ سے ہے، اسی وجہ سے اپنا نقصان کرتا ہوں، آپ اگر کسی کامل مرشد سے بیعت ہوں گے تو آپ کی وہ سچی رہنمائی کرے گا اور آپ کی دین اور دنیا کی بھلائی ہوگی، اس سے آپ کو وہ فوائد حاصل ہوں گے جو کہ مقصود اعظم ہیں، میرے جیسا ناکارہ و نالائق، نامراد سگِ دنیا، بندۂ شکم، بدنام کنندہ نکو نامے سے اگر آپ بیعت ہوگئے تو اگرچہ میرا فائدہ ہی فائدہ ہے، مگر آپ کی راہ ماری گئی، آپ کے لئے ہر طرح نقصان ہی نقصان کا سامنا ہے، اسلئے میں آپ کے فائدے کیلئے کہتا ہوں کہ آپ کسی متدین، واقف شریعت وطریقت، کامل بزرگ کو تلاش کریں اور اس سے بیعت ہوں، آپ کہتے ہیں کہ میں نے سب کو دیکھ لیا ہے، کسی سے میری طبیعت بیعت ہونے کو نہیں چاہتی ہے، تو میرے محترم! آپ نے جن کو دیکھا، جن کی جانچ پڑتال کی، جن سے آپ کی خط وکتابت ہوئی، انھیں میں تو خداوندکریم کے مقرب بندے منحصر نہیں ہیں، آپ تلاش کرتے رہیں، ممکن ہے کہ کوئی مرد خدا مل جائے "اولیائی تحت قبائی لا یعرفہم غیری" مشہور مقولہ ہے، ممکن ہے کہ آپ کی پرکھ غلط ہو پھر یہ عجیب بات آپ نے کہی کہ کسی سے بیعت ہونے کی طبیعت نہیں ہوتی تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کی طبیعت پر مدار ہے جس کو آپ کی طبیعت بزرگ مانے وہ بزرگ ہے اور جس کو نہ مانے وہ بزرگ نہیں۔ (مکتوب ج ۴ ص ۴، ۵، ۷)

اس لئے حضرت نوراللہ مرقدہٗ ہمیشہ ہر کسی کو حلقۂ ارادت میں لینے سے اجتناب فرمایا کرتے تھے، مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم نے جب اپنے ملحدانہ عقائد سے توبہ کی اور بیعت کیلئے مولانا عبدالباری کو سفارشی بناکر دیوبند حاضر ہوئے تو حضرت نے انکار فرماکر ان کو

بہ نفس نفیس تھانہ بھون حضرت تھانوی کے حضور پیش فرمایا، حضرت تھانوی کی سفارش پر ان کو بیعت تو فرمالیا مگر تربیت کے لئے حضرت تھانوی کی طرف رجوع کا حکم فرمایا (جس کی ساری سرگذشت مولانا دریا آبادی کی مرتبہ کتاب نقوش وتاثرات میں مذکور ہے) البتہ ایک طریقہ ایسا تھا جس کی روشنی میں حضرت انکار نہ فرماسکتے تھے اور وہ خود اس گناہ گار کا تجربہ شدہ ہے جس کی مختصر سی کیفیت یہ ہے۔

کہ مظاہر علوم سہارنپور کے زمانۂ تعلیم میں تقریباً ہر جمعرات کو بعد از عصر حضرت کی زیارت یوں ہو جایا کرتی تھی کہ کانگریس یا جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سہارنپور تشریف لاتے اور فرودگاہ میں تقریر فرماتے، اسی وقت سے آئینہ دل میں میں حضرت کا نقش اس طرح ثبت ہو گیا کہ آج تک باقی ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا، مگر زیادہ قرب دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے داخلہ پر نصیب ہوا، ہر ہفتہ کئی بار گھنٹوں زیارت کا شرف مل جاتا، دارالحدیث سے لے کر خانقاہ مدنی تک اور پھر خصوصاً نماز مغرب میں جو حضرت خانقاہ سے متصل چھوٹی مسجد میں ادا فرماتے اور نماز مغرب کے بعد سوا پارہ نوافل میں دو حافظوں کو سناتے، اسی طرح نماز فجر اکثر اسی مسجد میں حضرت کی اقتدار میں پڑھنے کی سعادت ملتی، حضرت نماز فجر میں قنوت نازلہ باقاعدہ پڑھا کرتے تھے، غرضیکہ یہ سعادت کثرت سے حاصل رہی، اگرچہ بیعت کا مفہوم معلوم نہ تھا نہ یہ گناہ گار اس قابل تھا مگر تعلق کا ایک ذریعہ بنانے کے لئے کئی بار درخواست کی مگر یہی جواب ملا کہ استخارہ کر لیا جائے، اس کا جواب کبھی تو گستاخانہ طریقہ پر دیا جاتا کہ عبادت میں استخارہ کا حکم نہیں، اور کبھی کسی اور طریقہ سے مگر ادھر سے اسی پر اصرار رہا، آخر فراغت پر گھر آیا تو ایک رات خواب میں سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیعت کا حکم ملا، وہ پورا خواب لکھ کر ارسال کر دیا، تو جواب ارشاد فرمایا کہ ملاقات پر انشاء اللہ بیعت کر لی جائے گی، آخر وہ سعادت آفریں گھڑی آگئی کہ مورخہ ۲۹ شعبان ۱۳۵۵ھ/ ۱۲ نومبر ۱۹۳۶ء بروز جمعرات نماز مغرب کے بعد اسی مسجد میں چند دیگر سعادت مندوں کے ساتھ بیعت

کا شرف حاصل ہوگیا۔

اس مختصر مگر جامع داستان کا مقصد یہ ہے کہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ سے بیعت ہونا بہت مشکل تھا، بیعت کے بعد رات کو خانقاہ کے بغل والے چھوٹے سے کمرے میں سونے کا حکم دیا کہ یہاں شیخ الہندؒ آرام فرمایا کرتے تھے۔ پھر تسبیح ۱۰۰ بار، استغفار ۱۰۰ بار، درود شریف ۱۰۰ بار صبح وشام، پاس انفاس ایک گھنٹہ کرنے کا حکم فرمایا۔

۲۰ رجب ۱۳۵۶ھ کو دوبارہ حاضری پر مندرجہ ذیل اسباق ارشاد فرمائے۔

نماز تہجد کے بعد فاتحہ ۳ بار، درود شریف ۳ بار، سورۂ اخلاص بارہ بار، درود شریف ۳ بار پڑھ کر یہ دعا کی جائے۔ اللّٰھم بلغ ثواب ماتلوتہ لمشائخ ہذہ الطریقۃ وافض علیّ من فیوضاتہم و برکاتہم آمین، پھر ذکر یوں کیا جائے

لاالٰہ الااللہ۔ ۲۰۰ بار۔ الااللہ۔ ۴۰۰ بار اَللّٰہُ اَللّٰہُ۔ ۶۰۰ بار، اَللّٰہُ ایکسو بار، ذکر قلبی ۲۰۰۰ بار یہ ذکر کافی زمانہ ہوتا رہا اور پاس انفاس بھی ہوتا رہا، کیفیات وقتاً فوقتاً بذریعہ عریضہ اور کبھی زبانی عرض کرتا رہا، حتیٰ کہ الہ آباد جیل سے مورخہ ۹ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ کو گرامی نامہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ اب اسم سے مسمیٰ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور وہ مراقبہ معیت ہے جس میں وھو معکم کا استحضار کیا جائے جس کی تشریح مکتوبات شریفہ ہے،

حضرت نے اس گناہ گار پر بہت زیادہ توجہ فرمائی، اور اس توجہ کے بہت زیادہ آثار محسوس ہوئے، ایک دفعہ سحری کے مراقبہ میں یوں القا ہوا بلکہ ندا آئی کہ تو ابوالمعالی ہے۔ مگر افسوس کہ اپنی بداعمالی کی وجہ سے کچھ بھی باقی نہ رہا، جس طرح عمر عزیز کافی گذر گئی اسی کے ساتھ ساتھ وہ سب برکات بھی ختم ہوگئیں، صرف ایک برکت باقی ہے کہ حضرت نور اللہ مرقدہ کے ساتھ محبت میں ذرہ بھی کمی نہیں ہوئی، الحمد للہ حسب ارشاد گرامی سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم المرء مع من احب، نجات کی امید ہے۔

حضرت نور اللہ مرقدہٗ نے ختم ہفت سلاطین اور حزب البحر کی اجازت سے نوازا ختم ہفت سلاطین تو آج تک جاری ہے جس کی برکات کا نزول ہو رہا ہے، حزب البحر چند سالوں کے بعد چھوڑ دی تھی اور حضرت نور اللہ مرقدہ کی یہی مرضی معلوم ہوتی تھی۔

بیعت کے دوسرے دن صبح ناشتہ کے بعد آپ نے "مستعمل عبا عنایت فرمایا جواب تک میرے لئے باعث سعادت و برکت ہے اور خواہش ہے کہ میرے کفن میں بھی اسی سے سعادت حاصل کی جائے، جیسا کہ :

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ نیا کرتہ طلب کرلیا تھا جو آپ کی خدمت میں ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا پیش کیا تھا، چند صحابہ کرام اس جرأت پر استفسار کے جواب میں اس صحابی رضی اللہ عنہ نے یہ وجہ بیان فرمائی کہ میں نے اس مبارک کرتہ کو اپنا کفن بنانے کے لئے یہ جرأت کی ہے، چنانچہ وہ کرتہ اس صحابی رضی اللہ عنہ کا کفن بنا (مشکوٰۃ)

اس گناہ گار نے بھی اسی سعادت کے حصول کے لئے یہ جرأت کی تھی، الحمد للہ ثم الحمد للہ

روحانی برکات کا ظہور

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے سلوک و معرفت کی تمام مروجہ منازل بے نظیر طریقہ پر طے فرمائیں، مدینہ منورہ، مالٹا اور پھر برصغیر میں آپ نے احسان و شہود کا قرب حاصل فرمایا، مگر ان برکات کا عملی ظہور آپ کے قیام بنگال سے زیادہ شروع ہوا، جہاں آپ بظاہر تو شیخ الحدیث صدر مدرس بن کے رہے، مگر درحقیقت آپ کی روحانی برکات کا انکشاف اور ظہور وہیں سے ہوا، یہی وجہ ہے کہ آپ کی طرف سے مجاز طریقت و بیعت کے سعادت مندوں کی تعداد ۹۲ رہے ہے جبکہ کل مجازین کی تعداد ۱۶۷ رہے ہے، دارالعلوم دیوبند تشریف لانے کے بعد اگرچہ تدریس اور سیاسیات میں بے پناہ مصروفیت رہی مگر طالبان سلوک بھی کشاں کشاں حاضر خدمت ہوتے رہے، خانقاہ مدنی میں علمی اور سیاسی بحث کم ہوتی، مگر روحانی تجلیات زیادہ ہوتی تھیں، سفر میں آپ جہاں رونق افروز ہوتے خواہ وہ سفر سیاست کے نام سے ہوتا مگر وہاں بھی تشنگان آب حیات جوق در جوق پہونچ جاتے، چونکہ آپ مقام عبدیت پر فائز تھے اس لئے آپ نے :

"رو رو کر دعائیں کیں کہ ہجوم خلق کو ہٹا دیا جائے۔" (مکتوبات ج ۲ ص ۱۶۰)

دراصل حضرت نور اللہ مرقدہ کی یہ کیفیت بھی سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا اثر

تھی جو آپ نے تعلیماً للامت فرمایا، اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی اعین الناس کبیراً، اور یہ آپ کی صداقت للٰہیت کی دلیل تھی کہ طالبان سلوک کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا رہا جیسا کہ،

ہرقل نے ابوسفیان سے سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو چند سوالات کئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کیا اس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیروکار بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں، ابوسفیان نے بتایا کہ دن بدن بڑھ رہے ہیں، تو ہرقل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کیفیت کو آپ کی صداقت کی دلیل قرار دیا (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

ظاہر ہے کہ غزوۂ بدر میں صحابۂ کرام کی تعداد ۳۱۳ اور بقول شاذ ۳۱۴ تھی اور پہلی مردم شماری حسب روایتِ بخاری چھ سو تھی، حدیبیہ کے وقت چودہ سو تھی، فتح مکہ کے دن دس ہزار اور غزوۂ حنین میں بارہ ہزار سعادت مند تھے جبکہ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ سے کچھ زیادہ تھی، اور آج روئے زمین پر ایک ارب سے زیادہ مسلمان ہیں جو کہ وللآخرۃ خیر لک من الاولیٰ کا مظہر ہیں، اور یدخلون فی دین اللہ افواجا کا لافانی ثبوت ہیں۔

حضرت کے پروانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی رہی حتی کہ بنگال کے سفر میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ ایک بڑے مجمع کو شرف بیعت بخشتے ہوئے کلمات بیعت کہلوائے گئے، بلاشبہ اس وقت عرب وعجم میں آپ کے غلاموں کی تعداد کئی لاکھ ہے جہاں حضرت نوراللہ مرقدہٗ کے خلفاء اصطلاحی اور ربصری زیارت سے محروم عشاق کو آپ کے فیوضات اور برکات سے مالامال فرمارہے ہیں، بارک اللہ فی ما عیہم وکثر اللہ امثالہم۔ آمین۔

تربیۃ السالکین

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی ریاضت اور محنت سے اس راہ سلوک کو طے فرمایا تھا، وہ پوری طرح اس کے نشیب وفراز سے واقف تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ نے سالکین کی تربیت ان کے مزاج کے مطابق فرمائی، اختصار کے طور پر ان کے ارشاد فرمودہ چند روحانی نسخے درج ذیل ہیں۔

(۱) امراض باطنیہ کے ازالہ کے لئے آپ نے فرمایا :۔

امراض باطنیہ کا علاج اجمالی تو کثرت ذکر اور تدبر فی القرآن اور کثرت تلاوت ہے اور تفصیلی (علاج) احادیث متعلقہ میں غور کرنا اور ان کی ہدایات کے مطابق ہر ایک خلق میں جدوجہد کرنی تصوف کی کتابیں ان امور میں ہدایات تامہ کرتی ہیں بالخصوص امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں جیسے کیمیائے سعادت، منہاج العابدین وغیرہ ہر دو کا ترجمہ اردو میں موجود ہے، منہاج العابدین امام غزالی کی آخری تصنیف ہے مختصر اور مفید ہے اس کا ترجمہ سراج السالکین اردو میں ہے اور بہت کارآمد ہے، رسالہ امداد السلوک فارسی میں بہت مفید ہے (مکتوبات شریف ج ۴ ص ۴۹)

(ف) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تصانیف کا خلاصہ خلاصۃ التصانیف فی التصوف کے نام سے عارف باللہ شیخ محمد امین کردی ؒ نے فرمایا ہے، جس کا ترجمہ اردو میں اس گناہ گار نے روحانی تحفہ کے نام سے کیا ہے، الحمد للہ اس سے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو فائدہ پہونچا، چنانچہ اس کا ترجمہ پشتو زبان، سندھی زبان میں شائع ہوچکا ہے، اب انشاء اللہ انگریزی میں بھی شائع ہونے والا ہے۔

امداد السلوک :۔ یہ کتاب حضرت قطب الدین دمشقی م ۸۰۰ھ کی تالیف ہے جس کا نام رسالہ مکیہ ہے، یہ عربی زبان میں ہے جس کا ترجمہ فارسی زبان میں قطب الارشاد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حافظ محمد ضامن حسن شہید کے حسب ارشاد فرمایا اور اس ترجمہ کا نام اپنے مرشد کی نسبت سے امداد السلوک رکھا، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے اس گناہ گار کو مطالعہ کا حکم فرمایا تھا جس سے کافی روحانی فائدہ ہوا مگر افسوس گناہ گار سنبھال نہ سکا۔

اسی طرح آنکھ کے گناہ سے محفوظ رہنے کا عملی علاج تجویز کرتے ہوئے فرمایا :۔

جب کوئی حسین صورت نظر آجائے تو معاً یہ تصور کیجئے کہ یہ ناپاک منی اور ناپاک خون سے بنائی ہوئی مورت ہے اور بدن میں سیروں نجاست اس میں بھری ہوئی ہے، صبح و شام پاخانہ اور پیشاب وغیرہ کی صورت میں نکلتی ہے اور مرنے کے بعد اس کی نہایت نفرت انگیز صورت ہونے والی ہے، اس واقعی بات میں ذرا غور اور دھیان برابر رکھئے، انشاء اللہ بے چینی

وغیرہ جاتی رہے گی۔ (ج ۴ ص ۲۹)

(۲) **قبض و بسط کا علاج**۔ اس گناہ گار کے نام مکتوب شریف میں یہ ارشاد فرمایا۔

قبض و بسط کی حالت کا پیش آنا خواص انسانی میں سے ہے، اس سے زیادہ متاثر نہ ہونا چاہئے، البتہ قبض کی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ استغفار کثرت سے کرتا رہے اور بسط کی حالت میں خدا کا شکر کثرت سے کرے کیونکہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اگر تم شکر کروگے اور احسان مانوگے تو اور زیادہ تم کو دوں گا۔" (مکتوبات ج ۴ ص ۱۲۰)

(۳) **سالک کیلئے جسمانی اور مادی تکالیف کا علاج**۔ ایک مرید باصفا کو ارشاد فرمایا:

یہ جسمانی اور مادی تکالیف اندیشناک نہیں بلکہ ذکر کی تاثیرات ہیں جیسے اجزاء ناریہ دخان میں اجزاء ارضیہ کو اپنے مرکز کی طرف اٹھائے جاتے ہیں اور درمیان میں تصادم کی وجہ سے برق، رعد اور صاعقہ وغیرہ پیش آتے ہیں یہی حال سالک کو ذکر کے ساتھ پیش آتا ہے ھنیئاً لأرباب النعیم نعیمھم الخ تاہم ذکر جہر بارہ تسبیح کو موقوف کر دیجئے اور علیٰ ہذا القیاس اسم ذات کو بھی بند کر دیجئے، یعنی پاس انفاس اور ذکر قلبی جو کہ جاری ہیں، جاری رکھئے اور مراقبہ میں ترقی کیجئے (مکتوبات ج ۳ ص ۹۳)

یہ گناہ گار عرض کرتا ہے کہ بیعت کا مقصد اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیعت کے بعد رزق کی فراوانی اور دنیاوی مقاصد پورے ہوں، آج کل بیعت کا تقریباً یہی معیار قرار دیا گیا ہے اسلئے بجائے اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کے اہل اللہ اور اولیاء کرام سے عملیات کی اجازت مانگتے ہیں اور اگر مالی حالت درست ہوگئی مادی اغراض پوری ہوگئیں تو پھر مرشد کو قاضی الحاجات کہنے اور سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگاتے، اور اگر میلے کچیلے گناہ سے آلودہ بدن کو شیخ کامل کی نظر سے صاف ہونے میں تکلیف پہونچے یا ناجائز رزق کی آمدنی بند ہو جائے یا کوئی مادی ابتلاء آجائے تو اس بیعت کو توڑ ڈالتے ہیں ایسے قسم کے لوگوں کا ذکر قرآن عزیز نے یوں فرمایا ہے

ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف	اور کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایک کنارہ پر
فان اصابہ خیر اطمان بہ وان اصابتہ	کرتے ہیں اگر ان کو دنیاوی بہتری مل جائے تو
فتنۃ انقلب علی وجھہ خسر الدنیا	اس سے خوش ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش

والاخرۃ ذلک ھو الخسران المبین ○ آجائے تو چہرے کے بل پلٹ جاتے ہیں دنیا اور قیامت دونوں میں گھاٹا پاگئے اور یہ کھلا ہوا گھاٹا ہے۔ (الحج ۱۱)

حالانکہ سلوک و معرفت تو اصحاب صفہ کی وراثت ہے بلکہ اس گناہ کار کے نزدیک تو تمام دینی تعلیم اصحاب صفہ کی وراثت ہے ان مدارس اور خانقاہوں میں اگر اصحاب صفہ کی جھلک ہوگی تو دینی طور پر کامیاب ورنہ ناکام ہوں گے (اعاذنا اللہ منہ)

ایک صحابی نے رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا، اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے آپ سے بڑی محبت ہے آپ نے فرمایا دیکھ تو کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے تین بار اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہا مجھے آپ سے بڑی محبت ہے تو آپ نے فرمایا۔ اگر تو سچا ہے تو پھر غربت کے لئے پالان تیار کر لے یاد رکھ جس کو میرے ساتھ محبت ہوگی فقر و فاقہ اس کی طرف پانی کے اس سیلاب سے بھی جلدی پہونچ جائے گا جو پستی کی طرف بہنے والا ہو (مشکوٰۃ باب فضل الفقراء)

چنانچہ سلوک و احسان کے طلبہ کو فقیر کہا جاتا ہے، اور فقر کے تین حرف تین صفات کی علامت ہیں، فؔ سے فاقہ، قؔ سے قناعت، رؔ سے ریاضت۔ رزقنا اللہ وایاکم (آمین)

اس دنیا کے عیش و عشرت سے دامن بچانا صرف تقویٰ ہی نہیں بلکہ سلوک کے لئے نہایت ہی ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر اولیاء کرام ہمیشہ اس سے کنارہ کش رہے، شاہ غلام علی نقشبندی کو جب نواب ٹونک نے ضروریات کے پورا کرنے کے لئے مادی پیش کش کی تو آپ نے جواب میں فرمایا۔

نان جویں و خرقہ پشمین و آب شور — سیپارہ کلام و حدیث پیمبری
ہم نسخہ دو چار ز علمیکہ نافع است — نہ دیں نہ لغو بو علی و ژاژ عنصری
تاریک کلبۂ کہ پئے روشنی آں — بیہودہ نبرد شمع خاوری
بہ یک دو آشنا کہ تیز رو بہ نیم جو — در پیش چشم او ملک سنجری
ایں آں سعادت است کہ حسرت برادبرد — جو پائے ملک قیصر و تخت سکندری

(۴) حضرت مولانا عبدالحق مدنی صدر مدرس مدرسہ قاسمیہ شاہی مسجد مراد آباد کے نام گرامی نامہ میں ارشاد فرمایا:

• آپ کا یہ فرمانا کہ زن وشو کے تعلقات کے ساتھ اصلاح نفس محال ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ بیوی کے ساتھ خلوت بھی قلب کو صفا اور روح کو جلا دیتی ہے، شفاء قاضی عیاض کے شارح نے کہا ہے کہ ہر شہوت دل کو زنگ آلودہ کرتی ہے سوائے خلوت صحیحہ بیوی کے ساتھ، کیونکہ اس سے صفائی باطن ہوتی ہے (مکتوبات ج ۱ ص ۳۱)

تجرد اور ان دنیاوی علائق سے تبتل جو نہ صرف انسان کی فطرت سلیمہ میں داخل ہیں نہ صرف غیر پسندیدہ بلکہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی لا رھبانیۃ فی الاسلام سلوک کا احسان، طریقت کا بنیادی اصول ہے، پھر نکاح جو کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، جس کو سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت سے تعبیر فرمایا سوائے یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے سب انبیاء علیہم السلام نے ازدواجی زندگی اختیار فرمائی، قرآن عزیز نے فرمایا وجعلنا لھم ازواجا وذریۃ (الرعد ۳۸) خود سید دو عالم امام المعصومین مرشد السالکین صلی اللہ علیہ وسلم کے نو حرم تھیں جو ان کی خصوصیت تھی، امت کی تعلیم کے لئے سفر میں مغازی میں بھی کسی نہ کسی ام المؤمنین کو ہمراہی کی سعادت بخشی، رفیق اعلیٰ کے سفر کے وقت بھی یہ تعلق جلوہ گر تھا،

نکاح اور تعلقات زن وشوئی معاشرتی یا جنسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ یہ تو مذہبی اور روحانی مسئلہ ہے، کئی اخلاق فاسدہ اور اعمال رذیلہ خبیثہ کا نکاح سے قلع قمع ہوجاتا ہے، قرآن عزیز نے جعل بینکم مودۃ ورحمۃ فرما کر اس کی حکمت بالغہ کو یوں ارشاد فرمایا کہ مودۃ فی زمان الشباب ورحمۃ فی زمان الشیخوختہ یعنی جوانی میں میاں بیوی کے درمیان قلبی محبت ہوجاتی ہے اور بڑھاپے میں ایک دوسرے کیلئے سراپا شفقت اور رحمت بن جاتے ہیں۔

(۵) ایک مسترشد کی بعض کمزوریوں پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

• طبیعت کا بدل جانا یا تو کسی گناہ کی شومی سے یا کسی حالت کے اظہار سے یا طبعی قبض سے جو کچھ بھی ہوا ہے استغفار کی کثرت لازم ہے افسوس تو اس امر کا ہے کہ چار وقت کی نماز کیوں چھوٹی ہمیشہ خیال رکھیے کبھی ایسے وقت میں فرائض ترک نہ ہوں دل لگے یا نہ لگے، کتنا ہی انقباض ہو مگر نماز ہرگز ترک نہ ہونی چاہئے، توبہ

نصوح کیجئے اور کثرت استغفار عمل میں لائیے انشاء اللہ حالت خوب ہوجائے گی (مکتوبات ج ۱ ص ۲۸)
ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے اعمال میں کمی یا کمزوری پر غور وفکر کرے، چونکہ اللہ تعالیٰ تو رحیم اور کریم ہے وہ کسی نعمت کو سلب نہیں فرماتا جب تک بندہ خود اپنی نااہلی یا ناشکری کی وجہ سے محروم نہ ہو، ارشاد قرآنی ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم (الرعد ۱۱)
خصوصًا سالک کے لئے تو بہت ہی محتاط رہنا ضروری ہے کہ اس کی محنت ضائع نہ ہو اس کیلئے توبہ اور استغفار ضروری ہے مگر توبہ وہی ہو جس کا ذکر قرآن عزیز نے یوں فرمایا ہے الا من من تاب وآمن وعمل عملا صالحا فاولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات وکان اللہ غفورا رحیما (الفرقان ۷۰)

(۶) ایک مسترشد صاحب کو جنھوں نے خلافت کی درخواست دی تھی، یہ ارشاد فرمایا۔

محترم عزیز! نفس اور شیطان کے مکر ہزار ہزار ہیں دونوں انسان کو اگر وہ کھلی ہوئی انانیت اور جاہ پرستی اور خود غرضی سے بچتا بھی ہے تو ایسی ایسی خفیہ تدبیروں میں مبتلا کرتے ہیں کہ ان سے بچنا سخت مشکل ہوتا ہے، عمومًا لوگوں میں پیری مریدی حب جاہ و مال اور خواہشات نفسانی کی بنا پر جاری ہو رہی ہے بہرحال ان دونوں کے مکر سے بچئے ممکن ہے کہ نسبت طریقت سے مالا مال ہوجائیں اور آپ کو باقاعدہ ارشاد و سلوک کی اجازت دی جاتے مگر ابھی بہت سی خامیاں ہیں۔ (ص ۳۲۷)

سالک کی نیت خالص اصلاح نفس ہو وہ نفی اثبات میں اگر اپنے وجود کی نفی نہیں کرسکتا تو وہ کیسا موحد ہے، لا الٰہ الا اللہ کے ذکر میں اگر وہ متعارف معبودات باطلہ کی نفی تو کرتا ہے مگر اپنے نفس کی نفی نہیں کرتا تو وہ کس طرح اصلاح پذیر ہوسکتا ہے، اس لئے وہ عملیات جن کا تعلق تسخیر خلق سے ہے تزکیہ نفس کیلئے مفید نہیں، اعداء کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے عملیات کا پڑھنا تو درست ہے کہ سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر معوذتین نازل فرمائیں مگر تزکیہ نفس شئ دگر ہے۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ہی ایک مسترشد کو فرمایا:

"کوئی عمل تسخیر کا ایسا ہوتا تو میں یہاں جیل میں کیوں پڑا ہوتا، سب سے بڑا عمل تسخیر کا تقویٰ ہے ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت سیجعل لہم الرحمن ودا (مریم ۹۶)

(۷) اس گناہ گار کفش بوس کے نام ارشاد فرمایا :-

میرے محترم! لوازم عبودیت میں سے ہے کہ بندہ آقا کے حکم اور اس کی مرضی کا نہ صرف تابع بلکہ اس پر خوش بھی رہے اور منازل عشق میں تو اس کی رضوان اور خوشنودی نصب العین اور مقصود بالذات ہونی چاہئے پھر اس قلق اور اضطراب کے کیا معنی؟ عالم اسباب میں فرمایا گیا ہے اشد الناس بلاء الانبیاء ثم الامثل فالامثل آپ پر لازم ہے کہ اگر مجھ پر کوئی آثار قلق و اضطراب کے ظاہر ہوتے تو مجھ کو نہ صرف صبر بلکہ شکر کی تلقین کرتے من یرد اللہ بہ خیراً یصیب منہ یاد دلاتے یہاں آپ خود الٹے مضطرب نظر آتے ہیں، ملاقات کا ہرگز قصد نہ فرمائیں (ڈسٹرکٹ جیل مرادآباد ۲۲ جولائی ۱۹۴۲ء رجب ۱۳۶۱ھ) (ج ۲ ص ۳۱۱)

مرشد کے لئے مربی ہونا ضروری ہے، تربیت کا مفہوم یہ ہے کہ مرید اور مسترشد کی اصلاح کریں اس طریق علاج میں مرید کے مزاج اور کیفیت کا لحاظ نہ کرے، رب اور اب میں یہی فرق ہے کہ اب سراپا شفقت ہے اولاد کی فاش غلطی بھی دیکھ کر خاموشی اختیار کرلیتا ہے جبکہ تربیت کنندہ کے لئے تنبیہ اور بوقت ضرورت اس میں سختی بھی ضروری ہے، رب العلمین نے عفو و کرم مغفرت اور درگذر اس قدر فرمائی کہ اس سے زیادہ محال ہے مگر نافرمانی پر زجر و توبیخ اور بغاوت پر کسی بھی رعایت کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ، حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کا عفو و کرم، درگذر، انکساری، محبت اور شفقت اس دور میں بے نظیر تھی مگر بغاوت اور عدم اعتماد پر سرزنش بھی تھی جس کی نظیر مولانا صبغۃ اللہ صاحب کا واقعہ ہے۔

(۸) مولوی صبغۃ اللہ صاحب سے میں تعلق ان کے مودودی ہونے کی وجہ سے منقطع کرچکا ہوں۔

(مکتوبات شیخ الاسلام (ج ۲ ص ۳۴۰)

چونکہ ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے عنوان سے اپنا پورا زور قلم صرف کیا تھا جس کے دام تزویر میں بڑے بڑے علماء کرام اپنی سادگی اور اس سراب کو آب حیات سمجھ کر کشاں کشاں داخل ہوتے رہے مگر حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ نے روز اول ہی سے اس جماعت کو گمراہ اور گمراہ کن قرار دیا تھا ہم جیسے نااہل مگر کفش بوس تو اسی وقت سے متنفر ہوگئے تھے خصوصاً مودودی کا شیخ العرب والعجم نوراللہ مرقدہٗ پر ذاتی اخلاقی حملہ ایسا تھا

کہ کوئی بھی انصاف پسند خصوصاً دارالعلوم دیوبند سے منسوب باوفا ایک لحظہ کیلئے بھی اس جماعت کے ساتھ تعلق رکھنا دینی اور روحانی بلکہ اخلاقی خودکشی سمجھتا تھا مگر بعض لوگ ادھر تو خانقاہ مدنی سے اپنے آپ کو منسلک بتاتے تھے اور ادھر مودودی کو بھی مصلح سمجھتے تھے، ان ہی میں سے مولانا سید صبغۃ اللہ صاحب بختیاری مدراسی بھی تھے، حضرت نے ان کو اپنی بیعت سے خارج فرمادیا، یہ گرامی نامہ اس انقطاع تعلق کے لئے تحریر فرمایا، مگر مولانا بختیاری سعادت مند تھے کہ جلد ہی توبہ کرلیا، اور حضرت کی خدمت میں توبہ نامہ ارسال کرنے کے ساتھ ساتھ السر بالسر والعلانیۃ بالعلانیۃ پر عمل کرتے ہوئے اخبار مدینہ بجنور کی اشاعت مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۵۳ء میں توبہ نامہ بھی شائع کردیا جس کی نقل اور حضرت رح کا معاف فرمانا مکتوبات شریف ج ۲ ص ۱۰۳ میں مذکور ہے

ف :۔ اس گناہ گار نے ۱۹۴۳ء میں ایک خط بنام مکتوب مفتوح بہ نام مودودی صاحب لکھا جو صدق جدید لکھنؤ کی اشاعت مورخہ ۹ مارچ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا اور اس سے متأثر ہوکر مولانا دریابادی مرحوم نے ایک مضمون بہ نام کشف حقیقت بھی شائع فرمایا جو دارالارشاد اٹک نے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ بہ نام براۃ المحدث از افتراء المحدث شائع کردیا ہے ۔

(۹) ایک مرید کو ارقام فرمایا :

آپ ذکر پر مداومت فرمائیں اور جہاں تک ممکن ہو اپنے نفس اور قلب پر قابو رکھیں، اگر بے قابو ہونے لگیں تو درود شریف پڑھتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور کریں

(مکتوب شریف ج ۱ ص ۳۹۳)

چونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں جلال ہے اور جلال کی قوت کو برداشت ہر ایک نہیں کرسکتا، نفس اور قلب کے بے قابو ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ وہ ناسوتی صفات کو چھوڑ کر ملکوتی صفات کی طرف پرواز کرنے لگے، اور دوسری حالت یہ ہے کہ بغاوت پر آمادہ ہوجائے، کیونکہ نفس کی تین حالتیں ہیں امارہ، لوامہ، مطمئنہ۔ اگر وہ امارہ ہوجائے تب بھی درود شریف کی کثرت سے بفضلہ تعالیٰ اس میں انکساری پیدا ہوجاتی ہے اور درود شریف حضور قلب اور شوق وعشق کے ساتھ اگر پڑھا جائے تو تصور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے، ذلک الفوز العظیم۔

(۱۰) چونکہ دل مرکز ہدایت ہے اور دل ہی سے کفر اور فسق اور نفاق کی امراض پیدا ہوتی ہیں جیساکہ قرآن عزیز نے صحابۂ کرام کے بارہ میں ارشاد فرمایا کتب فی قلوبہم الایمان (المجادلہ ۲۲) کافروں کے بارہ میں فرمایا قلوبہم منکرۃ (النحل ۲۲) اور ختم اللہ علی قلوبہم (بقرہ ۷) منافقوں کے بارے میں فرمایا فی قلوبہم مرض (بقرہ ۱۰) اسلئے اصلاح قلب ہی سے اعمال اور اقوال کی اصلاح ہوسکتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد ۲۸) مگر دل تک رسائی زبانی ذکر اور دوسرے اوراد سے ہوگی اور جب دل ذاکر ہوجائے تو روح جو کہ حقیقت انسانیت کا نام ہے وہ ذکر کی دولت سے مشرف ہوجاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل و کرم والا ہے۔ یوتیہ من یشاء

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے ان تمام مدارج کو یوں ارشاد فرمایا:

"لہٰذا برادر من تم پر لازم ہے کہ خاص ذات جل مجدہٗ کی جانب جہاں تک ہوسکے قلب کو متوجہ کرو، کیونکہ زبان سے ذکر کرنا گویا زبان کو ہلانا ہے اور قلب کا ذکر وسوسہ ہے اور حقیقی ذکر روح کا ذکر ہے"۔ (مکتوب شریف ج ۱ ص ۹۴)

اسی کی مزید تشریح دوسرے مکتوب گرامی میں یوں فرمائی۔

"اگرچہ ذکر لسانی ذکر قلبی کے سامنے نہایت کمزور نسبت رکھتا ہو مگر جیسے کہ ذکر قلبی ذکر روحی کے سامنے نہایت کمزور ہے کہ ذکر اللسان لقلقہ و ذکر القلب وسوسہ قول سلف ہے مگر تاہم اس ذکر لسانی کو حقیر نہ سمجھا جائے (یہ بھی) بسا غنیمت ہے، اور بہت سے اشخاص اس سے بھی محروم ہیں، ثمرہ سے خالی نہیں اگرچہ ضروری ہے کہ حتی الوسع کوشش کی جائے کہ حضور قلب ہو سیلاب میں دریا کا پانی بہتا ہے اور اس پر جھاگ اور کوڑا کرکٹ ہوتا ہے تاہم پانی اپنے فوائد زمینوں اور کاشت کے رقبوں، حیوانات وغیرہ کو پہنچاتا ہی ہے"۔ (جلد اول ص ۱۷۳)

اس بابرکت راہنمائے ہدایت اور مینار نجات مضمون کو حضرت قدس سرہٗ العزیز کے اس مکتوب پر ختم کیا جاتا ہے جو آپ نے مولانا قاری محمد میاں صاحب مدرس فتحپوری دہلی کے نام ارقام فرمایا تھا۔

"میرے محترم! دوستوں اور احباب کی وجہ سے ان لمحات عزیزہ کو ضائع کرنا کس قدر بے توفیقی ہے سوچ کر اور غور کرکے اس کو سمجھئے ......

باطن کی پاکیزگی اور اس کے اثرات

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مبعوث ہوئے، جب انسانیت دم توڑ چکی تھی اور انسان جہنم کی آگ میں جلنے اور بھننے لگا تھا، یہ بڑا ہی صبرآزما اور نازک وقت تھا، دنیا بربادی اور تباہی سے دوچار تھی، انسان اپنے مالک حقیقی اور اس کی نعمتوں کو فراموش کر چکا تھا کہ دعائے خلیل کی مقبولیت اور نوید مسیحا کا وقت آیا، حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے دعا کی تھی۔

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم اٰیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم (البقرۃ)

اے ہمارے پروردگار اور بھیج ایک رسول انہی میں کا جو پڑھے ان پر تیری آیتیں اور سکھلائے ان کو کتاب اور حکمت کی بات اور ان کو پاک کرے بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خوشخبری دی تھی۔

یابنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (الصف)

اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں اپنے سے پہلے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا ہوا اور ان رسول کی بشارت سناتا ہوا جو میرے بعد تشریف لائیں گے ان کا نام احمد ہے

رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول تھے اور سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے، آپ نے سارے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور وحدانیت کی دعوت دی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضابطۂ حیات نازل ہوا تھا اس پر عمل پیرا ہونے کی تاکید فرمائی۔

اوپر کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ آیات قرآنی کی تلاوت، کتاب و

حکمت کی تعلیم اور اسی کے ساتھ تزکیۂ قلب (باطن کی صفائی) سونپی گئی، اور آپ نے صحابۂ کرام کو ان تینوں پر عمل کرایا، تلاوت آیات اور کتاب وسنت کی تعلیم تو عام طور پر مدارس دینیہ میں دی جاتی ہے تیسرا کام تزکیۂ قلب کا ۔۔ علماء ومشائخ خانقاہ نے اپنے ذمہ لیا، حدیث میں اسے احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حدیث جبرئیل میں ہے کہ سوال ہوا

فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

(مشکوٰۃ)

مجھے احسان کے متعلق بتایا جائے کہ کیا ہے آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت اسطرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

یعنی بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا وہ رب العلمین کو دیکھ رہا ہے، وہ سامنے موجود ہے، اور رب ذوالجلال کے سلسلہ میں جب یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ بڑی لگن اور احتیاط کے ساتھ اپنے فرائض وواجبات ادا کرنے کی سعی کرتا ہے، اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ بندہ اگر رب العلمین کو حاضر وناظر محسوس نہ کر سکے تو اس کو یقین یہ ہو کہ رب العلمین اس کو دیکھ رہا ہے، اس ذات پاک سے بندہ کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں وہ جس طرح اور جیسے کر رہا ہے اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔

یہ کیفیت مسلمانوں میں علم ویقین کے درجہ میں پہونچنے پر پیدا ہوتی ہے اور اس درجہ تک پہونچنے کے لئے تسبیح وتہلیل، پاس انفاس اور مراقبہ کرایا جاتا ہے اور بڑی مشق وتمرین کے بعد یہ کیفیت راسخ ہوتی ہے، یہ اللہ والوں کی صحبت وتوجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور مسلسل عمل کرنے اور توجہ دینے سے راسخ ہوتی ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تعلیم حاصل کی اور آپ کی توجہ خاص سے صحابۂ کرام کا تزکیۂ قلب بآسانی حاصل ہو گیا، یہی وجہ ہے کہ جو اعتماد علی اللہ، توکل اور خوف وخشیت ان میں تھی وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی اسلام وایمان پر وہ نثار تھے، آل اولاد، اقرباء واحباب کی اسلامی احکام کے مقابلہ میں ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی، غزوات وجہاد میں بخوشی شریک ہوتے تھے اور کامیاب

ہوکر واپس ہوتے تھے، اسلام وایمان کے نام پر سر کٹانا ان کے لئے بڑا سہل ہوگیا تھا، اور ایسی ان کے اندر قوت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ پہاڑ سے ٹکرا جاتے، سمندر اور دریاؤں میں چھلانگ لگادیتے بڑی سے بڑی طاقت کو کچل ڈالنے کے لئے میدان میں نکل آتے تھے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضاجوئی ان کا سب سے بڑا سرمایہ تھا، قرآن پاک نے ان کی اس کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

والذین معہٗ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعًا سجدًا یبتغون فضلًا من اللّٰہ ورضوانا (الحجرات)

جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں نہایت سخت، اور آپس میں رحم دل ہیں، تم انھیں رکوع وسجدہ کرتے ہوئے دیکھوگے وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رضامندی اور خوشی تلاش کرتے ہیں

تاریخ بتاتی ہے کہ صحابۂ کرام جدھر نکل جاتے تھے فتح ونصرت اور کامیابی وکامرانی انکے قدم چومتی تھی، تائید خداوندی ان کے ساتھ ہوتی تھی اور کفار ومشرکین ان کو دیکھ کر مرعوب ہوتے تھے

قاعدہ ہے کہ مربی ومعلم جس پایہ اور جس درجہ کے ہوتے ہیں، ان کے تلامذہ میں بھی وہی خوبو آتی ہے اور وہ بھی بلند پایہ ہوکر نکلتے ہیں، عہد نبوی میں ہزاروں حفاظ پیدا ہوئے اور عہد صحابہ میں حفاظ قرآن کی کمی نہیں تھی، اور اسی کے ساتھ انہیں محبت رسول اور خشیت الٰہی پائی جاتی تھی، جن کا غارتگری کا پیشہ تھا وہ معلم اخلاق بن گئے، بداخلاقیوں کا نام ونشان مٹ گیا، رہزن رہبر بن گئے، بت پرستوں کی اولاد ایثار وہمدردی کے پیکر نظر آنے لگے، اور یہ سلسلہ برابر قائم رہا۔

یہ نگاہ نبوی کے اثرات تھے، عقائد واعمال میں پختگی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور خشیت الٰہی تزکیۂ قلب کے ذریعہ پیدا ہوگئی جس کو اب عوام وخواص بھولتے جارہے ہیں، پہلے انبیاء کرام اور رسل عظام آتے تھے اور رہنمائی کرتے تھے، اب تو ہمارے سامنے کتاب وسنت اور تعلیمات نبوی ہے، علماء جو روشن ضمیر ہوتے ہیں وہ اس راستہ کی رہبری کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر انسانوں کو عہد الست کی یاد دہانی فرمائی، اور اس طرح ان میں جذبہ اخلاص وللّٰہیت پیدا کرنے کی سعی فرمائی، ارشاد ربانی ہے

اذاخذ ربك من بنی آدم	جب آپ کے رب نے عالم ارواح میں اولاد آدم
من ظهورهم ذريتهم	کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے
واشهدهم على انفسهم الست	انھی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں
بربكم قالوا بلى شهدنا	ہوں. سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں آپ
ان تقولوا يوم القيمة	ہمارے رب ہیں ہم سب اس واقعہ کے گواہ
انا كنا عن هذا غافلين	بنتے ہیں تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یہ نہ کہنے
(الاعراف)	لگو کہ ہم اس سے بے خبر تھے ۔

یہاں اس عالمگیر عہد کا ذکر ہے جو خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان ہوا تھا، اور یہ اس وقت ہوا تھا جب انسان اس دنیا میں آیا نہیں تھا اسی کو عہد الست کہا جاتا ہے، یہ روز ازل میں عہد وپیمان ہوا تھا ۔

اس عہد کی تفصیل یہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا ۔

" اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دست قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک انسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے ان کو جنت کیلئے پیدا کیا ہے، اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دست قدرت پھیرا تو جتنے گناہ گار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کھڑا کیا، اور فرمایا ان کو میں نے جہنم کیلئے پیدا کیا ہے اور جہنم میں ہی جانے کے کام کریں گے، صحابہ میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ جب پہلے ہی جنتی اور دوزخی متعین کر دیئے گئے تو پھر عمل کس مقصد کیلئے کرایا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو وہ اہل جنت کے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جنت کا کام ہے

اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوزخ کے لئے بناتے ہیں تو وہ دوزخ ہی کے کام میں لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جہنم کا کام ہے۔"

آدم علیہ السلام کی پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلا واسطہ آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے، پھر ان کی نسل کی پشت سے دوسروں کو اور اسی طرح اس دنیا میں جو اولاد آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے ان کی پشتوں سے نکالا گیا، یہ ارواح چھوٹی چیونٹی کے جثہ میں تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو عقل و شعور سے نوازا تھا اور پھر سوال لیا، کہتے ہیں کہ یہ عہد اس وقت لیا گیا تھا جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے زمین پر اتارے جا چکے تھے، اور یہ مقام عرفات تھا جہاں یہ سوال و جواب ہوا اور جہاں پہلے حضرت آدم کو زمین پر اتارا گیا

اس سوال و جواب میں انسانی قلوب میں معرفت حق کی ایک چنگاری ڈالی تھی جو برابر سلگتی رہی اور اس کے ذہن سے کسی آن زائل نہیں ہوتی، جیسے ہم بچے کے پیدا ہونے کے وقت کرتے ہیں کہ اس کے کانوں میں اذان و تکبیر کی آواز پہونچانے کا اہتمام کرتے ہیں کہ دنیا میں آنے کے ساتھ اس عہد الست کی یاد تازہ ہو جائے اور جب عاقل و بالغ ہو تو اپنے فرائض ادا کرنے کا ان میں جذبہ کردیں لے، اور یاد حق اس کے رگ و ریشہ میں رچ بس جائے

عہد الست کا بیج بھی اسی طرح عالم ارواح میں پرورش پا رہا تھا اور دنیا میں آنے کے بعد اذان کی آواز پہونچا کر اسے تازہ کیا گیا، اور یہی وجہ ہے کہ ہر انسان میں خالق و مالک حقیقی کی عظمت و ہیبت باقی رہتی ہے، کوئی دل اس سے خالی نہیں ہوتا، حدیث نبوی ہے

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ ویمجسانہ،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چاہا کہ جب انسان دنیا میں آکر عقل و شعور کی دولت سے مالا مال ہو جائے تو اس عہد الست کی بیج کو گرمی پہونچا کر برگ و بار لانے کے لائق بنا دیا جائے اور انسان میں ایسی قلبی توانائی آ جائے کہ دنیا کے کام و کاج میں ہوتے ہوئے بھی پروردگار عالم کے احسانات و انعامات کو ایک لمحہ کے لئے فراموش نہ کرے اور اسے رب العزت سے ایسی مناسبت تامہ پیدا ہو جائے کہ جو کام کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ اپنے رب قدیر کے سامنے حاضر ہے اور جو کچھ کر رہا ہے اس کے حکم و ایماء ہی سے کر رہا ہے، انما الاعمال بالنیات کی

حدیث بتاتی ہے کہ دنیا میں انسان جو کام بھی کرتا ہے نیت سے وہ اس کیلئے باعث ثواب بن سکتاہے، تجارت کررہا ہو یا کھیتی کررہا ہو، مزدوری میں مشغول ہو یا صنعت و حرفت میں، پڑھا رہا ہو یا پڑھ رہا ہو، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا اور چلنا پھرنا سب اطاعت خداوندی کا نمونہ بن جائے اور اس کا کوئی لمحہ اطاعت الٰہی سے خالی نظر نہ آئے

سچ پوچھئے تو اسی نظام ربوبیت کا تقاضا تھا کہ انسانوں میں انبیاء کرام بھیجے گئے جنھوں نے انکو رب کائنات کی طرف بلایا اور کفر و شرک سے ڈرایا اور بچانے کی سعی کی، ختم نبوت کے بعد یہ فرائض علماء و مشائخ امت اور دوسرے دینداران امت انجام دے رہے ہیں اور تاقیامت دیتے رہیں گے، بیعت کا سلسلہ اسی کی یادگار ہے، مرشد یہی تو کرتا ہے کہ پچھلے گناہوں سے توبہ کراتاہے اور آئندہ کیلئے وعدہ کراتا ہے کہ فلاں فلاں حرام اور ناجائز کام نہیں کرونگا اور نیک اعمال کی پابندی کروں گا اس وعدہ وعید کے بعد ذکر اللہ کی کثرت کراتے ہیں تاکہ ذہن و فکر میں یہ جم جائے اور چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے اللہ کا دھیان برابر باقی رہے۔

قرآن نے مومن کی شان بیان کی ہے۔

انما المؤمنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم یتوکلون (سورۃ الانفال)	ایمان والے تو وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں انکے ایمان کو زیادہ کردیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

اس آیت میں مؤمن کی صفتیں بیان کی گئی ہیں کہ اللہ کا جہاں ذکر آیا ان کا دل اللہ تعالیٰ کے حضور جھک جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت سے جن کا دل لبریز ہوتاہے وہ موجزن ہوجاتا ہے۔ ایک دوسری آیت میں ہے

و بشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم (الحج ۳۵)	ان متواضع لوگوں کو خوشخبری دیجئے جنکے دل ڈر جاتے ہیں جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتے۔

ایک آیت میں ہے کہ رب العلمین کی یاد سے دل مطمئن ہو جاتا ہے اور یاد کرنے والوں کو سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ۔ خبردار رہو کہ اللہ کی یاد سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

قلب انسانی میں جب ہیبت وخشیت الٰہی جاگزیں ہوگی تو لازماً دل ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوگا اور رجوع الی اللہ سے سکینت پیدا ہوتی ہے، ساری کائنات کا خوف دل سے نکل جاتا ہے اور وہ اپنے کو صرف رب العلمین کا سمجھنے لگتا ہے، سارے وسوسے جاتے رہتے ہیں۔

آدمی جب راہ راست اختیار کرتا ہے اور اپنے کو کچھ وقت کے لئے اللہ تعالیٰ کی یاد کیلئے مخصوص کرلیتا ہے تو اس کے نتیجہ میں صبر وتوکل کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے، اور تھوڑے دنوں کے بعد اس کا رشتہ خالق کائنات سے مضبوط ہو جاتا ہے، گناہوں سے طبیعت متنفر ہونے لگتی ہے۔

توکل کا حاصل یہ ہے کہ انسان پر جو سعی وکاوش ڈالی گئی اس کا بجا لانا تو اس کا فریضہ ہے، یہ صبر وتوکل کے خلاف نہیں ہے مگر اس کے بعد یقین رکھے کہ اس میں کامیابی عطا کرنا رب قدیر کی مرضی پر ہے اور جو ہوگا اس کی مرضی اور مشیت سے ہوگا۔

جب کسی مسلمان میں ہیبت وخشیت خداوندی، ایمان کی مضبوطی اور اللہ تعالیٰ پر بھرپور اعتماد ہو جاتا ہے تو پھر امید اسی کی ہوتی ہے کہ وہ کامیاب ہوکر رہیگا اور اللہ تعالیٰ اس کی دستگیری فرمائے گا۔

اولیاء کرام اور صوفیاء عظام اپنے متوسلین میں یہی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں باقی جو در حقیقت اولیاء اور صوفیاء میں نہیں ہوتے ہیں صرف ان کا بھیس اختیار کرتے ہیں، وہ چونکہ خود اخلاص وللہیت سے خالی ہوتے ہیں، ان کے تحت الشعور میں دنیا طلبی ہوتی ہے اس لئے ان کے ماننے والوں میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی کہ پیرو مرید دونوں خلوص سے دور ہوتے ہیں، تصور خود ان کا ہوتا ہے عمل کا نہیں ہوتا ہے۔ (باقی آئندہ)

****
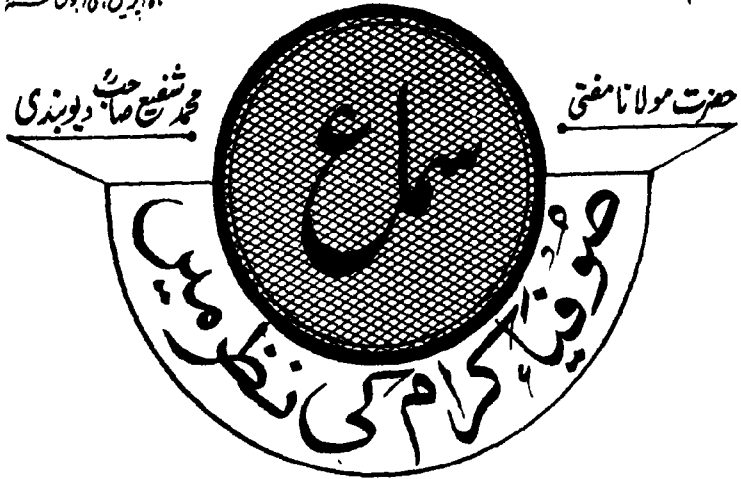
گانے بجانے کے سلسلے میں صوفیار کرام کا صحیح مسلک عام طور پر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے اس لیے ذیل میں اس کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے

امام سہروردیؒ نے جو کبار شافعیہ میں سے ہیں اور صوفیار کے ایک مکتب فکر کے بانی ہیں اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں دو باب مسئلہ غنا پر بھی باندھے ہیں، پہلے باب میں انھوں نے غنا کی گنجائش اور جواز سے بحث کی ہے، اور دوسرے باب میں حرمت و ممانعت بیان کی ہے اس پوری بحث میں فقہار کے اس مسلک سے سرمو تجاوز نہیں کیا ہے کہ غنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، جن میں سے اگر کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو غنا حرام ہے چنانچہ وہ دوسرے باب میں لکھتے ہیں۔

"ہم سماع کے صحیح ہونے کی صورت اور جس حد تک اہل صدق کے لئے سماع مناسب ہے، بتا چکے۔ اب چونکہ سماع کی راہ سے فتنہ عام ہے اور لوگوں میں صالحیت جاتی رہی ہے . . . . اور اس راہ میں وقت برباد ہوتا ہے، عبادات کی لذت کم ہو جاتی ہے، اجتماعات کی چاٹ لگ جاتی ہے، نفسانی خواہشات کی تسکین اور ناچنے گانے والوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے سماع کی محفلیں منعقد کرنے کا شوق بار بار پیدا ہوتا ہے، حالانکہ یہ بات مخفی نہیں کہ اس قسم کے اجتماعات صوفیار کے ہاں ناجائز اور مردود ہیں، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ عارف مکین کے

سوا کسی اور کیلئے سماع صحیح نہیں؛ اور مرید مبتدی کیلئے سماع جائز ہی نہیں۔[1]

غالباً اسی قول کے پیش نظر حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی، جب ان سے سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو یہی جواب دیا کہ

منتہی را باو حاجت نیست و مبتدی را مضر است۔

منتہی کو اس کی ضرورت نہیں، اور مبتدی کے لئے نقصان دہ ہے۔

امام سہروردی آگے لکھتے ہیں:

حضرت جنید بغدادی رح کا قول ہے کہ "جب تم کسی مرید کو سماع کی اجازت مانگتے دیکھو تو سمجھ لو کہ اس میں ابھی کچھ ناکارگی باقی ہے:

کہا جاتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رح نے سماع ترک کر دیا تھا (اور اپنے مریدوں کو بھی اس سے روک دیا تھا) ان سے کہا گیا کہ "آپ تو خود سماع سنا کرتے تھے؟ فرمایا "کن کے ساتھ؟" عرض کیا گیا کہ "خود اپنے لئے سنا کرتے تھے؟" فرمایا "کن لوگوں سے (سنا کرتا تھا)؟"

وجہ یہ تھی کہ وہ حضرات ایسے ہم نشینوں کے ساتھ سماع فرماتے جو سماع کے اہل ہوتے تھے، اور ایسے لوگوں سے سماع سنتے تھے جو گانے کے اہل ہوتے تھے، اسی لئے جب حضرت جنید بغدادی رح کو ہم مزاج ساتھی نہیں ملے تو انھوں نے سماع ترک کر دیا

حقیقت یہ ہے کہ بزرگان دین نے جب کبھی بھی سماع کو اختیار فرمایا، ہمیشہ کچھ حدود وقیود اور شرائط وآداب کا لحاظ رکھا اس کے ذریعہ وہ آخرت کی فکر، جنت کی رغبت اور دوزخ کا خوف پیدا کرتے (دین وشریعت پر عمل کرنے کا) جذبہ اور طلب بڑھاتے اور اپنی (دینی اور اخلاقی) حالت کو بہتر بنانے تھے

علاوہ ازیں سماع سے وہ حضرات بعض بعض اوقات ہی شغل فرماتے تھے، اُسے اپنا مشغلہ اور عادت نہیں بناتے تھے کہ عبادات اور اعمال میں حرج پڑنے لگے۔[2]

---

[1] عوارف المعارف الباب الثالث والعشرون فی القول فی السماع رداً وانکاراً ص ۱۸۰۔ [2] ایضاً ص ۱۸۹

آگے لکھتے ہیں :-

"علمائے شافعیہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غیر محرم عورت سے خواہ وہ باندی ہو یا آزاد، پردے میں ہو یا سامنے سماع جائز نہیں "

امام مالکؒ کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی نے باندی خریدی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ مغنّیہ ہے تو خریدار کو اختیار ہے کہ اس عیب کی بناپر باندی واپس کردے"

یہی رائے تمام اہل مدینہ کی ہے اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا بھی مسلک ہے۔

گانا سننا گناہ ہے، اور سوائے چند فقہاء کے سب اسے ناجائز کہتے ہیں اور جو اسے جائز کہتے ہیں وہ بھی مسجد اور دوسرے مقدس مقامات پر اس کی اجازت نہیں دیتے: لہ

امام موصوف نے اس کے بعد غناء کی کراہت وتحریم پر قرآن وحدیث سے دلائل پیش کئے ہیں پھر لکھتے ہیں۔

"مشہور صوفی اور ولی اللہ، حضرت فضیل بن عیاض کا قول ہے" گانا زنا کا افسوں ہے"۔

اگر کوئی شخص انصاف سے کام لے، اور ہمارے زمانے میں سماع کی محفلوں پر غور کرے، اور مغنی کا دف اور مطرب کا شبابہ لے کر بیٹھنے کو دیکھے، پھر سوچے کہ آیا اس قسم کا اجتماع کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بھی ہوا تھا؟ کبھی صحابہؓ نے بھی قوال اور مغنی کو بلوایا تھا؟ کبھی وہ حضرات بھی کسی مغنی کے گرد اس طرح پروانے بن کر بیٹھے تھے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ جواب انکار ہی میں ہوگا، تو پھر اگر سماع میں ذرا بھی نفع ہوتا اور اس سے کچھ بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا تو یہ حضرات اُسے اس طرح بغیر مس کئے بھی نہ چھوڑ دیتے۔

جو شخص یہ کہے کہ سماع کوئی نیکی اور فضیلت کا کام ہے، جس کے لئے دوڑ دھوپ کی جائے اور محفلیں جمائی جائیں، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے حالات سمجھنے کا بالکل بھی ذوق نہیں۔

لہ عوارف المعارف ص ۱۸۹

بعض متاخرین نے استحسان کا سہارا لے کر سماع کی کچھ گنجائش نکالی ہے مگر افسوس!
اکثر لوگ اس میں غلطی کر جاتے ہیں۔[1]

آگے لکھتے ہیں :

جس وقت محفل سماع میں مغنی بے ریش لڑکا ہو تو فتنہ متوجہ ہوتا ہے، تمام خدا ترس لوگوں کے نزدیک یہ سماع قطعاً حرام ہے، حضرت بقیہ بن ولید کہتے ہیں "اسلاف بے داڑھی کے حسین لڑکے پر نظر ڈالنے کو مکروہ سمجھتے تھے" حضرت عطاءؒ کا قول ہے "جس نظر میں بھی نفسانی خواہش ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں" بعض تابعین فرمایا کرتے تھے کہ "میں کسی تائب نوجوان کے لئے خونناک درندے کو اتنا خطرناک اور مہلک نہیں سمجھتا جتنا ایک بے ریش لڑکے سے اس کی مجالست کو"

خلاصہ یہ کہ جماعت صوفیہ کے لئے اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ اس قسم کی محفلوں سے پرہیز کریں اور مواضع تہمت سے بچیں کیونکہ تصوف تو سراپا صدق و حقیقت ہے، اسے ہرگز ہزل و استہزاء سے نہ ملائیں۔[2]

علامہ ابن حجرؒ "کف الرعاع" میں لکھتے ہیں :

قرطبیؒ نے امام طرطوسیؒ سے نقل کیا ہے کہ ان سے بعض لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو ایک جگہ بیٹھ کر پہلے قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے بعد ایک شخص اٹھ کر اشعار گاتا ہے پھر سب مست ہو کر رقص کرتے ہیں اور دف اور شبابہ بجاتے ہیں (اس طرح قرآن خوانی کی مجلس رقص و سرود کی محفل بن کر رہ جاتی ہے) کیا ایسے لوگوں کے ساتھ شریک ہونا جائز ہے۔؟

آپ نے جواب دیا کہ : اکابرین صوفیاء کے نزدیک ایسا کرنا غلط کاری اور گمراہی ہے اسلام تو نام ہے صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔[3]

---

[1] عوارف المعارف، ص ۱۸۹ ۔ [2] عوارف المعارف بہامش الاحیاء ج ۲ ص ۲۲۱ ۔
[3] کف الرعاع بہامش الزواجر ج ۱ ص ۵۱ ، مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد اور اصول دو چیزیں ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ، اور یہ رقص و سرود کی محفلیں کتاب و سنت سے کہیں ثابت نہیں۔

آگے (یہ لکھنے کے بعد کہ رقص وسرود تو دراصل سامری کی ایجاد ہے، نیز صحابہ کرام رضی محفلیں تو اس قدر پروقار ہوتی تھیں کہ جب وہ بیٹھتے تو اتنے سکون سے بیٹھتے تھے کہ گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں جو ذرا حرکت سے اڑ جائیں گے) لکھتے ہیں۔

جو شخص بھی خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے ہرگز جائز نہیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ شریک ہو اور ان کی اس ناجائز کام میں معاونت کرے، یہی ائمہ اربعہ اور دوسرے مجتہدین کا مذہب ہے۔

بعض لوگ مشائخ کی حکایات اور ان کے افعال سے رقص وسرود کی اباحت پر استدلال کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بھی (وجد میں آکر معمولی درجہ میں ہاتھ پیر ہلانے) کے جواز کے منکر نہیں، صرف ہیجڑے اور ہیجڑے پن کو ناجائز کہتے ہیں، آخر یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ مشائخ کرام رح (رقاصاؤں کی طرح) ناچتے، لہراتے اور بل کھاتے تھے چلتے! اگر مان لیں کہ انھوں نے رقص کیا ہے، تو بتائیے آخر کہاں سے معلوم ہوا کہ (دل نرما دینے اور ایمان اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والے اشعار سن کر) وہ حضرات اس وقت اپنے آپے میں ہوتے تھے، اور وجد انھیں مجبور اور بے اختیار نہیں کر دیتا تھا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم ان حکایتوں اور قصّوں کو صحیح نہیں مانتے جن میں رقص وسرود کی نسبت ان بزرگوں کی طرف کی گئی ہے، بہت ممکن ہے کہ جس طرح زندیقوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کو نہ چھوڑا اور لاتعداد من گھڑت باتیں اور احادیث ان کی طرف منسوب کر دیں، اسی طرح انھوں نے یہ حکایات اور قصص بھی اپنی طرف سے گھڑ کر ان بزرگوں کی طرف منسوب کر دیئے ہوں۔

اور اگر بفرض محال ان حکایات کو صحیح مان لیں اور تسلیم کر لیں کہ ان حضرات نے یہ حرکات اپنے قصد و اختیار سے کی تھیں تو بھی ہمارے لئے سند صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے بعد صحابۂ کرام اور ائمہ مجتہدین کا عمل ہے، اور ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ ان کا عمل ہرگز ... تھا۔

آگے لکھتے ہیں:-

کتنی پیاری بات ہے جو امام العارفین قدوۃ العلماء ابو علی رودباری نے کہی ہے، ان سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص آلات موسیقی سے لطف اندوز ہوتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لئے حلال ہے کیونکہ میں اتنا پہونچا ہوا ہوں کہ احوال کا اختلاف مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتا: آپ نے جواب دیا، ہاں، وہ پہنچا ہوا ہے، لیکن کہاں؟ جہنم میں"

کچھ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ:-

یمن کے بعض ائمہ فرماتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے زمانے میں رائج سماع کا سوال ہے سو وہ بلاشبہ حرام ہے، کیونکہ اس میں منکرات ہوتے ہیں، عورتوں اور مردوں کا آزادانہ خلا ملا ہوتا ہے اور عوام اس کی وجہ سے ان گنت لغویات میں مبتلا ہوتے ہیں، لہذا حاکم (کے فرائض میں شامل ہے اور اس) پر واجب ہے کہ لوگوں کو سماع سے روکے:" (کف الرعاع ملخصاً علی ہامش الزواجر ج ۱، ص ۶۰)

صاحب "اقتباس الانوار" نے حضرت بختیار کاکیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے "سیر الاقطاب" سے ایک قول نقل کیا ہے، جس کی نسبت قاضی حمید الدینؒ ناگوریؒ[1] کی طرف کی گئی ہے، پھر اس قول کی نسبت پر جرح کی ہے، لیکن وہ قول دین و شریعت کے قوانین کے عین مطابق ہے اس لئے بجائے خود قابل قبول ہے، ہم ذیل میں "اقتباس الانوار" کی اصل عبارت مع اس قول کے نقل کرتے ہیں۔

(مجلس میں) قاضی حمید الدین بھی موجود تھے، کہنے لگے میں حمید الدین، سماع سنتا ہوں، اور علماء کے قول کے بموجب اسے حلال کہتا ہوں، کیونکہ میں مریض ہوں اور درد دل میں مبتلا ہوں جس کا علاج صرف سماع ہی ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ایسے مریض کا علاج شراب سے کرنا جائز قرار دیا ہے جس کے مرض کا علاج کسی دوسری دوا سے نہ ہو سکے، نیز اطباء کا بھی اتفاق ہو کہ مریض اس دوا سے صحت مند ہو جائے گا اسی بنیاد پر کہ میرے درد لا دوا کا علاج صرف سماع ہے سماع کا سننا بھی میرے لئے جائز ہے جبکہ تمہارے لئے حرام ہے[2]

---

[1] شیخ رکن بن حسام ناگوری نے اپنے فتاویٰ "حمادیہ" میں ان کا نام حماد الدین نقل کیا ہے، واللہ اعلم (مصنف)
[2] السنۃ الجلیہ ص ۸۲ -

علامہ سجزی ؒ نے اپنی کتاب " فوائد الفواد " میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ :۔

" ۸ رشوال ۷۱۹ھ کی تاریخ تھی، حضرت (نظام الدین اولیاء) کی مجلس ہو رہی تھی اور سماع کا مسئلہ زیر گفتگو تھا، حاضرین میں سے ایک صاحب نے حضرت سے عرض کیا " آپ کے لئے تو جب چاہیں سماع مباح ہو جائے، اس لئے کہ یہ آپ کے لئے (بالکلیہ) حلال ہے : حضرت ؒ نے فرمایا : نہیں، جو چیز حرام ہوتی ہے وہ کسی ایک کے لئے بھی حلال نہیں ہوتی. اور جو چیز حلال ہوتی ہے وہ کسی شخص کے کہنے سے حرام نہیں ہو جاتی بلکہ دراصل تحقیق یہ ہے کہ سماع ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے چنانچہ امام شافعی ؒ نے دف کے ساتھ سماع کو جائز قرار دیا ہے جبکہ ہمارے مشائخ حنفیہ ؒ نے اس کی بھی اجازت نہیں دی، اور ضابطہ یہ ہے کہ قضا اور حکم حاکم سے مسائل مجتہد فیہ میں موجود اختلاف رفع ہو جاتا ہے اور اس صورت میں حاکم خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اسی کی بات مانی جائے گی [1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ " اخبار الاخیار " میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کہ حضرت نظام الدین اولیاء ؒ کے سب سے بڑے خلیفہ ہیں، لکھتے ہیں۔

" منقول ہے کہ ایک دن حضرت نظام الدین اولیاء کے کچھ مریدین نے ایک مجلس منعقد کی اور عورتوں کے دف سے گانا سننے لگے . شیخ نصیر الدین محمود ؒ بھی اسی مجلس میں موجود تھے، آپ نے جب یہ ماجرا دیکھا تو اٹھ کر مجلس سے باہر جانے لگے، مگر آپ کے ساتھی وہیں بیٹھے رہے، آپ نے فرمایا " یہ خلاف سُنّت فعل ہے " ان لوگوں نے جواب دیا کیا آپ سماع کا انکار کرتے ہیں اور اپنے پیر کے راستے کو چھوڑتے ہیں ؟ " شیخ نے جواب دیا " کسی کا عمل حجت نہیں " (چنانچہ اگر میرے پیر سماع کرتے ہوں تو کیا کریں ان کا سماع فرمانا حلت سماع کیلئے دلیل نہیں کیونکہ) حجت صرف کتاب وسنت ہی ہیں۔

---

[1] تکملہ ص ۲۸، ۲۹، و فوائد الفواد ص ۲۲۳، ۲۲۴ -

بعض غرض مندوں نے یہ بات حضرت نظام الدین اولیاء تک پہونچا دی کہ شیخ محمود تو ایسا ایسا کہہ رہے تھے، حضرت نظام الدین اولیاء نے جو شیخ محمود کے خلوص وصدق سے بخوبی واقف تھے، جواب دیا: "محمود ٹھیک کہتے ہیں، حق بات وہی ہے جو انھوں نے کہی":

"سیرالاولیاء" میں لکھا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کی مجلس میں نہ باجے بجتے، نہ تالی پیٹی جاتی۔ بلکہ اگر کوئی مرید باجے تاشے قسم کی کوئی چیز سننے کے لئے بھی جاتا تو آپ اسے منع کر دیتے اور فرماتے۔ "یہ اچھا نہیں کیا":

"خیرالمجالس" میں ہے کہ شیخ نصیرالدین محمود رہ کی خدمت میں ایک عزیز آیا اور کہنے لگا۔ بتائیے! یہ کہاں سے جائز ہے کہ محفل میں باجے، دف نائے اور رباب وغیرہ ہوں اور صوفیاء رقص کریں؟" شیخ نے جواب دیا کہ "باجے باجماع ناجائز ہیں، (دیکھو) اگر سلوک کے کسی ایک طریق کو چھوڑو گے (اور دوسرا اختیار کروگے) تو کم از کم شریعت میں تو رہو گے، اور اگر شریعت کو چھوڑو گے تو کہاں جاؤ گے؟ اور پھر اختلاف تو صرف سماع کے بارے میں ہے کہ بعض علماء کے نزدیک سماع چند شرائط کے ساتھ اہل حضرات کیلئے مباح ہے، جہاں تک باجوں کا تعلق ہے وہ تو باجماع حرام ہیں۔[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رہ نے "فرع الاسماع" میں لکھا ہے کہ۔

شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کے مریدین کہتے ہیں کہ "ہمارے شیخ کا فرمان ہے کہ جو شخص راگ کو باجوں کے ساتھ سنے وہ ہماری بیعت وارادت سے نکل گیا۔[2]

شیخ علی بن محمد جاندار رہ نے جو حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں سے ہیں" درر نظامیہ" میں لکھا ہے:

شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کہتے ہیں کہ سماع کی چار قسمیں ہیں، حلال، حرام مکروہ اور مباح، ان میں سے مباح کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔

(۱) مغنی مرد کامل ہو نہ امرد ہو نہ عورت۔

(۲) سامع اللہ والا ہو نفس پرست نہ ہو۔

(باقی بر صفحہ ۲۱۷)

---

[1] السنۃ الجلیہ ص ۵۵، ۵۶ واخبار الاخیار ص ۸۰۔ [2] السنۃ الجلیہ ص ۵۷ وفرع الاسماع ص ۳۹۔

تصوف کی تعریفیں مشائخ کی کتابوں میں بکثرت ملتی ہیں لیکن ان تعریفوں کی بنا پر صوفیائے کرام کے مقاصد کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، حضرت شیخ ابوالحسن فوشنجہ رحمہ فرمایا کرتے تھے :

التصوف الیوم اسمٌ ولا حقیقتہ	تصوف آج کل ایک بے حقیقت نام ہے
وقد کان حقیقتہ ولا اسمٌ [1]	اس سے پہلے حقیقت بلا نام کے تھا

اس لئے مناسب یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ خود صوفیہ کرام کی زندگی میں تصوف کے معنی تلاش کئے جائیں اور ان کے مقاصد کا تعین اسی کی بنا پر کیا جائے

محبت الٰہی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمہ ایک خط میں مولانا فخرالدین مروزی رحمہ کو لکھتے ہیں۔

اتفاق اصحابِ طریقت و ارباب حقیقت است	اصحاب طریقت اور ارباب حقیقت کا اس باب
کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر	میں اتفاق ہے کہ انسان کی پیدائش کا اہم مطلوب
محبت رب العلمین است۔ [2]	اور بڑا مقصود رب العلمین کی محبت ہے

ضروری ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی روشنی میں محبت الٰہی کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھا جائے، قرآن میں ایمان کی سب سے بڑی علامت اور خاصیت محبت الٰہی کو قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (بقرہ - ۳۰)	اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

---

[1] کشف المحجوب، ص ۷۷، (اردو ترجمہ) [2] سیر الاولیاء۔ ص ۲۵۵، ۲۵۲۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی محبت الٰہی میں سرشاری کی زندگی تھی، آپ دعا فرمایا کرتے تھے

اَللّٰھُمَّ اجعل حُبّك احبَّ اِلَیَّ من نفسی واھلی ومِنَ الماءِ البَارِدِ۔ (ترمذی)

الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے میرے اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

صوفیہ کا کہنا ہے کہ محبت ہی راز حیات ہے، اگر اس کی آگ دل میں نہ ہو تو وہ گوشت کا ایک بے جان ٹکڑا ہے اگر عشق کی گرمی ہو تو انوار ربانی کا محل ہے

سلامتی دِل عشاق از محبت تست
دگرنہ ایں دِل پر خوں چہ جائے منزل تست

محبت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی زندگی سمٹ کر ایک مرکز پر آجائے، اس کا بال بال یہ پکارنے لگے۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے۔

اس کو ایک لمحہ بھی بغیر اللہ کے چین نہ ملے، شبلی رحمہ کا یہ قول اس کے حالات کا آئینہ دار بن جائے۔

الفقیر من لا یستغنی بشئ دون اللّٰہ

فقیر سوائے حق کے کسی چیز سے آرام نہیں پاتا[۱]

وہ عملاً اس ارشاد خداوندی کی تفسیر ہو۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔

میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں

اس کے نفس کے تقاضے خاموش ہو جائیں رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو وہ اپنے لئے رہنا چھوڑ دے خدا کے لئے جینے لگے۔

خدا کے لئے جینا

کہنے تو ایک معمولی سا جملہ ہے، لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارتقاء انسانیت کی آخری منزل یہی ہے "خدا کیلئے

[۱] کشف المحجوب ص۱۰

جینے" کے معنی یہ نہیں کہ انسان دنیا و مافیہا سے قطع تعلق کرے اور ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کرنے لگے، وہ شادی بھی کرے، کھائے بھی، اللہ کی مخلوق سے ملے بھی، لیکن اس طرح کہ وہ علائق کے ہجوم اور تعلقات کے ازدحام میں گرفتار ہوکر اپنے معبود حقیقی کو بھول نہ جائے، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے مستفید ہو لیکن دنیا کی محبت اس کے دل میں جگہ نہ حاصل کرنے پائے، وہ ہر کام میں رضائے الٰہی کا طلبگار ہو۔ خدا کیلئے جینا نیت کا ایک زبردست انقلاب ہے، ایسا انقلاب جو انسانی زندگی کے مرکز و محور کو بدل دیتا ہے انسان کا ہر کام کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل کیلئے ہونے لگتا ہے وہ دنیا کا ہر کام کرتا ہے لیکن اس کی نیت عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے

جب زندگی اس طرح بسر کی جائے تو اس کی اساس ہی بالکل بدل جاتی ہے، انسان کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے، عبادت کے اسی مفہوم کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح سمجھایا کہ ایک مرتبہ حضرت سعدؓ نے ارادہ کیا کہ اپنی ساری دولت راہ خدا میں دے دیں، تو فرمایا: اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مقصود ہے اس کا تمکو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منھ میں دو اس کا بھی ثواب ہے ایک مرتبہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو مسعود انصاری سے فرمایا: مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔

یہ ھے خدا کیلئے جینا اور یہ ہے نیت کا وہ انقلاب جو انسان کی زندگی میں ایک بنیادی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔

جب خدا کے لئے جینے کا یہ وسیع مفہوم تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان کا ہر دنیوی کام عبادت بن جائے بلکہ اس کی پوری زندگی ہی عبادت الٰہی ہو جائے، ویسی ہی عبادت جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ	میں نے جنوں کو اور انسانوں کو اسی لئے
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔	پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں

صوفیاء کا کہنا ہے کہ زندگی صرف وہی ہے جو یاد حق میں بسر کی جائے باقی سب سراب ہے اور دھوکا۔ حضرت محبوب الٰہی رہ فرمایا کرتے تھے کہ زندگی تو عبادت ہی یاد حق سے ہے "حیات آنست کہ درویش بذکر حق مشغول باشد"[۱]

---

[۱] فوائد الفواد ص۲۱

محبت الٰہی کا اثر انسانی زندگی پر

محبت الٰہی کا جذبہ جب انسان کے دل میں گھر کر لیتا ہے تو فکر و عمل کا کوئی گوشہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

(۱) محبت الٰہی کا سب سے بڑا اور گہرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں۔ مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے، یہ مرکزیت نظام ربوبیت کی ایک شان اور خدا کی وحدانیت پر کامل ایمان کا لازمی نتیجہ ہے شرک انسانی فکر و عمل کی مرکزیت کو فنا کرتا ہے اس لئے کوئی انسانی گناہ اس سے بڑھ کر شدید نہیں ہو سکتا پھر جو چیز اس مرکزیت کو جو ایمان کی اصلی شان ہے برقرار ہی نہیں بلکہ صحیح معنی میں پیدا کرتی ہے وہ محبت ہے۔

(۲) اللہ سے سچی محبت کا رشتہ رکھنے والا انسان ہر وقت اپنے آپ کو اس کی بارگاہ میں پاتا ہے، خدا کی موجودگی کا یقین اس کو اس طرح سے ہوتا ہے گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، میر خورد رہ نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خدا کی طرف اس محویت کے ساتھ متوجہ رہتے تھے گویا اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

جب انسان، ذات باری تعالیٰ کو اس طرح اپنے نزدیک محسوس کرنے لگتا ہے تو معصیت کی تمام راہیں اس کی زندگی میں بند کر دی جاتی ہیں، وہ گناہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ مالک یوم الدین، کا دربار ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، وہ اپنے محبوب میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ گناہ کرنے کی فرصت ہی اس کو نہیں ملتی۔

حضرت شیخ علی ہجویری رہ نے لکھا ہے کہ صرف یہ علم کہ خدا دیکھ رہا ہے انسان کو معصیت سے روکتا ہے [۱]

چوں بندہ عالم بود کہ خداوند بدو ناظر است، کارے نکند کہ ازو شرم دارد بقیامت [۱]	جب بندہ یہ بات یقین کی رو سے جان جائیگا کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے تو وہ ہرگز ایسا کام نہ کرے گا جس سے اس کو قیامت کے دن خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے

لیکن جب معبود حقیقی کی ذات ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہو، تو زندگی کے انقلاب کا اندازہ

[۱] کشف المحجوب ص۱۰

لگانا مشکل ہے۔

(۳) جب محبت الٰہی کا پوری طرح غلبہ ہوتا ہے تو انسان کی نظر میں سونا اور پتھر برابر ہوجاتا ہے[1]، مادی دنیا کی کششیں اس کے لئے بے اثر ہوجاتی ہیں

(۴) جب محبت الٰہی اس درجے پر پہونچ جائے کہ

وکلت الی المحبوب امری کله   فان شاء احیانی وان شاء اتلفا

میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالے کیا خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔

تو انسان میں توکل واستغناء کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جب دنیا کی جاہ وحشمت، دولت وثروت اس کے سامنے آتی ہے تو وہ یہ کہکر منہ موڑ لیتا ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ۔ کیا اللہ بندے کیلئے کافی نہیں۔

اللہ کی ربوبیت پر کامل ایمان رکھنے والا انسان اپنے رزق کی طرف سے بے نیاز ہوجاتا ہے وہ اللہ کے اس وعدے پر پورا یقین رکھتا ہے کہ

مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔	جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کیلئے راستہ نکالتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتا ہے جہاں کسی کا سان وگمان بھی نہیں ہوتا جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہے۔

یہی وہ یقین ہے جو اس کو دارا وسکندر سے اونچا اٹھا دیتا ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا وجم

کشف المحجوب میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ جواب دیا: میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں، بادشاہ نے کہا، یہ کیا کہا، غلاموں کا غلام کیسا جواب دیا

مرا دو بندہ اند، کہ آں ہر دو خداوندان تو اند یکے حرص و دیگر امل[2]	میرے دو بندے ہیں اور وہ دونوں تیرے آقا ہیں، ایک حرص دوسرے امید۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ۱۲۸/۲ ۔ [2] کشف المحجوب ص۱۰۱

انسانی کردار کے نشوونما اور تشکیل میں اس احساس کا کہ وہ اپنی روزی کے لئے کسی دنیوی طاقت کا محتاج ہے بڑا مہلک اثر پڑتا ہے "تعمیر خودی" اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک انسان اپنے پورے ایمانی جذبہ کے ساتھ حق تعالیٰ کو اپنا روزی رساں نہ مان لے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر اللہ کی محبت انسان کے دل میں جاگزیں ہوجائے تو اس کی زندگی کا سانچہ ہی بدل جائے، فکر و عمل کی بلندی، خدمت خلق، راست بازی اور سچائی — کتنی خوبیاں ہیں جو صرف اسی جذبہ کا نتیجہ ہیں۔

محبت الٰہی کی عملی راہ یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ کی محبت ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندے کے لئے خدا کی محبت کی عملی راہ کیا ہے؟ — مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں۔

خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گذری ہے، جو انسان چاہتا ہے خدا سے محبت کرے، اسے چاہئے، خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے

وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ (۲: ۱۷۷) — اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں نکالتے اور خرچ کرتے ہیں۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا۔ (۷۶: ۸) — اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا یہ کھانا کھلانا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لئے ہے نہ تو ہم تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں، نہ کسی طرح کی شکرگذاری"[1]

احادیث نبویؐ میں متعدد جگہ محبت کی عملی راہ پر زور دیا گیا ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۔ قیامت کے دن ایسا ہوگا کہ خدا ایک انسان سے کہے گا، اے ابن آدم! میں بیمار ہوگیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ متعجب ہو کر کہے گا کہ بھلا ایسا کیونکر ہوسکتا ہے اور تو تو رب العٰلمین ہے، خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول ص۱۵۸

تیرے قریب بیمار ہوگیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی، حالانکہ اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا (یعنی اس کی خدمت کرنے ہی میں میرے لئے خدمت گذاری تھی) اسی طرح خدا فرمائے گا اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو؟ خدا فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کردیا تھا اگر تو اسے کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"[1]

حضرت براء بن عازب رضؓ سے روایت ہے کہ ایک بدوی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھائیے جو مجھے جنت میں لے جائے، فرمایا:

"انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کرسکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کرسکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک"[2]

صوفیۂ کرام نے محبت الٰہی کی اس عملی راہ کو اختیار کیا تھا، ان کی زندگیاں خدمتِ خلق کے لئے وقف تھیں، وہ دن رات انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرونے کے لئے بے چین رہتے تھے، کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو دل پریشان ہوجاتا، بھوکوں کا خیال آتا تو لقمے حلق میں اٹکنے لگتے۔ ملفوظاتِ مشائخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ خدمتِ خلق کو ان بزرگوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ بنالیا تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی چیز کی قدر نہ ہوگی[3] حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس حقیقت کو مختلف انداز میں متعدد جگہ سمجھایا ہے، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

طاعت دو طرح کی ہوتی ہے لازمی اور متعدی، لازمی وہ ہے جس کا نفع صرف کرنے والے کی ذات کو پہونچے، اور یہ نماز، روزہ، حج، ورد اور تسبیح ہے متعدی وہ ہے جس سے اوروں کو فائدہ پہونچے، انفاق، شفقت، غیر کے حق میں مہربانی کرنا وغیرہ اسے متعدی طاعت کہتے ہیں، اس کا ثواب بے شمار ہے[4]

---

[1] مسلم عن ابی ہریرہ [2] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یود جارہ ج۳ [3] سیرالاولیاء ص۱۲۸ [4] فوائد الفواد ص۱۳-۱۴-

خود حضرت محبوب الٰہی رح کی حیاتِ طیبہ اس طاعت متعدی کی بہترین مثال ہے۔ حضرت بابا فرید رح کے ایک عزیز خواجہ عزیز الدین ایک دعوت میں شرکت کرنے کے بعد حضرت محبوب الٰہی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ رح نے دریافت کیا، کہاں تھے عرض کیا ایک دعوت میں گیا تھا وہاں لوگ یہ کہتے تھے۔

خدمت شیخ نظام الدین عجب فراغ باطنی دارد، اورا ہیچ غمے داندیشۂ ایں جہان نیست

شیخ نظام الدین رح کو بڑا فراغ باطنی حاصل ہے انھیں اس جہان کا کوئی غم اور فکر نہیں ہے۔

حضرت محبوب الٰہی رح نے فرمایا۔

ایں قدر غم و اندوہ کہ مراہست ہیچ کس را دریں جہاں نیست، زیراکہ چندیں خلق می آیند و غم و اندوہ خویش می گویند، آں ہمہ بر دل وجان من می نشیند عجب دلے باشد کہ غم برادر مسلماں بشنود و دروے اثر نکند[1]

جس قدر غم و اندوہ مجھے رہتا ہے کسی کو اس جہان میں نہ ہوگا اس واسطے کہ اتنی مخلوق میرے پاس آتی ہے اور اپنے رنج اور تکلیف بیان کرتی ہے ان سب کا بوجھ میرے جان و دل پر پڑتا ہے وہ عجب دل ہوگا جو مسلمان بھائی کا غم سنے اور اس پر اثر نہ ہو۔

حضرت محبوب الٰہی رح کی پوری زندگی خلق کی اسی دردمندی میں گزری، وہ اپنے پرائے سب کا غم کھاتے تھے، ہر شخص کی پریشانی کو دور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، لوگ جب اپنی درد بھری داستانیں سناتے تو ان کا دل بے چین ہو جاتا، جس طرح ممکن ہوتا ہر آنے والے کی دل جوئی کرتے، دشمن برا بھلا کہتے، گالیاں دیتے، لیکن ان کے دل پر میل نہ آتا بلکہ یہ شعر گنگنانے لگتے۔

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد
ہر کہ خارے افگند در راہ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد[2]

ان کا یقین تھا کہ اگر برائی کا بدلہ برائی ہی سے دیا جائے تو یہ دنیا انسانوں کی بستی نہ رہے۔

---

[1] خیر المجالس قلمی نسخہ مجلس سی ودوم۔ [2] فوائد الفواد ص۸۳ سیر الاولیاء ص۵۵۵

ایک دن فرمانے لگے :۔

یکے خار ہند و تو ہم خار نہی
ایں خار خار باشد میاں
مرداں ہم چنیں است کہ با نغزاں
نغزی با کوزاں کوزی امامیاں
درویشاں ہم چنیں نیست کہ با نغزاں
نغزی با کوزاں ہم نغزی۔ [1]

اگر کوئی کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے عوض کانٹا رکھے تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے عام لوگوں میں تو یہ دستور ہے کہ نیک کے ساتھ نیک اور بد کے ساتھ بد ہوتے ہیں لیکن درویشوں میں یہ دستور نہیں یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہئے۔

صوفیہ اور تعلیم اخلاق

خدمت خلق کے معنی صرف یہ ہی نہیں کہ چند بھوکوں کا پیٹ بھر دیا جائے یا چند حاجت مندوں کی ضرورت کو پورا کر دیا جائے بلکہ اس سے زیادہ اہم بھی ایک کام ہے اور وہ یہ کہ لوگوں کو برائی سے روکا جائے اور بھلائی کی طرف بلایا جائے، مسند میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا۔

میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔

بنی نوع انسان کے اخلاق کی درستگی کے لئے جدوجہد وہ کام ہے جس کے لئے پیغمبر مبعوث کئے گئے ہیں۔ قرآن میں پیغمبرانہ فریضہ کے متعلق فرمایا جاتا ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۔ پیغمبر اُن اَن پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا ہے اور انکو کتاب حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث قدسی میں جگہ جگہ انسانی اخلاق کی درستگی کی ضرورت اور اہمیت کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، سورۂ بقرہ میں ہے۔

"نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو بلکہ اصلی نیکی اسکی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی

[1] فوائد الفؤاد صفحہ

خواہش کے باوجود (یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کو آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا، اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں، یہی ہیں جو راستباز ہیں، اور یہی تقویٰ والے ہیں

ارشاد نبوی ہے کہ مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے (اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا) تمام مذہبی عبادات کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان میں اچھے اخلاق پیدا ہوں، حدیث شریف میں ہے جس کی نماز اس کی برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے[1]

ایک جگہ فرمایا جاتا ہے کہ انسان حسن خلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجۃ قائم اللیل وصائم النہار۔

تصوف کی تعریفوں کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر تعریفیں ایسی ہیں جن میں تصوف کو اخلاق سے تعبیر کیا گیا ہے، مشائخ کے نزدیک تصوف کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے اور دنیا کے دوسرے بسنے والوں کو مادی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک وصاف کرے، بنی نوع انسان کے ساتھ تعلقات میں شگفتگی پیدا کرنا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا، برائی سے بچانا، بھلائی کی طرف بلانا یہ وہ کام ہیں جو عبادت سے زیادہ اہم ہیں، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے،

> بہت نماز پڑھنا اور وظائف میں بکثرت مشغول رہنا قرآن مجید کی تلاوت میں بہت مصروف رہنا یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں، ہر باہمت شخص کر سکتا ہے بلکہ ایک ضعیف بڑھیا بھی کر سکتی ہے، روزہ پر مداومت کر سکتی ہے، تہجد گذاری میں مصروف رہ سکتی ہے، قرآن مجید کے چند پارے پڑھ سکتی ہے، لیکن مردان خدا کا کام کچھ اور ہی ہے[2]

مشائخ متقدمین کی نظر میں تصوف ایک اخلاقی پروگرام کا نام تھا جس میں اپنے نیز دوسروں

---

[1] احیاء العلوم، امام غزالی۔ [2] سیر الاولیاء ص۳۴۵۔

کے اخلاق کی درستگی کو زندگی کا سب سے اہم فرض سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شیخ ابوالحسنؒ کا قول ہے

لیس التصوف رسوما ولا علوما ولکنہ اخلاق[1]	تصوف رسوم اور علوم کا نام نہیں ہے، بلکہ اخلاق کا نام ہے۔

حضرت شیخ محمد بن قصابؒ کہا کرتے تھے۔

التصوف اخلاق کریمۃ ظہرت فی زمان کریم من رجل کریم مع قوم کریم[2]	تصوف اخلاق کریمہ ہیں جو بہتر زمانہ میں بہتر شخص سے بہتر قوم کیساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔

حضرت محمد بن علی بن حسین بن علیؓ بن ابی طالب کا قول ہے۔

تصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف[3]	تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے یعنی جو شخص زیادہ کرتا ہے صوفی زیادہ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ مرتعشؒ فرماتے ہیں:

التصوف حسن الخلق[4]	تصوف خلق نیک کا نام ہے۔

حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ فرمایا کرتے تھے کہ تصوف راہ صدق واخلاق حسنہ کا نام ہے[5]

صوفیاء کرام کے حالات زندگی اور تصوف کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی تصوف نفوس انسانی کو مادی نجاستوں سے پاک کرنے اور اعلیٰ اخلاق و کردار پیدا کرنے کی ایک عظیم الشان تحریک تھی، صوفیہ نے کار نبوی کو جاری رکھا اور بنی نوع انسان کے اخلاق و اطوار فکر و عمل کو درست کرنے کی کوششیں کیں، مشائخ متقدمین کے ملفوظات تعلیم اخلاق کی سلسبیل و کوثر ہیں جن کی خاموش روانی دلوں کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہیں اور دلوں میں اچھے عمل کا جذبہ اور ولولہ جوش مارنے لگتا ہے، ان بزرگوں کی کوشش صرف یہی نہ تھی کہ انسان کے ظاہری اعمال درست ہوجائیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ برائی کے سوت ہی بند ہوجائیں۔ انسان کا دل برائی کی طرف راغب ہی نہ ہو کہ دل کی نجاست جسم کی نجاست سے بدرجہا بری ہے۔

حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ فرمایا کرتے تھے۔

جنابت بر دو نوع است، جنابت	جنابت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک جنابت

---

[1] کشف المحجوب، [2] رسالہ قشیریہ، [3] کشف المحجوب، [4] ایضاً، [5] خیر المجالس مجلس ۱۱ قلمی نسخہ

دل است وجنابت تن۔ وجنابت تن از صحبت با زن حاصل شود وجنابت دل بصحبت ناہموار جنابت تن پاک بآب شود، اما جنابت دل بآب دیدہ محو گردد[1]

دل کی، دوسری جنابت بدن کی، بدن کی جنابت وہ ہے جو عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے حاصل ہو، اور دل کی جنابت نالائقوں کی صحبت سے ہوتی ہے بدن کی جنابت تو پانی سے پاک ہوجاتی ہے لیکن دل کی جنابت آنسوؤں سے دھوئی جاتی ہے۔

صوفیہ کرام کی زندگیوں کا جو پہلو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے وہ ان کی تعلیم اخلاق ہے، جن مصنفین نے اوراد و وظائف اور کشف و کرامات کے افسانوں کو مرکزی اور بنیادی حیثیت دے دی ہے انھوں نے تصوف کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کردی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف نام ہی خدمت خلق اور تعلیم اخلاق کا ہے، ہمارے مشائخ متقدمین نے اس کو یہی سمجھا تھا اور اسی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔

ارتقاء روحانی

محبت الٰہی، خدمت خلق، تعلیم اخلاق، ان سب کا نتیجہ کیا ہے، صوفیہ کا کہنا ہے کہ ان سب کا نتیجہ ارتقاء روحانی ہے، ارتقاء روحانی کی وضاحت مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنئے کہ اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں، فرماتے ہیں۔

"فی الحقیقت وہ قانون ارتقاء جو لامارک، ہکسیر، ابن مسکویہ، اور ڈارون نے دریافت کیا ہے صرف مخلوقات کے جسم ہی تک محدود ہے، وہ کچھ نہیں بتلاتا کہ ارتقاء کی یہ زنجیر ہیکل انسانی کی کڑی تک پہونچ کر پھر کہاں چلی جاتی ہے، اور اس کے بعد ارتقاء کے منازل باقی رہتے ہیں یا نہیں؟ لیکن وہ قانون ارتقاء جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا وہ بتلاتا ہے کہ بلاشبہ انسانیت کے مرتبہ تک پہونچنے کے بعد "ارتقاء جسمی" تو ختم ہوجاتا ہے، لیکن اس کے بعد ایک "ارتقاء روحانی" کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور جسم حیوانی کو انسان کا ہیکل اختیار کرنے کے بعد بھی انسان بننے کیلئے بہت کچھ بننا اور ترقی کرنا باقی رہتا ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور جن

---

[1] اخبار الاخیار ص ۴۲۔

وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۸ : ۱۱)	لوگوں نے علم حق حاصل کیا سو اللہ تعالیٰ ان کے مدارج کو ترقی دیتا ہے اور ارتفاع بخشتا ہے

یہی مدارج ہیں جو اولیاء اللہ اور اصحاب الجنۃ کے ذہاب الی اللہ کی مختلف منزلیں ہیں ایمان باللہ اور محبت الٰہی اس ارتقاء روحانی کی اصل ہے اور ارتقاء انسانی کے معنی یہ ہیں کہ اللہ پر ایمان وایقان ترقی کرے اور اللہ کی ولایت اور دوستی اپنے اونچے مرتبوں اور مقاموں تک بلند ہوجائے۔

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵ : ۱۱)	کلمات طیبات اور صالح اللہ ہی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور وہ عمل صالح کرنے والوں کو ارتفاع بخشتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔ "کلم الطیب" اور "عمل صالح"۔ پس انسانیت کی تکمیل اور ارتقاء کی بنیاد بھی یہی دو چیزیں ہیں۔ "کلم الطیب" سے مقصود ایمان باللہ ہے اور "عمل صالح" سے مقصود انسان کے وہ تمام کام جو صحت واصلاح اور عدل وحقیقت کے مطابق ہوں، فرمایا کہ ایمان باللہ صعود کرتا ہے اور بلند ہوتا ہے اور عمل صالح کو خدا اونچے درجوں تک لیجاتا ہے۔

تصوف اور صوفیہ کرام کے مقصدیات کے متعلق جو گفتگو گذشتہ صفحات میں ہم نے کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام نے محبت الٰہی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا تھا، خدمتِ خلق کو انھوں نے اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا، اس کا صلہ "ارتقاء روحانی" کی شکل میں ان کو ملا، اور یہ "ارتقاء روحانی" انسانیت کی تکمیل تھی۔

لہ اولیاء اللہ اولیاء الشیطان طبع ثانی ۱۹۳۶ء لاہور ص۵۵، ۵۲۔

بیعت کے معنی ہیں : دست بر دست یک دیگر نہادن و عہد بستن
کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنا۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۔

جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے اے محمدؐ! وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، سو جو عہد شکنی کرتا ہے تو اپنی ذات کی مضرت پر عہد توڑتا ہے اور جس نے پورا کیا وہ عہد جو اللہ سے کیا تھا ان کو عنقریب اجر عظیم ملے گا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مختلف مقاصد کے لئے بیعت لی تھی کسی سے جہاد کیلئے، کسی سے ہجرت کے لئے، کسی سے ارکان اسلام کی پابندی کے لئے اور کسی سے سنت نبوی کے تمسک پر، بعض احادیث میں ہے کہ حضور نے انصار عورتوں سے نوحہ نہ کرنے پر بیعت لی تھی، ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ محتاج مہاجرین سے اس پر بیعت لی کہ وہ کسی کے آگے دست سوال نہ پھیلائیں، بعد کو ان لوگوں کا حال یہ ہوگیا تھا کہ کسی کا کوڑا ہاتھ سے گر جاتا تو خود گھوڑے سے اتر کر اٹھاتا تھا اور کسی سے کوڑا اٹھانے تک کا سوال نہ کرتا تھا۔

بہرحال احادیث نبوی سے ثابت ہے کہ بیعت کسی بھی مقصد کے لئے لی جاسکتی ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کیا حکمت تھی، اور مشائخ چشت کس مقصد کیلئے بیعت لیتے تھے؟

۱؎ سبع سنابل میر عبدالواحد بلگرامی مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۹ھ ص ۳۶۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ بیعت کی حکمت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فاعلم ان اللہ تعالیٰ اجری	معلوم کر سنت اللہ یوں جاری ہے کہ امور
سنتہٗ ان یضبط الامور الخفیۃ	خفیہ جو نفوس میں پوشیدہ ہیں ان کا ضبط
المضمرۃ فی النفوس بافعال و	افعال اور اقوال ظاہری سے ہو افعال اقوال
اقوالٍ ظاھرۃٍ دینصبھا مقامھا	قائم مقام ہوں امورِ قلبیہ کے چنانچہ تصدیق اللہ
کما ان التصدیق باللہ	اور اس کے رسول اور قیامت کی امر مخفی ہے تو
ورسولہ والیوم الاٰخر خفیٌ	اقرار ایمان کا بجائے تصدیق قلبی کے قائم کیا
فاقیم الاقرارُ مقامہ وکما	گیا اور جیسے کہ رضامندی بائع اور مشتری کی
ان رضی المتعاقدین ببذل	قیمت اور مبیع کے دینے میں امر مخفی پوشیدہ
الثمن والمبیع امر خفیٌ مضمرٌ	ہے تو ایجاب اور قبول کو قائم مقام رضائے
فاقیم الایجاب والقبول	مخفی کے کر دیا، سو اسی طرح توبہ اور عزم
مقامہ فکذلك التوبۃ	کرنا ترک معاصی کا اور تقویٰ کی رسی کو مضبوط
والعزیمۃ علی ترك المعاصی والتمسك	پکڑنا امر مخفی اور پوشیدہ ہے تو بیعت کو اس
بحبل التقوی خفیٌ مضمرٌ فاقیمت البیعۃ مقامھا	کے قائم مقام کر دیا[1]

حقیقت یہ ہے کہ بیعت میں ایک نفسیاتی مصلحت پوشیدہ ہے، جب انسان اپنے ماضی کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتا ہے تو بہت سی باتیں اس کو اخلاق و مذہب کے خلاف نظر آتی ہیں، اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے، وہ دل ہی دل میں اپنی معصیتوں سے توبہ کرتا ہے لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا اس سے قلب میں ایک بے چینی سی پیدا ہوجاتی ہے، ماضی کا تصور اس کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے، اس کی توبہ اس تصور پر غالب نہیں آتی۔ اب وہ ایک پاک باطن نیک نفس انسان کے ہاتھ پر ترکِ معاصی اور تقویٰ کا عہد کرتا ہے، شیخ یقین دلاتا ہے کہ "تائب با متقی برابر است[2]" اس کے دل کے زخموں پر ایک پھایا سا

---

[1] القول الجمیل شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ حواشی شاہ عبدالعزیز وار دو ترجمہ مولوی خرم علی (مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ) ص ۱۳۔ [2] فوائد الفواد ص ۳-۲۔ حدیث نبوی ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (ابن ماجہ باب ذکر التوبہ)

لگ جاتا ہے، تکلیف دہ ماضی سے اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مستقبل کو نئی امید دل محکم یقین اور بیدار احساس کے ساتھ سنوارنے کی کوشش کرنے لگتا ہے

مشائخ چشت جس مقصد کے لئے بیعت لیتے تھے اس کا اندازہ شیخ نظام الدین اولیاء کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں

چوں کسے بخدمت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز بیامدے بہ نیت ارادت اول فرمودے فاتحہ و اخلاص بخوانید بعدہٗ امن الرسول بخواندے بعدہٗ شہد اللہ تا ان الدین عند اللہ الاسلام خواندے، بعدہ فرمودے کہ بیعت کردی بریں ضعیف و خواجہ ایں ضعیف و خواجہ خواجگان او و بر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و با حضرت عزت عہد کردی کہ دست و پائے و چشم نگاہ داری و بر نہج شرع باشی۔ [1]

جب کوئی شخص شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز کی خدمت میں ارادت کی نیت سے آتا تو اول آپ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھنے کا حکم فرماتے بعدہٗ آمن الرسول پڑھتے اس کے بعد شہد اللہ انہ ان الدین عند اللہ الاسلام تک پڑھتے، پھر فرماتے کہ (کہو) تو نے اس ضعیف اور اس کے خواجہ خواجگان اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی اور خدائے تعالیٰ سے اس بات پر عہد کیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ پر نگاہ رکھے گا اور شرع کے طریقے پر چلے گا۔

انسان کو اخلاقی عیوب سے بچانا اور اس کو راہ شریعت دکھانا مشائخ چشت کی کوششوں کا مرکز و محور تھا۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۲۳۔ "و چشم نگاہ داری" میں جو مصلحت پوشیدہ ہے اس پر حافظ ابن القیم کی یہ تشریح بہت اہم ہے، فرماتے ہیں "نگاہ شہوت کی قاصد اور پیامبر ہوتی ہے اور نگاہ کی حفاظت دراصل شرمگاہ کی جگہ کی حفاظت ہے، جس نے نظر کو آزاد کر دیا اس نے اس کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اور نظر ہی ان تمام آفتوں کی بنیاد ہے جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے کیونکہ نظر کھٹک پیدا کرتی ہے، پھر کھٹک فکر کو وجود بخشتی ہے اور فکر شہوت کو ابھارتی ہے، شہوت ارادہ کو جنم دیتی ہے ارادہ قوی ہو کر عزیمت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عزیمت میں مزید پختگی ہو کر فعل واقع ہوتا ہے (الجواب الکافی ص ۲۰۴)

ماخوذ از تاریخ مشائخ چشت

ہندوستان کے قدیم اولیاء و مشائخ

(قاضی اطہر مبارکپوری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و معیت اور آپ کی تعلیم و تربیت کے فیض یافتہ نفوس قدسیہ صحابہ کہلاتے، صحابہ کی مجلس تعلیم و تربیت سے اٹھنے والے حضرات تابعین کے لقب سے یاد کئے گئے، اور تابعین کے اصحاب و تلامذہ کو تبع تابعین کہا گیا، ان تینوں طبقوں میں جو حضرات خشیت خداوندی، زہد فی الدنیا، تعلق باللہ، تقویٰ، طہارت اور عبادت و ریاضت میں نمایاں اور مشہور تھے ان کو عبّاد و زہّاد کے نام سے یاد کیا گیا، حتی کہ دوسری صدی کے آخر میں ان کے لئے صوفی اور صوفیہ کے الفاظ سنائی دیئے، مگر تیسری اور چوتھی صدی تک عبّاد و زہّاد کا عام رواج رہا۔

اس مقالہ میں ہم ہندوستان کے ایسے ہی بزرگوں کا مختصر تعارف کرائیں گے جو تصوف کے مختلف مکاتیب فکر سے پہلے گذرے ہیں، ان میں اکثریت ان حضرات کی ہوگی جو پانچویں صدی سے پہلے تھے اور ان کا تعلق ہندوستان میں چار سو سالہ عرب دور حکومت و امارت سے ہے ان میں تین طبقے ہیں، پہلا طبقہ ان واردین عبّاد و زہّاد کا ہے جو فتوحات جہاد، امارات اور مختلف وجوہ کے سلسلہ میں یہاں آئے ان میں اکثریت عرب اور اس سے ملحق علاقوں کے بزرگوں کی ہے، دوسرا طبقہ ان صادرین بزرگوں کا ہے جو یہاں سے باہر گئے ان میں بھی اکثریت عرب ممالک میں جانے والوں کی ہے، یہ دونوں طبقے کتاب و سنت فقہ و فتاویٰ اور دینی علوم سے وافر حصہ رکھتے تھے، اور فقہاء و محدثین میں شمار ہوتے تھے مگر چونکہ ان پر زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت کا رنگ غالب تھا اس لئے ان کو اولیاء مشائخ اور عباد و زہاد کے طبقہ میں شمار کیا گیا اور طبقات و تراجم کی کتابوں میں ان کا تذکرہ اس طرح کیا گیا کہ ان کے احوال و ملفوظات اور کشوف و کرامات کے مقابلہ میں ان

کی علمی حیثیت دب گئی۔ تیسرا طبقہ ان مشائخ و صوفیہ کا ہے جو ہندوستان میں مقیم رہ کر اپنے فیوض و برکات عام کرتا رہا، اس میں اکثریت بلاد ماوراالنہر اور عجم کے بزرگوں کی ہے جو پانچویں صدی کے حدود میں سلطان محمود غزنوی اور سلطان شہاب الدین غوری کی فتوحات کے بعد یہاں آئے اور یہیں رہ بس گئے، مذکورہ بالا دونوں طبقوں کے حالات چند کے علاوہ یہاں کی کتابوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں اس لئے ہم نے ان کا مختصر تعارف کرایا ہے، اور تیسرے طبقہ کے حالات یہاں تفصیل سے لکھے گئے — اور ان پر خصوصی توجہ دی گئی اس لئے ہم نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے خلافت راشدہ اور خلافت امویہ کا پورا دور اسلامی فتوحات کا زریں دور ہے اسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی شاندار فتوحات ہوئیں، اس دور کے غازیوں اور مجاہدوں میں صحابہ تابعین اور تبع تابعین کی اکثریت تھی جن میں بڑے بڑے عباد و زہاد و اہل اللہ اور اصفیاء و اتقیاء کی اچھی خاصی تعداد ہوا کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ ان کے وجود کی برکت سے مسلمانوں کو فتح و کامرانی سے نوازتا تھا۔ امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے۔

وکان فی عساکرهم وجیوشهم فی الغزو الصالحون والأولیاء والعلماء من کبار التابعین فی کل جیش منهم شرذمة عظیمة ینصر الله بهم دینه (البدایہ والنہایہ ص ۸۸ ج ۹)

ان کے لشکر میں کبار تابعین کے صلحاء اولیاء اور علماء کی ایک بڑی جماعت ہر فوجی دستہ میں رہا کرتی تھی اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اپنے دین کی نصرت فرماتا تھا۔

خلافت راشدہ میں ہندوستان کی فتوحات کے شرکاء و امراء میں صحابہ کی ایک جماعت تھی چند حضرات کے نام یہ ہیں۔ حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی، حضرت حکم بن ابی العاص ثقفی، حضرت مغیرہ بن ابی العاص ثقفی، حضرت حکم بن عمرو ثعلبی غفاری، حضرت خریت بن راشد سامی، حضرت ربیع بن زیاد حارثی، حضرت سہل بن عدی خزرجی انصاری، حضرت صحار بن عباس عبدی، حضرت عاصم بن عمرو تمیمی، حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان انصاری حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعی، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ قرشی، حضرت عبیداللہ بن معمر تیمی قرشی، حضرت عمیر بن عثمان بن سعد، حضرت مجاشع بن مسعود سلمی، حضرت منذر بن جارود عبدی رضی اللہ عنہم

یہ اکابر صحابہ اور اصاغر صحابہ اور دیگر تمام صحابہ امت محمدیہ میں سب سے بزرگ و برتر اور اعلیٰ

وافضل ہیں، ان حضرات کے بارے میں ان ہی میں سے مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ افضل امت ہیں ان کے دل سب سے زیادہ پاک ونیک ہیں وہ دینی علم میں سب سے زیادہ تہ کو پہونچے ہوئے ہیں، اخلاق میں سب سے اچھے، تکلف میں سب سے کم ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لئے منتخب کیا ہے تم لوگ ان کی فضیلت کا اعتراف کرو اور ان کی اتباع کرو جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق پر چلو، کیونکہ وہ لوگ ہدایت یافتہ ہیں، یہی حضرات ہندوستان کے اولیاء اصفیاء کے سرخیل ہیں اور ان کے قدوم کی برکت سے یہاں دین وایمان کی دنیا آباد ہوئی ہے

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود ان ہی کی لگائی ہوئی ہے

بنو امیہ کا پورا دور اس ملک میں تابعین اور تبع تابعین کی آمد کا ہے جن میں مشاہیر صلحاء اولیاء، عباد، زہاد اور مشائخ شامل ہیں مثلاً سنان بن سلمہ بن محبّق ہذلی، ابوالیمان معلی بن راشد ہذلی بصری، ابوالحسن معلی بن زیاد قردوسی بصری، کرز بن ابو کرز وبرہ حارثی کوفی، کہمس بن حسن بصری صاحب الحسن ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری صاحب الحسن، ربیع بن صبیح سعدی صاحب الحسن رحہم اللہ۔ ان بزرگوں میں امیر شہر، مجاہد، رضاکار اور داعی ومبلغ سب ہی شامل ہیں، جو اپنی مفوضہ خدمات دینی نقطۂ نظر سے نہایت اخلاص وایثار اور امانت ودیانت کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

عباسی دور خلافت میں ان کے فیض یافتہ حضرات ان کے جانشین بن کر یہاں آئے اور یہ سلسلہ عرب حکومتوں کے دور تک جاری رہا حتیٰ کہ ۴۱۶ھ میں سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد مستحکم سلطنت کا قیام ہوا اور ملک عرب کے مقابلہ میں بلاد ماوراء النہر اور عجم کے اہل علم اور ارباب فضل وکمال جوق درجوق یہاں آنے لگے، جو دوسرے دینی علوم کے مقابلہ میں فقہ تصوف اور معقولات سے زیادہ شغف رکھتے تھے، ان حضرات میں حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویری لاہوری رہ اپنے دینی وعلمی اور روحانی فیض رسانی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندوستان سے باہر جانے والے قدیم اولیاء ومشائخ میں حضرت شیخ عبدالرحیم بن حماد

ثقفی دیبلی ہمارے علم میں پہلے بزرگ ہیں جن کی مشیخت کا شہرہ ہندوستان سے عرب تک پہونچا وہ حضرت حارث بن اسد محاسبی، حضرت حاتم اصم اور حضرت شقیق بلخی کے ہم پلہ بزرگ تھے، ان بزرگوں کے احسانی و روحانی تعلقات بیرونی مشائخ سے نہایت گہرے تھے ان میں حضرت بایزید بسطامی کے استاذ و شیخ ابو علی سندی، ان کے بھانجے ابو موسیٰ دیبلی، حضرت جنید بغدادی کے مرید ابو الحسن منصوری، حضرت بشر حافی کے مرید اسمٰعیل سندی، حضرت ابو العباس بن سریج کے مرید شیخ عثمان سندی اور ابو بکر احمد مستجاب الدعاء اور ابدال جیسے اکابر اولیاء و مشائخ کے نام پائے جاتے ہیں، یہ تمام اولیاء و مشائخ فقہاء و محدثین میں سے ہیں مگر چونکہ ان پر زہد و تصوف کا رنگ غالب رہا اس لئے ہم نے ان کو صوفیہ و مشائخ کی حیثیت سے یہاں درج کیا ہے ان میں ان علماء و محدثین کا ذکر نہیں ہے جو اس دور میں ہندوستان اور باہر میں تعلیم و تدریس اور تحدیث و روایت کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ان اولیاء و مشائخ کے ذکر میں حروف تہجی کا خیال رکھا گیا ہے حالانکہ زمانی ترتیب ہوتی تو اچھا تھا

واردین اولیاء و مشائخ

شیخ احمد بن حسین دماوندی رح

شیخ احمد بن حسین بن علی دُماوندی حنفی رحمۃ اللہ علیہ رَے اور طبرستان کے درمیان مقام دُماوند میں سنہ ۴۹۰ھ کے حدود میں پیدا ہوئے، ایک قول کے مطابق قاضی ابو یوسف کی اولاد سے ہیں، تقی الدین عبد القادر تمیمی مصری نے ان کے حال میں لکھا ہے۔

كان فقيهاً، عالماً، فاضلاً، زاهداً ورعاً، كثير المحفوظ متواضعاً . . . . . له بيت مشهور بالعراق وسافر الى بلاد غزنة والهند واقام بها مدة وصحب الكبار۔	وہ فقیہ، عالم، زاہد، پرہیزگار متواضع تھے احادیث و مسائل بہت زیادہ یاد تھے، ان کا خاندان عراق میں علم و فضل میں مشہور رہے غزنین اور ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں ایک مدت تک قیام کر کے کبار علماء و مشائخ کی صحبت اٹھائی

(انساب سمعانی اور الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ)

ان کا انتقال مرو میں صفر رمضان ۵۵۰ھ میں ہوا اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں زیادہ مدت تک قیام کر کے یہاں کے اولیاء و [illegible]

شیخ ابوالعباس احمد بن عثمان تونسیؒ ملتانی

شیخ احمد بن عثمان بن عبدالجبار تونسی ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا حال نیل الابتہاج میں تونسی کے ساتھ ملتانی نسبت سے ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ افریقہ کے ملک تونس کے رہنے والے تھے اور ملتان میں زیادہ اقامت کی وجہ سے اس کی طرف منسوب ہوئے اس کی تائید اس تصریح سے بھی ہوتی ہے۔

رحل للمشرق ولقی فضلاء اجلۃ ثم رجع فسکن بجایۃ واقرء بھا واسمع، لہ علم بالعربیۃ والفقہ واصولہ، واصول الدین وحظ من التصوف ونصیب من العبادۃ۔

(ذیل الابتہاج بنطریز الدیباج)

انھوں نے مشرقی ممالک کا سفر کر کے جلیل القدر علماء وفضلاء سے ملاقات کی اور واپس آکر افریقہ کے شہر بجایہ میں سکونت اختیار کرلی وہیں تعلیم دی، وہ عربی زبان وادب، فقہ اصول فقہ، اصول دین کے عالم تھے، ساتھ ہی تصوف اور عبادت وریاضت سے وافر حصہ رکھتے تھے

نہایت جلیل القدر فاضل، کامل، مستند اور عابد وزاہد مالکی مسلک کے عالم تھے، افریقہ کے بعض حکمرانوں نے ان کو اپنے دارالسلطنت میں بلاکر استفادہ کرایا۔

شیخ ابواسحاق ابراہیم بن مالک بغدادی

شیخ ابواسحاق ابراہیم بن مالک بن بہبود بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے روح بن عبادہ، ابواسامہ، محمد بن عبید، زید بن حباب وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے، ابن ابوحاتم رازی اور امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ نے ان سے حدیث پڑھی ہے نہایت صالح اور بزرگ عالم تھے ان کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ سندھ آکر کھجور کے پودے لے جاتے اور بغداد میں لگاتے اور ہر پودے پر قرآن ختم کرتے تھے۔

وکان من الصالحین وکان یغرس النخیل الصغار فاذا غرس نخلۃ لم یبرح حتی یختم القرآن وکان یحمل النخیل من السند

وہ صلحاء میں تھے، کھجور کے چھوٹے چھوٹے پودے بوتے تھے اس کے بعد ایک ختم قرآن کی تلاوت کرتے تھے یہ پودے سندھ سے لاتے تھے

اسی سال کی عمر میں رجب ۲۶۱ھ میں انتقال کیا (کتاب الجرح والتعدیل، تاریخ بغداد، المنتظم)

ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری ہندی ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری رحمۃ اللہ علیہ امام حسن بصری کے تلمیذ خاص اور صاحب الحسن کی نسبت سے مشہور ہیں، انھوں نے حسن بصری ابو حازم الشیخ، محمد بن سیرین، وہب بن منبہ وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ نے روایت کی ہے، ان کے حال میں لکھا ہے

وھو بصری کان یسافر فی التجارۃ الی الھند واقام بھا مدۃ۔ وہ بصری ہیں تجارتی سلسلہ میں ہندوستان کا سفر کرکے وہاں زیادہ دنوں تک قیام کرتے تھے

اس لئے ان کو نزیل الہند اور ہندی کی نسبت سے یاد کیا جاتا ہے، دوسری صدی کے طبقۂ عبّاد و زہّاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے مالک ہیں، راقم نے ان کا مستقل حال لکھا ہے جو اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" نامی کتاب میں چھپا ہے۔

شیخ الاسلام ابوعثمان صابونی شیخ الاسلام ابوعثمان اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن صابونی رحمۃ اللہ علیہ خطیب، واعظ، مفسر، محدث اور اپنے زمانہ میں جامعیت میں بے مثل تھے، ورع و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں بلند پایہ رکھتے تھے، انھوں نے نیشاپور، خراسان، غزنین، بلاد ہند، رمل، طبرستان، شام، بیت المقدس اور حجاز میں حدیث کی تعلیم دی ہے ستر سال تک مسلسل وعظ بیان کیا ہے، ہندوستان کے بادشاہ کی دعوت پر یہاں آئے اور واپسی کے بعد ہرات میں کئی دن تک روایت حدیث اور وعظ کی مجالس منعقد کیں، محرم ۴۴۹ھ میں انتقال کیا۔ (تاریخ ابن عساکر اور معجم البلدان)

شیخ حسین بن منصور حلاج شیخ حسین بن منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ ہیں، شیخ جنید بغدادی، شیخ ابوالحسن نوری اور دیگر مشائخ سے فیض پایا ہے وہ ہندوستان میں آئے اور یہاں کے معتقدین ان کو مغیث کے لقب سے یاد کرتے تھے اور ان سے خط و کتابت رکھتے تھے، ان کے بارے میں طبقۂ صوفیا و مشائخ میں اختلاف ہے۔ ذی قعدہ ۳۰۹ھ میں قتل کئے گئے (طبقات کبریٰ شعرانی وغیرہ)

شیخ حسین زنجانی لاہوریؒ

شیخ حسین زنجانی، لاہوری رحمۃ اللہ علیہ مشہور مشائخ میں تھے، زہد و تقویٰ کے ساتھ فقہ میں مہارت رکھتے تھے انھوں نے طریقت کی تعلیم و تربیت شیخ ابوالفضل ختلی سے پائی تھی اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہ کر لاہور آگئے اور جس دن شیخ علی ہجویری لاہور تشریف لائے اس دن ان کا انتقال ہوا (فوائد الفواد، نزہۃ الخواطر)

حبیش بصریؒ

حبیش بصری رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ راہب الامت حضرت عامر بن عبدالقیس عنبریؒ، کے بھتیجے ہیں، سندھ کی فتوحات میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھے، ایک مرتبہ محمد بن قاسم نے ان سے کہا کہ راجہ داہر کہیں چھپا ہوا ہے تم اپنے قبیلہ بنی عمر کے سپاہیوں سے کہو کہ اس کی طرف سے غافل نہ رہیں، اس پر حبیش نے کہا کہ اے امیر! میرا دل کہہ رہا ہے کہ داہر مارا گیا، چنانچہ ایسا ہی تھا (چچ نامہ)

ابوحفص ربیع بن صبیح بصریؒ

ابوحفص ربیع بن صبیح سعدی بصری رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن بصری کے خاص تلمیذ اور صاحب الحسن کی نسبت سے مشہور ہیں، عابد و زاہد اور مجاہد و فقیہ و محدث ہیں ان کے تلامذۂ حدیث میں سفیان ثوری، وکیع بن جراح، عبدالرحمن بن مہدی، ابو داؤد طیالسی جیسے اساطین علم و فضل پائے جاتے ہیں، بصرہ کے عباد و زہاد میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ۱۶۰ھ بزمانہ خلیفہ مہدی ہندوستان کے جہاد پر آئے اور گجرات کے مقام باربد (بھاڑ بھوت) کی فتح میں شریک رہے واپسی پر ہمیں ۱۶۰ھ میں انتقال کر گئے اور یہیں دفن ہوئے، ایک روایت کے مطابق وہ اسلام میں حدیث کے پہلے مصنف ہیں، راقم نے ان کے مفصل حالات جمع کئے ہیں جو اسلامی ہند کی عظمت رفتہ میں شامل ہیں۔

شیخ ابوعثمان سعید بن محمد ملقابادی

ابوعثمان سعید بن محمد بن احمد بحیری ملقابادی رحمۃ اللہ علیہ کا گھرانہ بیت التزکیہ والعدالۃ تھا، جلیل القدر، کبیر الشان، اور ثقہ محدث ہیں، تصوف میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، ملقاباد میں ان کی مستقل خانقاہ، کتب خانہ اور مسجد تھی جن میں وہ زندگی بسر کرتے تھے، اسی کے ساتھ بہادری

مردانگی اور ہمت وحوصلہ میں مشہور تھے، عراق اور خراسان میں جاکر حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی، ان کی اولاد میں صوفیہ ومشائخ گذرے ہیں، شیخ ابو عثمان ملقابادی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندستان کے جہاد میں شریک رہے اور شاندار خدمات انجام دی ہیں، ربیع الآخر ۴۵۱ھ میں انتقال کیا۔

(کتاب السابق بحوالہ عروبۃ العلماء)

شیخ علی بن عثمان ہجویری لاہوری

شیخ ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے اولیاء کبار میں ہیں بہت بڑے عالم وفقیہ تھے طریقت ومعرفت کی تعلیم وتلقین شیخ ابوالفضل ختلی سے حاصل کی نیز شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری اور دوسرے مشائخ ومحدثین سے کسب فیض کیا، بہت زیادہ سیر وسیاحت کی آخر میں لاہور آکر یہیں مقیم ہوگئے، اور ۴۶۵ھ میں انتقال کیا، ان کی کتاب کشف المحجوب تصوف کی مشہور کتاب ہے۔ (نزہۃ الخواطر)

شیخ ابو علی شقیق بلخیؒ

شیخ ابو علی شقیق بن ابراہیم بلخی رحمۃ اللہ علیہ خراسان کے مشہور اور اجلہ مشائخ میں ہیں، قزوینی نے آثار البلاد میں لکھا ہے کہ ابتداء حال میں وہ بسلسلۂ تجارت ہندوستان گئے اور ایک بت خانہ میں جاکر دیکھا کہ ایک آدمی سر اور ڈاڑھی کے بال منڈوائے ہوئے بت کی پوجا کر رہا ہے، شقیق نے اس سے کہا کہ تمھارا معبود تو خالق ورازق ہے تم اس کی عبادت کرو اور بت پرستی چھوڑ دو، یہ بت نفع نقصان نہیں پہونچا سکتا، یہ سن کر اس آدمی نے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو تم اپنے گھر میں کیوں نہیں بیٹھے رہے بلاوجہ تجارت میں تکلیف اٹھاتے ہو، وہ تم کو گھر میں روزی دے دیگا، اس کی یہ بات شقیق کے دل کو لگ گئی اور اسکے بعد زہد وتقویٰ کی زندگی اختیار کرلی، بعض لوگوں نے اس واقعہ کا تعلق بلاد روم یا دوسرے ملک سے بتایا ہے حضرت شقیق ۱۹۴ھ جنگ کولان میں شہید ہوئے۔

(آثار البلاد، قزوینی)

کرز بن ابو کرز وبرہ حارثی کوفی

حضرت کرز بن ابو کرز وبرہ حارثی عبدی کوفی رحمۃ اللہ علیہ قبیلۂ بنی عبدالقیس سے تابعی یا تبع تابعی ہیں، زہد وتقویٰ، عبادت وریاضت میں اپنے زمانہ میں سب سے آگے تھے مکہ مکرمہ آئے تو وہاں

کے عبّاد وزہاد کو پیچھے کردیا، مستجاب الدعا بزرگ تھے، کہتے ہیں کہ بادل ان پر سایہ کرتا تھا، انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کے لئے اس شرط پر دعا مانگی تھی کہ وہ اس سے دنیا نہیں حاصل کریں گے ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ روزانہ تین ختم قرآن کی تلاوت کرتے تھے

حضرت کرز بن وبرہ حارثی ۴۵ھ میں عبداللہ بن سوار عبدی کے ساتھ سندھ کی فتوحات میں شریک تھے، اس کے بعد عبداللہ بن سوار عبدی ان کو یہاں اپنا قائم مقام اور امیر بناکر حضرت معاویہ کے پاس چلے گئے، ۹۸ھ میں یزید بن مہلب کی امارت میں جرجان کی فتح میں شریک رہے اور وہیں انتقال کیا اور وہیں دفن کئے گئے

انھوں نے نعیم بن ابوہند وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے سفیان ثوری، ابن شبرمہ، فضیل بن غزوان اور ورقاء بن عمر وغیرہ نے روایت کی، ابن حبان نے ان کو ثقات میں بتایا ہے ان کا مفصل حال تاریخ جرجان میں ہے۔

(تاریخ کبیر امام بخاری، کتاب الجرح والتعدیل، الاصابہ، حلیۃ الاولیا، تاریخ جرجان، تاریخ خلیفہ بن خیاط)

ابوعبداللہ کہمس بن حسن قیسی بصری

ابوعبداللہ کہمس بن حسن قیسی بصری رحمۃ اللہ علیہ بصرہ کے عبّاد و زہاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ اور مشائخ کبار میں سے ہیں، تبع تابعی ہیں اور اجلّہ تابعین سے حدیث کی روایت کی ہے، رات دن میں ایک ہزار رکعات نماز پڑھتے تھے، روزانہ گچ کاری سے دو دانق مزدوری پاتے تھے اور اسی سے اپنی والدہ کے لئے میوہ خرید لاتے تھے، ایک درم کا آٹا خرید کر کھاتے رہے، جب زیادہ دن ہوگئے تو اس کو وزن کیا اس میں کمی نہیں ہوئی تھی اس کے بعد آٹا کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا، بصرہ میں رہ کر اپنی والدہ کی خدمت کرتے رہے ان کے انتقال کے بعد مکہ مکرمہ چلے گئے اور زندگی عبادت و ریاضت میں گذاردی،

حضرت کہمس بن حسن ہندوستان کے جہاد میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھے، خلیفہ بن خیاط اور امام ذہبی نے ان سے ۹۳ھ میں راجہ داہر سے جنگ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ میں محمد بن قاسم کے ساتھ تھا، راجہ داہر بہت بڑی فوج لے کر ہمارے مقابلے کے لئے آیا، اس کے ساتھ ستائیس جنگی ہاتھی تھے، ہم نے دریائے سندھ پار کرکے اس کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو شکست

دی، راجہ داہر اپنی فوج لے کر بھاگ گیا، ہم نے اس کا تعاقب کیا۔ اس نے بھی کچھ فوج لے کر رات میں ہم پر حملہ کیا، اس میں اس کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر برہمن آباد میں پناہ گزیں ہوا، مسلمانوں نے یہاں بھی اس سے جنگ کر کے شکست دی، اس کے بعد محمد بن قاسم نے کیرج کو فتح کیا۔

(تاریخ خلیفہ بن خیاط، تاریخ الاسلام ذہبی، صفۃ الصفوہ وغیرہ)

شیخ ابوسعد محمد بن حسین حرمی ہروی

شیخ ابوسعد محمد بن حسین بن محمد حرمی ہرویؒ حرم مکی کی طرف منسوب ہیں، حافظ حدیث کے ساتھ اولیائے کاملین میں سے ہیں، ہندوستان آئے تھے، سمعانی نے لکھا ہے

وکانت لہ رحلۃ الی بلاد الھند — انھوں نے ہندوستان کے شہروں کا بھی سفر کیا ہے۔

ایضاً۔

حافظ محمد بن حسن بن محمد ہمدانی کا بیان ہے کہ ابوسعد حرمی اوتار و ابدال میں سے تھے، میری آنکھوں نے ان سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا، ہرات کے مشائخ کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوسعد حرمی بیس سال سے یہاں مقیم ہیں مگر ہم لوگ ان کے بارے میں حیرت زدہ ہیں اور ان کی بود و باش کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے، وہ لوگوں سے کنارہ کش رہتے ہیں ایک اور بزرگ ابوحامد خیام واعظ کا قول ہے کہ اگر ہرات میں اللہ کا کوئی ولی ہے تو ابوسعد حرمی ہیں، ان کا وصال شعبان ۴۹۱ھ میں ہوا۔

(انساب سمعانی اور العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین)

ابوالیمان معلّی بن راشد نبّال ہذلیؒ

ابوالیمان معلّی بن راشد ہذلی بصری رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعی ہیں، نبل یعنی نیزہ بناتے اور اس سے روزی کماتے تھے، حضرت سنان بن سلمہ بن محبق ہذلی کے غلام ہیں، ائمہ حدیث نے روایت کی ہے، ۵۰ھ میں حضرت معاویہ کے زمانہ میں سندھ کے شہر قیقان میں اپنے آقا سنان بن سلمہ کی امارت میں جہاد کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ میدان جنگ میں سنان بن سلمہ نے مجاہدین سے کہا کہ تم لوگوں کو بشارت ہے جنت اور غنیمت میں ایک چیز تم کو ملنے والی ہے اس کے بعد انھوں نے سات ۷ پتھر لیے اور مجاہدین کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ جب میں حملہ کر دوں تو تم لوگ بھی حملہ

کرتا اور دوپہر کو تکبیر کہتے ہوئے ایک پتھر پھینکا، اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پتھر پھینکتے رہے اور جب سورج ڈھل گیا تو ساتواں پتھر پھینکا اور حٰمٓ لا ینصرون پڑھ کر نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے دشمن پر حملہ کردیا، ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ہی حملہ آور ہوگئے اور دشمن کو شکست دی، وہ ایک قلعہ میں پناہ گزیں ہوئے، ہم تعاقب کرتے ہوئے ان کے پاس پہونچ گئے، انھوں نے قسم کھاکر کہا کہ تم لوگوں نے ہم سے جنگ نہیں کی ہے، وہ اور لوگ تھے جن کو ہم تمہارے گروہ میں نہیں دیکھ رہے ہیں وہ لوگ ابلق گھوڑوں پر سفید عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

ابو بسطام مقاتل بن حیان بلخیؒ

ابو بسطام مقاتل بن حیان نبطی بلخی رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعی، حافظ حدیث اور عالم خراسان ہیں انھوں نے شعبیؒ، سعید بن مسیب، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، سالم بن عبداللہ بن عمر، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز وغیرہ سے حدیث کی روایت کی اور ان سے عبداللہ بن مبارک اور ابراہیم بن ادہم وغیرہ نے روایت کی۔

امام صالح صادق، عبادت گذار، نیک اور جلیل القدر مشائخ میں ہیں، ابومسلم خراسانی کے فتنہ میں کابل چلے آئے اور ان کی دعوت پر بہت سے انسان اسلام لائے، ایک روایت کے مطابق کابل میں ۱۵۰ھ سے پہلے انتقال کیا مگر شمس الدین داؤدی مصریؒ نے طبقات المفسرین میں لکھا ہے کہ مات قبیل الخمسین ومائۃ بارض الہند یعنی ۱۵۰ھ سے کچھ پہلے سرزمین ہند میں انتقال کیا (تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، طبقات المفسرین)

ابوالحسن معلّٰی بن زیاد قردوسی بصری

ابوالحسن معلّٰی بن زیاد بن حامز قردوسی بصری رحمۃ اللہ علیہ تبع تابعی ہیں انھوں نے حسن بصری، حنظلہ دوسی، معاویہ بن قرہ، علاء بن بشر وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے، اور ان سے حماد بن زید، ہشام بن حسان، جعفر بن سلیمان اور یوسف بن عطیہ صفّار وغیرہ نے روایت کی ہے، ثقہ، محدث تھے اسی کے ساتھ زہد و تقویٰ اور عبادت میں بصرہ کے عباد و زہاد میں سے بھی تھے، ابن ابی حاتم نے لکھا ہے۔ کان یُعَدّ من عباد اھل البصرۃ وزھادھم اور ابن حجر نے لکھا ہے ھو محدد و من زھّاد اہل البصرۃ، یعنی ان کا شمار بصرہ کے عابدوں اور

زاہدوں میں تھا وہ ہندوستان میں کئی مرتبہ امیر رہے ہیں اور مفوضہ خدمات بحسن وخوبی انجام دی ہیں

(کتاب الجرح والتعدیل، تہذیب التہذیب، انساب سمعانی وغیرہ)

صادرینِ اولیاء ومشائخ

شیخ ابوالعباس احمد بن محمد دیبلی مصری رح

شیخ ابوالعباس احمد بن محمد دیبلی مصری رحمۃ اللہ علیہ سندھ کے شہر دیبل کے رہنے والے تھے مصر جاکر وہیں مستقل قیام کیا اور وہیں فوت ہوئے، امام سبکی رح نے ان کو الحافظ الزاہد لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ

وکان رجلا صالحا من ارباب الاحوال والمکاشفات له کرامات ظاهرة واحوال سنية۔	وہ بزرگ آدمی اہل کرامات ومکاشفات میں ہیں ان کی کھلی کھلی کرامتیں ہیں اوران کے حالات زہد وتقویٰ کے اعتبار سے بہت بلند ہیں۔

اور شیخ عبداللہ بن حجازی شرقاوی نے ان کے بارے میں لکھا ہے

کان جيد المعرفة بالمذهب كثير النظر في الام زاهدا كثير التلاوة والصيام سليم القلب صاحب كرامات۔	شافعی مذہب کے زبردست عالم تھے، کتاب الام بہت زیادہ دیکھتے تھے، زاہد تھے قرآن کی تلاوت بہت زیادہ کرتے تھے روزہ بہت زیادہ رکھتے تھے، سلیم القلب صاحب کرامات بزرگ تھے

ان کا ذریعہ معاش خیاطت یعنی سلائی تھا، جمعہ کے دن ایک کرتہ ایک درم، دو یا تین دانق میں سلتے تھے اور اسی سے گرانی ہو یا ارزانی اپنے کھانے پہننے کا انتظام کرتے تھے شافعی المسلک اور شافعی فقہ کے زبردست فقیہ تھے۔ ان کا وصال قابلِ رشک انداز میں ہوا، ابوالعباس نسوی اور ابوسعید مالینی بیان کرتے ہیں کہ ہم دونوں ان کے انتقال کے وقت موجود تھے انھوں نے بیماری کی وجہ سے مغرب اور عشاء کی نماز مغرب کے وقت ادا کی اور سحر

کے وقت کہا کہ مجھے قبلہ رُخ کرو، اس کے بعد تلاوت قرآن شروع کی اور اسی حال میں انتقال کر گئے، یہ رمضان ۳۶۳ھ کا واقعہ ہے، ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ مصر میں کوئی قابل ذکر انسان ایسا نہ رہا جو ان کے جنازہ میں شریک نہ ہوا ہو۔

(طبقات الشافعیہ الکبریٰ سُبکی اور التحفۃ البہیہ فی طبقات الشافعیہ قلمی)

شیخ ابوبکر احمد بن سندی بغدادی

امام ابوبکر احمد بن سندی بن بحر حدّاد سندی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اولیائے کبار اور علمائے عظام میں تھے، خطیب بغدادی نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

وکان ثقۃ، صادقا، خیرا، فاضلا	ثقہ، صادق، نیک اور فاضل بزرگ تھے، بغداد
یسکن قطیعۃ بنی حداد	کے محلہ قطیعہ حداد میں قیام کرتے تھے۔

حافظ ابونعیم نے ان کو مستجاب الدعا ابدال میں بتایا ہے۔

وکان یعد من الابدال وکان	ان کا شمار ابدال میں تھا مستجاب الدعاء
یقال انہ مجاب الدعوۃ۔	بزرگ تھے

انھوں نے حدیث کا سماع محمد بن عباس مودب، حسن بن علویہ قطان، اور حافظ موسیٰ بن ہارون سے کیا تھا، اور ان سے ابن رزقویہ نے ابو حذیفہ بخاری کی تصنیف کتاب المبتدأ کی روایت کی نیز ابو علی بن شاذان، ابونعیم اصفہانی وغیرہ نے ان سے حدیث کی روایت کی ہے ——— ، ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں ان کا حال تفصیل سے بیان ہے اور حدیث تفسیر اور زہد و رقائق سے متعلق بہت سی روایات ان سے نقل کی ہیں جو حضرت علی حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مقداد بن اسود، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، ابو رجاء عطاردی، مالک بن دینار، ابو عمران جونی، سعید بن جُبیر شعبی، وہب بن منبہ میمون بن مہران وغیرہ رحمہم اللہ کے بیان میں موجود ہیں، امام ابوبکر احمد بن سندی کا وصال ۳۵۹ھ میں بغداد میں ہوا۔ (تاریخ بغداد، انساب سمعانی، شذرات الذہب، حلیۃ الاولیاء)

شیخ ابوالعباس احمد بن عبداللہ دبیلی نیشاپوریؒ

شیخ ابوالعباس احمد بن عبداللہ بن سعید دبیلی نیشاپوری

رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سمعانی کا بیان ہے۔

من الغرباء المتقدمین فی طلب العلم ومن الفقراء الزھاد یسکن نیسابور ایام ابی بکر محمد بن اسحاق بن خزیمۃ۔

وہ طلب علم میں پیش پیش رہنے والے غریب الدیار طالب علموں اور فقرائے زہاد میں سے تھے، امام ابوبکر بن خزیمہ کے زمانہ میں نیساپور میں سکونت اختیار کر لی تھی

خود حسن بن یعقوب حدادی کی خانقاہ میں مقیم تھے اور اندرون شہر ان کے بال بچے رہتے تھے، خانقاہ میں ایک کمرہ ان کے لئے مخصوص تھا، جامع مسجد میں نمازیں ادا کرتے تھے اور وہاں سے اندرون شہر بال بچوں میں آتے تھے، صوف کے کپڑے پہنتے تھے اور اکثر پیدل چلتے تھے۔

حدیث کے بہت بڑے عالم تھے بصرہ میں قاضی ابوخلیفہ سے، بغداد میں جعفر بن محمد فریابی سے، مکہ میں مفضل بن محمد جندی اور اپنے ہم وطن محمد بن ابراہیم دیبلی سے مصر میں علی بن عبدالرحمٰن اور محمد بن زبان سے، دمشق میں ابوالحسن احمد بن عمیر بن جوسا سے، بیروت میں ابوعبدالرحمٰن مکحول، ابوعروبہ بحران، اور حسین بن ابومعشر سے، تستر میں احمد بن زہیر تستری سے، عسکر میں حافظ مکرم بن عبدان بن احمد سے اور نیشاپور میں ابوبکر محمد بن خزیمہ اور ان کے معاصرین سے حدیث کی روایت کی اور ان سے حاکم ابو عبداللہ نیشاپوری وغیرہ نے حدیث کی روایت کی تھی، ان کا انتقال نیشاپور میں رجب ۳۴۳ھ میں ہوا اور مقبرہ حیرہ میں دفن کئے گئے

(انساب سمعانی)

شیخ ابوالعباس احمد بن نصر دیبلی موصلیؒ

قاضی ابوالعباس احمد بن نصر بن حسین دیبلی، انباری، موصلی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں انبار کے بیان میں کیا ہے اور ان کے متعلق لکھا ہے وکان من الصالحین ورعا، دینا، خیرا لہ اخبار حسان فی ورعہ ودینہ وامتناعہ من امضاء الحکم فیما لایجوز ورد اوامر من لایمکن ردھا یستجل علیہ وکان لایاخذہ فی الحق لومۃ لائم۔

بغداد میں قاضی القضاۃ نے ان کو اپنا نائب بنایا تھا، قاضی القضاۃ کے معزول ہو جانے

کے بعد خود علیحدہ ہو گئے اور موصل میں اقامت اختیار کرلی یہاں تک کہ یہیں ۵۹۸ھ میں انتقال کیا (معجم البلدان)

شیخ ابوابراہیم اسمٰعیل بن سندی بغدادیؒ

شیخ ابوابراہیم اسمٰعیل بن سندی بغدادی خلال رحمۃ اللہ علیہ مشہور بزرگ اور شیخ بشر بن حارث حافی بغدادیؒ کے صحبت و تربیت یافتہ اور ان کے اقوال و احوال کے ناقل ہیں، انھوں نے مسلم بن ابراہیم وراق سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے محمد بن مخلد نے روایت کی ہے۔

بغداد کے محلہ باب الشام میں رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے بشر حافی سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ تم اللہ سے ڈرو۔ اگر حدیث سے دنیا کا ارادہ کرتے ہو تو ایسامت کرو اور اگر آخرت کا ارادہ کرتے ہو تو تم نے اس کو حاصل کرلیا ہے، امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کے سلسلہ سے روایت کی ہے۔ (تاریخ بغداد)

شیخ ابومحمد بختیار بن عبداللہ ہندی مروزیؒ

شیخ ابومحمد بختیار بن عبداللہ ہندی مروزی رحمۃ اللہ علیہ اللہ کے نیک بندوں میں نہایت بزرگ عالم تھے، امام سمعانی کے والد کے آزاد کردہ غلام ہیں، فصد کھولنے میں ماہر تھے اسی لئے فصاد مشہور ہیں، انھوں نے اپنے آقا کے ساتھ عراق و حجاز کا تعلیمی سفر کیا اور آقا نے ان کو احادیث کثیرہ کا سماع کرایا، بغداد میں ابومحمد جعفر بن احمد بن حسن السراج، ابوالفضل محمد بن عبدالسلام بن احمد انصاری اور ابوالحسین مبارک بن عبدالجبار طیوری سے ہمدان میں ابومحمد عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن دونی سے، اصفہان میں ابوالفتح محمد بن حداد وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے سمعانی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے چند احادیث کا سماع کیا ہے، ان کا انتقال مرو میں صفر ۵۴۱ھ میں ہوا۔ (انساب سمعانی)

شیخ ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی بوشنجیؒ

شیخ ابوالحسن بختیار بن عبداللہ ہندی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ امام سمعانی نے اس طرح شروع کیا ہے۔ الصوفی، الزاھد، الھندی عتیق محمد بن اسمٰعیل الیعقوبی القاضی من اھل بوشنج، شیخ صالح سدید السیرۃ

صوفی، زاہد، ہندی قاضی محمد بن اسمٰعیل یعقوبی کے آزاد کردہ غلام تھے، بوشنج کے رہنے والے شیخ صالح نیک سیرت بزرگ تھے۔

انھوں نے اپنے آقا کے ساتھ عراق، حجاز اور اہواز کا تعلیمی سفر کیا، اور بغداد میں شریف ابونصر محمد، ابوالفوارس طراد بن محمد بن علی زینبی اور ابومحمد رزق اللہ بن عبدالوہاب تمیمی سے، بصرہ میں ابوعلی احمد بن علی تستری، ابوالقاسم، عبدالملک بن خلف بن شعبہ، ابویعلی احمد بن محمد بن حسن عبدی کے علاوہ اصفہان، خوزستان اور بلاد جبل کی جماعت کثیرہ سے حدیث کی روایت کی سمعانی نے ان سے بوشنج اور ہرات میں حدیث پڑھی، ۵۴۲ھ یا ۵۴۳ھ میں انتقال کیا۔

(انساب سمعانی)

شیخ ابومحمد جعفر بن خطاب قصداری بلخیؒ

شیخ ابومحمد جعفر بن خطاب قصداری رحمۃ اللہ علیہ بلوچستان کے شہر قصدار کے رہنے والے تھے، بلخ میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، سمعانی نے ان کو فقیہ، زاہد لکھا ہے۔ کان فقیہاً زاھداً سکن بلخ وھو من قصدار۔ وہ فقیہ زاہد تھے بلخ میں سکونت اختیار کی قصدار کے رہنے والے تھے۔

انھوں نے حدیث کی تعلیم ابوالفضل عبدالصمد بن نصیر عاصمی سے کی ہے اور ان سے حافظ ابوالفتوح عبدالغافر بن علی کاشغری نے روایت کی ہے، یہ بزرگ پانچویں صدی سے پہلے گذرے ہیں۔ (انساب سمعانی)

شیخ ابوداؤد سیبویہ بن اسمٰعیل قزداری مکیؒ

شیخ ابوداؤد سیبویہ بن اسمٰعیل قزداری رحمۃ اللہ علیہ بلوچستان کے شہر قصدار کے رہنے والے تھے جس کو خضدار اور قزدار بھی لکھتے ہیں، اپنے زمانہ کے مشہور بزرگ تھے، یہاں سے مکہ مکرمہ گئے اور وہیں مجاورت کرکے عبادت و ریاضت میں زندگی بسر کی اور وہیں حدیث کی تعلیم بھی دی انھوں نے ابوالقاسم علی بن محمد بن عبداللہ حسینی ابوالفتح، رجار بن عبدالواحد اصفہانی حافظ ابوالحسین یحیٰی بن ابوالحسن قزوینی سے حدیث کی روایت کی، ۵۰۶ھ یا اس کے بعد انتقال کیا۔ (انساب سمعانی)

شیخ عبداللہ بن حسن بن سندی اندلسیؒ

شیخ عبداللہ بن حسن بن سندی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے مشہور مشائخ و محدثین میں تھے، انھوں نے زہد کے موضوع پر بہت ضخیم کتاب تصنیف کی تھی، حافظ ابن حجر نے اس کی بیسویں جلد دیکھی تھی، علماء و مشائخ کی ایک جماعت نے اس کتاب میں روایت کی تھی، سندھ سے منتقل ہو کر اندلس میں سکونت اختیار کر لی تھی، ۳۳۵ھ میں انتقال کیا۔

(تاریخ ابن عساکر اور بغیۃ الملتمس ضبی)

شیخ عبدالرحیم بن حماد دیبلی مصریؒ

شیخ عبدالرحیم بن حماد ثقفی دیبلی بصری رحمۃ اللہ علیہ طبقہ تبع تابعین کے اولیائے عظام اور مشائخ کرام میں ہیں، محمد بن قاسم کے ساتھ قبیلۂ بنو ثقیف سے جو لوگ سندھ آئے تھے ان میں بڑے بڑے علمائے کرام و مشائخ عظام پیدا ہوئے ان ہی میں شیخ عبدالرحیم بھی ہیں، ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں امام عقیلی کے دادا کا بیان نقل کیا ہے۔

قدم علینا من السند شیخ کبیر کان یحدث عن الاعمش وعمرو بن عبید۔	ہمارے یہاں سندھ سے ایک بہت بڑے بزرگ آئے جو اعمش اور عمرو بن عبید سے روایت کرتے تھے۔

انھوں نے بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، ان سے علمائے عراق نے حدیث کی روایت کی تھی، ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے، معجم ابن جمیع میں سند عالی آن کی حدیث مروی ہے، ذہبی نے ان کو شیخ داہی یعنی غیر ثقہ بتایا ہے، شیخ عبدالرحیم زہد و تقویٰ اور احسان و تصوف میں حارث محاسبی، حاتم اصم اور شقیق بلخی جیسے مشائخ عظام کے صف کے بزرگ تھے، ایک واقعہ سے ان کے علوئے مرتبت کا پتہ چلتا ہے، خطیب بغدادی نے سعید بن عمرو یرذعی سے روایت کی ہے کہ میری موجودگی میں امام ابوزرعہ رازی سے حارث محاسبی اور ان کی کتابوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ خبردار ان کتابوں کو ہاتھ نہ لگانا، ان میں بدعات اور گمراہی کی باتیں ہیں، تم حدیث پر عمل کرو اس میں ایسی باتیں پاؤگے جو تم کو ان کتابوں سے بے نیاز کر دیں گی، جو شخص کتاب اللہ سے سبق حاصل نہیں کر سکتا وہ ان کتابوں

سے کیا حاصل کرے گا؟ مالک بن انس، سفیان ثوری اور اوزاعی وغیرہ نے کتابیں لکھیں جن میں سب کچھ ہے، اس کے بعد امام ابوزرعہ نے کہا۔

فأتونا مرۃً بالحارث المحاسبی ومرۃ بعبد الرحیم الدیبلی ومرۃ بحاتم الاصم ومرۃ بشقیقٍ، ثم قال ما اسرع الناس الی البدع۔

تم لوگ ہمارے پاس کبھی حارث بن اسد محاسبی کو کبھی عبدالرحیم دیبلی کو، کبھی حاتم اصم کو، کبھی شقیق بلخی کو لاتے ہو، کس قدر جلد لوگ بدعات کی طرف مائل ہو گئے۔

حضرات محدثین حدیث کی روایت میں شدت احتیاط کی وجہ سے صوفیہ ومشائخ کی روایات پران کی بزرگی اور نیک نفسی کی وجہ سے اعتماد نہیں کرتے تھے، اور ان کے احوال واقوال کو حدیث کے روایتی اور درایتی معیار سے کم سمجھتے تھے، اس لئے لوگوں کو ان کے بارے میں باخبر رکھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب وسنت کو چھوڑ کر لوگ بزرگوں کے احوال وملفوظات ہی کو سب کچھ نہ سمجھ لیں، بہر حال اس واقعہ سے شیخ عبدالرحیم دیبلی کی مشیخت وبزرگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ (لسان المیزان اور تاریخ بغداد)

شیخ عثمان سندی بغدادیؒ

شیخ عثمان سندی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ چوتھی صدی میں بغداد کے مشائخ کبار میں تھے، ابن جوزی نے المنتظم میں شیخ ابوالعباس احمد بن عمر بن سریجؒ متوفی ۳۰۶ھ کے حال میں شیخ عثمان کا بیان نقل کیا ہے کہ شیخ ابوالعباس بن سُریج نے مرض الموت میں مجھ سے کہا کہ رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تیرا رب تبارک وتعالیٰ تجھ کو خطاب کر رہا ہے اس کے بعد میں نے سنا بِمَا اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِیْنَ (تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا) اس کے جواب میں میرے دل میں آیا کہ ایمان اور تصدیق سے جواب دیا، اس کے بعد بھی مجھ سے کہا گیا کہ بما اجبتم المرسلین تو میرے دل میں خیال آیا کہ جواب میں مزید کچھ مطلوب ہے اور میں نے کہا بالایمان والتصدیق غیر انا قد اصبنا من ھذہ الذنوب (ایمان اور تصدیق سے جواب دیا البتہ ہم نے گناہ کئے ہیں، تو کہا گیا کہ اما انی قد غفرتُ لکم (ہم نے تمہاری مغفرت کردی) اس واقعہ سے شیخ عثمان کی مشیخت وبزرگی کا پتہ چلتا ہے (المنتظم)

شیخ عمر ہندی مصریؒ اور شیخ محمد ہندیؒ

شیخ عمر ہندی، شیخ محمد ہندی اور ہندوستان کے دوسرے مشائخ مصر کی خانقاہوں، زاویوں اور رباطوں میں مستقل طور سے رہتے تھے اور مقبرۃ الہند کے نام سے ان کا قبرستان مشہور تھا، ان ہندی مشائخ کے حالات معلوم نہیں، صرف ان میں سے دو حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں

" الکواکب السائرۃ فی ترتیب الزیارۃ " میں شیخ شمس الدین محمد بن ناصر الدین ابن زیات مصری نے لکھا ہے کہ مصر کے بڑے قبرستان میں مشرقی جانب مقبرۃ الہند کی جانب تم کچھ چلو گے تو ایک سنگی قبر ملے گی جس کے سرہانے اور پائنتیں پتھر نصب ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ بعض ہندی مشائخ کی قبر ہے، یہ صحیح نہیں ہے، مقبرۃ الہند سیدی عبداللہ رومی کی تربت کے قریب ہے، یہ جگہ " زقاق الہند " کے نام سے مشہور رہے، میں نے یہاں ایک قبر پر شیخ عمر الہندی اور دوسری قبر پر شیخ محمد الہندی لکھا ہوا دیکھا ہے، یہاں ہندی مشائخ کی ایک جماعت دفن ہے جن کا نشان مٹ چکا ہے۔

شیخ ابو نصر فتح بن عبداللہ سندیؒ

شیخ ابو نصر فتح بن عبداللہ سندی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار امام شافعیؒ کے تلامذہ کے دوسرے طبقہ میں ہے، آل حسن بن حکم کے آزاد کردہ غلام ہیں، آزادی کے بعد فقہ اور علم کلام کی تعلیم امیر علی محمد بن عبدالوہاب ثقفی سے حاصل کی، شافعی فقہ اور علم کلام میں مہارت رکھتے تھے اسی کے ساتھ طبقہ مشائخ میں ان کا شمار تھا اور زہد و تقویٰ میں بلند مقام و مرتبہ رکھتے تھے، عبداللہ بن حسین کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ابو نصر سندی کے ساتھ چل رہے تھے، ان کے پیچھے چلنے والے بہت زیادہ لوگ تھے راستہ میں ہم کو ایک شریف (آل رسول سے) ملا، جو بدمست کیچڑ میں پڑا تھا، اس نے ہم لوگوں کو دیکھ کر ابو نصر کو گالی دی اور کہا کہ اے غلام! ہم تو اس حال میں پڑے ہیں اور تمہارے پیچھے پیچھے یہ لوگ چل رہے ہیں، ابو نصر نے اس سے کہا

ایھا الشریف! اتدری لم ھذا	اے شریف! تم سمجھتے ہو یہ بات کیوں ہے؟
لانی متبع آثار جدک وانت	بات یہ ہے کہ میں تمہارے نانا کے نقش قدم

متبع آثار جدی۔ پر چلتا ہوں اور تم میرے نانا کے نقش قدم پر چلتے ہو۔

ابونصر مشیخت کے ساتھ حدیث وفقہ کے عالم تھے۔ انھوں نے محدثین سے حدیث کی روایت کی اور اہل علم نے ان سے روایت کی۔

(الانساب المتفقہ ابن قیسرانی، طبقات الفقہاء الشافعیہ، عبادی انساب سمعانی، معجم البلدان یاقوت حموی)

شیخ ابوعبداللہ محمد بن آدم لاہوری غزنویؒ

شیخ ابوعبداللہ محمد بن آدم لاہوری غزنوی قزوینی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ

عبدالکریم بن محمد رافعی نے اپنی کتاب "التدوین فی اخبار قزوین" میں تفصیل سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں

محمد بن آدم الغزنوی ابوعبداللہ المقرئ المعروف باللهاوری، شیخ متقن فی القراءۃ بارع فی الورع وحسن السمت ومتانۃ الدیانۃ مداوم علی العبادۃ مواظب التہجد۔

ابوعبداللہ محمد بن آدم غزنوی مقری لہاوری (لاہوری) کی نسبت سے مشہور ہیں وہ شیخ فن قرأت میں ماہر، تقویٰ میں بہت آگے، نیک سیرت اور دیانت میں بلند مرتبہ ہیں، عبادت پر مداومت اور تہجد پر مواظبت کرنے والے ہیں

وہ نماز پڑھ رہے تھے اور طلبہ کی ایک جماعت ان کے یہاں قرآن پڑھ رہی تھی اسی دوران بحالت نماز گر گئے، اور طلبہ طرح طرح کا گمان کرنے لگے، ان کے خادم خاص نے جاکر دیکھا اور بتایا کہ اس کی وجہ میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ شیخ رات بھر نماز پڑھتے ہیں اور کھانا بہت کم کھاتے ہیں اسی لئے غشی چھا گئی ہے، وہ ہر معاملہ میں شدت احتیاط سے کام لیتے تھے، میرے خیال میں وہ اپنے کو محمد ابن آدم کہتے تھے اور اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف نسبت مراد لیتے تھے، نسب کے بارے میں یہ ان کی شدت احتیاط تھی۔

وہ قزوین آکر پہلے جوہر خاتون کی خانقاہ میں اترے جس کا دروازہ جامع مسجد کی طرف کھلتا ہے، پھر مدرسہ عنبریہ میں منتقل ہو گئے، جہاں ان کے علم وعمل سے استفادہ اور ان کی سیرت سے برکت حاصل کی جاتی رہی، یہاں تک کہ ۵۴۵ھ میں انتقال کیا اور باب المشبک میں دفن کئے گئے۔ ان کی قبر زیارت گاہِ خلائق ہے۔ ان سے قزوین میں علماء کی ایک جماعت نے تحصیل

علم ہی، میرے والد نے بھی ان سے امام ابوبکر بن مہرانی کی کتاب الغایۃ پڑھی تھی (التدوین فی اخبار قزوین)

شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی شامیؒ

شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ دیبلی شامی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ابن جوزی نے صفۃ الصفوۃ میں سندھ کے شہر دیبل کے برگزیدہ اولیاء میں کیا ہے، اور ان کی طے الارض کی کرامت بیان کی ہے، خود ان کا بیان ہے کہ میرے بعض دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اپنے اہل وعیال کیلئے مکان خرید لوں، چنانچہ میں نے مکان خرید لیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے طے الارض کی جو نعمت دی تھی ختم ہوگئی، ان ہی ایام میں میرے بعض دوستوں نے کہلا بھیجا کہ آج رات فلاں فلاں مقام پر ہم سے ملاقات کرو، یہ مقامات لمبی مسافت پر تھے، میں نے کہلا بھیجا کہ میری طے الارض کی کرامت جاتی رہی، اس کے بعد ان کی توجہ سے پھر مجھے یہ کرامت حاصل ہوگئی۔

شیخ ابوعبداللہ دیبلی تجوید و قراءت کے مشہور عالم بھی تھے، جعفر بن محمد بن سقیط سے یہ فن حاصل کیا تھا، اور ان سے عبدالرزاق بن حسن اور سکن بن بکر دیبی نے قرأت سیکھی۔
(صفۃ الصفوۃ ابن جوزی اور غایۃ النہایہ فی طبقات القراء ابن جزری)

شیخ ابوالعباس محمد بن محمد دیبلیؒ

شیخ ابوالعباس محمد بن محمد بن عبداللہ دیبلی وراق رحمۃ اللہ علیہ عابد و زاہد اور نہایت نیک عالم تھے، کتابت کرکے روزی کماتے تھے، سمعانی نے لکھا ہے

الوراق، الزاھد وکان صالحا عالما　　　وہ وراق (کاتب) زاہد اور نہایت بزرگ عالم تھے

انھوں نے ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی، جعفر بن محمد بن حسن فریابی، عبدان بن احمد بن موسیٰ سکری، محمد بن عثمان بن ابوسوید بصری، اور ان کے معاصرین سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے حاکم ابوعبداللہ وغیرہ نے روایت کی، رمضان ۳۵۴ھ میں انتقال کیا، نماز جنازہ ابوعمرو بن نجید نے پڑھائی۔ (انساب سمعانی)

شیخ مبارک ہندی حلاوی مصریؒ

شیخ مبارک ہندی حلاوی مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر مقریزی نے کتاب الخطط والآثار میں یوں کیا ہے کہ جو زاویہ حلاوی قاہرہ میں جامع ازہر کے قریب واقع ہے اس کے بانی وہی ہیں

انشأها الشيخ مبارك الهندي السعودي الحلاوي احد الفقراء من اصحاب الشيخ ابي السعود بن ابي العشائر البارينی الواسطي في سنة ثمان وثمانين وستمائة واقام بها الى ان مات ودفن فيها۔

اس زاویہ (خانقاہ) کو شیخ ابوالسعود بن ابوالعشائر بارینی واسطی کے مرید و خلیفہ ایک مرد فقیر شیخ مبارک ہندی سعودی حلاوی نے ۶۸۸ھ میں تعمیر کرکے اسی میں قیام کیا حتیٰ کہ اسی میں انتقال کیا اور اسی میں دفن کئے گئے

ان کے بعد ان کے پوتے شیخ عمر بن علی بن مبارک جانشین ہوئے وہ عالم تھے اور احادیث کی روایت کی تھی، ان کے بعد ہمارے شیخ جمال الدین عبداللہ بن شیخ عمر بن شیخ علی بن شیخ مبارک ہندی جانشین ہوئے، انھوں نے حدیث کا درس دیا، میں نے اسی خانقاہ میں ان سے حدیث پڑھی ہے، ان کا انتقال صفر ۸۰۰ھ میں ہوا، ان کی اولاد اسی میں رہتی ہے۔ یہ قاہرہ کی مشہور خانقاہوں میں ہے (کتاب الخطط والآثار)

شیخ ابومحمد ہارون بن محمد بروجی اسکندریؒ

شیخ ابومحمد ہارون بن مہلب بروجی ہندی رحمۃ اللہ علیہ گجرات کے شہر بھروچ کے رہنے والے تھے، حج کے بعد مصر کے شہر اسکندریہ میں مستقل قیام کرلیا تھا نہایت نیک اور عابد و زاہد بزرگ تھے، اسکندریہ کی ایک مسجد میں اذان دیتے تھے، ان کو عربی اور فارسی زبان پر قدرت نہیں تھی، بڑی مشکل سے اپنا مطلب بیان کرتے تھے، ساتویں صدی کے بزرگ تھے۔ (معجم البلدان)

شیخ ابوالمحاسن یوسف سندی مصریؒ

شیخ ابوالمحاسن یوسف سندی مصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ابن زیات نے الکواکب السائرۃ میں صرف اتنا لکھا ہے کہ قاہرہ میں باب الشافعی کے قریب ایک مختصر سا قبرستان ہے جس میں شیخ ابوالمحاسن یوسف سندی کی قبر ہے جو صاحب الرتانہ کے لقب سے مشہور ہیں اور اس کے پہلو میں شیخ حمزہ تقدوسی خیاط کی قبر ہے (الکواکب السائرۃ)

شیخ ابوالحسن منصوری بغدادیؒ

شیخ ابوالحسن منصوری بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سندھ کے قدیم شہر منصورہ کے رہنے والے تھے

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے اصحاب کبار میں ہیں، سبکی نے طبقات الشافعیہ میں حضرت جنید بغدادی کے تذکرہ میں ان سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا کہ بندہ کو کس وقت عاقل کہا جا سکتا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ میں نے سری قسطیؒ سے سنا ہے کہ جب بندہ کے جوارح سے کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے بُرا بتایا ہے تو وہ عاقل ہو جاتا ہے۔ (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ)

شیخ ابو عبداللہ سندی طالقانیؒ

شیخ ابو عبداللہ سندی طالقانی رحمۃ اللہ علیہ طالقان رے میں قیام کرتے تھے، کبار مشائخ میں نہایت جلیل القدر بزرگ تھے، سمعانی کہتے ہیں، من کبار مشائخہم وجلتہم یعنی وہ صوفیہ کے مشائخ کبار میں تھے۔ اور قزوینی نے لکھا ہے لہ آیات وکرامات یعنی وہ صاحب کشوف و کرامات بزرگ تھے، شیخ ابو عبدالرحمٰن سلمی نے تاریخ الصوفیہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، ۳۱۰ھ سے پہلے انتقال کیا۔ (انساب سمعانی اور التدوین فی اخبار قزوین)

شیخ ابو علی سندی بغدادیؒ

شیخ ابو علی سندی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے اولیائے کبار اور اہل حقائق و مواجید میں تھے، حضرت بایزید بسطامی کے شیخ اور استاد ہیں، ان کا بیان ہے کہ میں شیخ ابو علی کو فرائض کی تعلیم دیتا تھا اور وہ مجھے صرف توحید و حقائق کی تعلیم دیتے تھے، نیز ان کا بیان ہے کہ ایک دن میرے استاد ابو علی سندی میرے پاس آئے، ان کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور اس کو میرے سامنے الٹ دیا تو اس میں سے قسم قسم کے جواہر زمین پر بکھر گئے، میں نے دریافت کیا کہ یہ جواہر آپ کو کہاں سے ملے ہیں۔ بتایا کہ میں فلاں جگہ سے گذر رہا تھا اور یہ جواہر چراغ کی طرح چمک رہے تھے، ان ہی میں سے میں نے اٹھا لیا ہے، میں نے پوچھا اس وقت آپ کس حال میں تھے؟ تو بتایا کہ یہ فترت کا وقت تھا، یعنی وجد و کیف ان جواہر کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔
(جامع کرامات الاولیاء، شیخ یوسف نبہانی اور نزہۃ الخواطر)

شیخ ابو محمد دبیلی بغدادیؒ

شیخ ابو محمد دبیلی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت جنید بغدادیؒ کے اصحاب کبار میں ہیں، خطیب بغدادی نے

شیخ ابو محمد جریری کے ذکر میں لکھا ہے کہ ابو محمد دبیلی کا بیان ہے کہ حضرت جنید کی وفات کے وقت میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے بعد ہم کس کی مجلس میں بیٹھیں گے تو کہا کہ ابو محمد جریری کے پاس بیٹھنا، شیخ ابو محمد جریری اولیائے کبار میں تھے، شیخ جنید ان کا بہت احترام کرتے تھے

(تاریخ بغداد)

شیخ ابوموسیٰ دبیلی بغدادیؒ شیخ ابو موسیٰ دبیلی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تصریح ہے کان ابن اخت ابی یزید البسطامی یعنی شیخ بایزید بسطامی کے بھانجے تھے اپنے وقت کے مشہور عابد و زاہد اور شیخ تھے، ان کا مستقل حال معلوم نہ ہوسکا، البتہ کتابوں میں حضرت بایزید بسطامی کے بہت سے اقوال ان سے مروی ہیں مثلاً صفۃ الصفوہ میں ہے کہ ابو موسیٰ نے کہا ہے کہ میں نے بایزید سے سنا ہے کہ لوگ قیامت کے دن حساب سے بھاگتے ہیں اور میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے حساب لے، لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیوں چاہتے ہو تو بتایا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس درمیان میں مجھے یاعبدی (اے میرے بندے) کہے اور میں لبیک کہوں اس کا مجھے عبدی (میرے بندے) کہہ دینا میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے، اس کے بعد جو چاہے کرے، صفۃ الصفوہ میں اس طرح ان کے کئی اقوال ابو موسیٰ سے منقول ہیں اور ابو عبدالرحمٰن سلمی نے طبقات الصوفیہ میں شیخ ابوموسیٰ دبیلی سے روایت کی ہے کہ میں نے بایزید سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو لذت و حلاوت عطا کرتا ہے اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قرب کے حقائق سے نوازتا ہے۔

(صفۃ الصلوٰۃ اور طبقات الصوفیہ)

شیخ غلام ہندیؒ شیخ غلام ہندی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے رہنے والے تھے، اور حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ متوفی ۴۲۵ھ کے اصحاب و مریدین میں درجۂ کمال پر فائز تھے، ان کا مستقل حال نہیں مل سکا، اور نہ یہ معلوم ہوسکا کہ وہ غلام نوکر اور ملازم کے معنی میں تھے یا واقعی غلام تھے، ایک واقعہ سے ان کے علو مرتبت کا پتہ چلتا ہے۔

سلطان محمود غزنوی نے ایک مرتبہ شیخ ابوالحسن خرقانی سے ان کی مسجد میں ملاقات کرنا چاہا تو پہلے اپنے آدمی کو ان کے پاس بھیج کر معلوم کیا کہ وہ سلطان محمود کو پہچانتے ہیں یا نہیں؟

جب شیخ ابوالحسن خرقانی نے سلطان کو مسجد کے اندر آتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ

آن را خدا فرا پیش کرد است بگوید کہ فرا پیش آید — اے محمود! اللہ نے جس کو مقدم کیا ہے تم سے کہا ہے کہ تم بھی اس کو مقدم رکھو۔

سلطان محمود شیخ کے سامنے مؤدب بیٹھ گیا اور آپ نے اس کو وعظ و نصیحت فرمائی، اسی وقت مسجد کے دروازے پر ایک ہندی غلام کھڑا ہوا شیخ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیخ نے کہا کہ غلام سامنے آؤ اور جب وہ سامنے آگئے تو شیخ نے سلطان محمود سے کہا کہ محمود! تم اس غلام کو پہچانتے ہو؟ سلطان نے نفی میں جواب دیا تو شیخ نے کہا کہ تمھارے لشکر میں اس کالے غلام جیسے کتنے سپاہی ہوں گے؟ سلطان نے کہا کہ شاید دس ہزار تک ان کی تعداد پہونچ جائے۔ شیخ نے کہا کہ اس غلام کے علاوہ کوئی ایسا تمھارے لشکر میں نہیں ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہو، یہ جملہ سنتے ہی سلطان نے جلدی سے اٹھ کر اس غلام سے معانقہ کیا اور کہا کہ آپ اس کے اور میرے مابین بھائی بندی کرادیں۔

اس کے بعد سلطان محمود نے شیخ ابوالحسن خرقانی کی خدمت میں دینار کی تھیلیاں پیش کیں اور شیخ کے انکار پر کہا کہ یہ رقم آپ اپنے اصحاب و مریدین میں تقسیم کردیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم نے اپنے لشکر کو پہلے ہی تنخواہ دیدی ہے جو ان کو پہونچ چکی ہے، تم اس رقم کو اپنے لشکر کے لئے محفوظ رکھو (انساب سمعانی)

بقیہ صفحہ ۱۹۶ سے — سماع صوفیاء کرام کی نظر میں۔

(۳) مضمون فحش اور ناجائز نہ ہو۔

(۴) سماع کے ساتھ آلات موسیقی اور باجے نہ ہوں۔

"اقتباس الانوار" سے لے کر یہاں تک تمام تر عبارات مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب السنۃ الجلیۃ فی الچشتیۃ العلیۃ" کے مختلف مقامات سے نقل کی گئی ہیں۔

یہ ہیں ائمہ مجتہدین کے مذاہب اور بزرگان دین کے اقوال جنھیں بڑی عرق ریزی اور محنت سے جمع کیا گیا ہے تاکہ قارئین کے سامنے متعلقہ مسئلہ کے تمام پہلو واضح ہوجائیں چنانچہ اب اللہ کے فضل و کرم سے مسئلہ کی حقیقت تک پہنچنا آسان ہوگیا ہے

پروفیسر نثار احمد فاروقی نئی دہلی

حضرت خواجہ معین الدین سجزی اجمیریؒ

ہندوستان میں تصوف کے دو خانوادوں نے سب سے پہلے نفوذ کیا، سہروردی سلسلہ مغربی علاقوں میں خاصا مقبول ہو چکا تھا اور اس کے مبلغین شمالی ہندوستان کی طرف بھی بڑھتے آرہے تھے، لیکن چشتیہ سلسلے کا فروغ حضرت خواجہ معین الدین سجزی علیہ الرحمۃ کے قدوم میمنت لزوم کے ساتھ ہوا، اور آپ نے مغربی سرحدوں سے آگے بڑھ کر ہندوستان کے قلب میں اپنے مشن کی تبلیغ کی، اور اجمیر کو ہمیشہ کے لئے روحانیوں کا قبلہ وکعبہ بنا دیا۔

سہروردی سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے چشتی سلسلے کے بزرگوں نے بھی فیض حاصل کیا تھا، اور ان کی بلند پایہ تصنیف عوارف المعارف تو کہنا چاہئے کہ اہل تصوف کی رہنما کتاب تھی، اور یہ ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جن میں ایک تو قرآن و سنت کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تصوف محض عجمی اور غیر اسلامی چیز نہیں ہے بلکہ یہ دین کی روح کا نام ہے، دوسرے اس کے تمام نظری مباحث پر پوری وضاحت سے لکھا گیا ہے علمائے ظاہر نے اہل تصوف کے خلاف جو محاذ تیار کیا تھا اسے عوارف المعارف اور کشف المحجوب جیسی کتابوں نے بیت عنکبوت سے زیادہ کمزور بنا دیا ہے اور لے دے کر صرف ایک سماع کا مسئلہ ایسا رہ گیا تھا جس پر وہ "محضر" تیار کر سکتے تھے، سہروردی بزرگوں نے تصوف کے نظری مباحث پر خوب خوب لکھا اور یہ سلسلہ بعد میں کئی صدیوں تک جاری رہا لیکن چشتیہ سلسلے کی مقبولیت کے دو بڑے اسباب تھے، ایک تو یہ کہ چشتی بزرگوں نے حاکمانِ وقت سے اپنے روابط نہیں رکھے بلکہ عوام کے پس ماندہ طبقوں سے گہرا تعلق قائم کیا، سلاطینِ تغلق کے زمانے تک سہروردی سلسلے کے بزرگوں کو قصر سلطانی میں اتنا رسوخ حاصل تھا کہ وہ نہ صرف حاجت مندوں کی عرضیاں لے کر بادشاہ کو پیش کرتے تھے بلکہ حضرت رکن الدین ملتانیؒ نے اپنا رسوخ استعمال کر کے محمد تغلق کے ہاتھوں ملتان کو قتل عام سے بچا لیا تھا، مگر چشتیہ سلسلے

کے بزرگ اس کے برعکس ان پریشان حال درماندہ اور حاجت مندوں کے لئے دعا اور تعویذ ہی پر قناعت کرتے تھے، اس کی نوبت تقریباً نہیں آتی تھی کہ وہ کسی کے لئے بادشاہِ وقت سے سفارش بھی کریں، اس طرح ابتداء میں اس خانوادے کے بزرگوں نے تصنیف و تالیف سے احتراز کیا چنانچہ اگر حضرت نظام الدین نے یہ فرمایا کہ

"ہمارے مشائخ میں سے کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی"

تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چشتی بزرگوں نے تصوف کے نظریاتی مباحث پر ایسی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جیسی مرصادالعباد، قوت القلوب، کشف المحجوب، التعرف، عوارف المعارف یا آداب المریدین وغیرہ ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ چشتی بزرگوں نے تصوف کو سراسر "حال" سمجھا اور اس میں "قال" کو دخل نہیں دیا، وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تصوف تمام تر عمل ہے اس کا فلسفے کی طرح شرح و بیان میں آنا مشکل ہے، اور جو کچھ قیدِ الفاظ میں آئے گا وہ "تصوف" نہیں ہوگا، عبدالرحیم خان خاناں کا دوہا اسی مضمون کا ہے

رَحیمَن بات اَگَم کی کَہَن سُنَن کی ناہیں
جانَت ہیں سُو کہَت نہیں، کہَت سُو جانَت ناہیں

اور حضرات چشتیہ کے اس نظریے کو شیخ سعدی شیرازیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے

اے مرغِ سحر عشق زپروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیان در طلبش بے خبرانند آں را کہ خبر شد باز نیامد

اس لئے چشتی سلسلے کے بزرگوں نے تصوف کی نظری صورت کو چھوڑ کر اس کی عملی شکل پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور انھیں اپنا پیغام عام کرنے میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کا راز بھی یہی تھا

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک دن ایک نوجوان اپنے ساتھ اپنے ایک ہندو دوست کو لے کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں آیا اور اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "ایں برادر من است"

حضرتؒ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ "تمھارے اس بھائی کو کچھ اسلام کی طرف بھی رغبت ہے یا نہیں؟"

اس نے کہا میں اسے مخدوم کی خدمت میں لے کر اسی لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی نگاہ کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور فرمایا:

" ایں قوم را چنداں بگفتہ کسے دل نگردد، اما صحبت صالح بیابد امید باشد کہ

برکت صحبت او مسلماں شود "

(اس قوم پر کسی کے کہنے سننے سے اثر نہیں ہوتا ہاں اگر کسی صالح کی صحبت نصیب ہو جاتی ہے تو امید ہوتی ہے کہ اس کی برکت سے مسلمان ہو جائے)

یہ واقعہ فوائد الفواد میں ۴ رمضان ۷۱۰ھ کی مجلس کے بیان کے ضمن میں آگیا ہے لیکن یہ چشتی صوفیہ کے مشن کو سمجھنے کے لئے بے حد اہم اور قابلِ غور نکتہ ہے، خود حضرت کا سوال کرنا کہ "ایں برادر تو ہیچ میل بہ مسلمانی دارد؟" دعوتِ حق سے گہرے قلبی تعلق کو ظاہر کرتا ہے اور جب اس لڑکے نے دعا کی درخواست کی تو آپ کا "چشم پر آب" ہو جانا قرآن کے اس فرمان کی نہایت گہری اور اصلی عملی ترجمانی ہے کہ۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (پارہ ۴ آیت ۱۰۴)

اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلام کی روح کو ان بزرگوں نے کیسا سمجھا تھا حدیث شریف میں ہے کہ "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" دین خیر خواہی کا نام ہے، اور یہی وہ سچی خیر خواہی ہے جو حضرت نظام الدینؒ کو اس موقع پر چشم پُر آب کر دیتی ہے، آپ نے تبلیغ دین کا اصول بھی بتا دیا کہ جس "خیر" کی طرف تم کسی کو بلا رہے ہو اُس کا نمونہ خود بن کر دکھاؤ، تب دعوت الی الخیر کا حق ادا ہوگا، قرونِ وسطیٰ میں علمائے سوء کا کردار کچھ بھی رہا ہو لیکن جو صاحب کردار علمائے شرع تھے انھوں نے بھی خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان میں دعوت دین کیلئے "تصوف" کی ضرورت ہے، بحث و مناظرے کی نہیں۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے ہم عصر مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار بہت ممتاز محدث اور عالم تھے، ان کے ہم عصر علماء میں کوئی بھی علم حدیث اور فقہ میں ان کا ہم پایہ نہ تھا، وہ ان معدودے چند علماء میں سے تھے جنھوں نے اس زمانے میں بغداد اور حجاز پہنچ کر

حدیث کی سماعت کی تھی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فوائد الفواد میں ان کی تعریف میں بہت کچھ فرمایا ہے۔ ان کی تالیف مشارق الانوار آج بھی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور حدیث کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے، علامہ صغانی کی ایک اور تالیف مصباح الدجیٰ بھی تھی، چنانچہ جب مولانا ناگور پہونچے ہیں تو انھوں نے ایک محفل میں اور ایک ہی نشست میں پوری مصباح الدجیٰ کی قرأت کی تھی اور سماعت کرنے والوں کا بڑا بھاری مجمع تھا جس میں قاضی حمیدالدین ناگوریؒ اور قاضی کمال الدینؒ جیسے فضلاء بھی استفادے کیلئے موجود تھے۔ مولانا صغانی خوب بڑی سی پگڑی باندھتے تھے جس کی چھور آگے کی طرف نکلی ہوتی تھی، بہت لمبی چوڑی آستینوں کا کرتا ہوتا تھا، یہ اس زمانے کے علماء کی ہیئت تھی، یہیں ناگور کے ایک صاحب نے مولانا سے بہت اصرار کیا کہ میں آپ سے کچھ "علم تصوف" سیکھنا چاہتا ہوں، مولانا نے کہا کہ یہاں تو مجھے بالکل فرصت نہیں ہے لوگ حدیث کی سماعت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور اتنا وقت نہیں بچتا کہ تمھیں علم تصوف سکھاؤں، البتہ اگر تمھیں ایسی ہی خواہش ہے تو میرے ساتھ چلو، جب ہم غیر مسلموں کے علاقے میں پہونچیں گے جہاں علم حدیث اور فقہ کے طلب گاروں کا اتنا ہجوم نہیں ہوگا تو میں تمھیں اطمینان سے علم تصوف سکھا دونگا چنانچہ مولانا اور یہ تصوف کے طالب علم نکلے اور ناگور سے جالور کی طرف راہی ہوئے، گجرات کی سرحد کے شروع ہوتے ہی مولانا نے اپنا لمبی آستینوں والا کرتا اور بڑی پگڑی لپیٹ کر ایک بقچے میں رکھی اور کوتاہ آستینوں کا درویشوں والا لباس زیب تن کیا، سر پر کلاہ، پاؤں میں جوتے کی جگہ کھڑاویں آگئیں، ایک مٹی کا آبخورہ پانی پینے کے لئے لے لیا، اور نماز و نوافل پڑھتے ہوئے سفر کی منزلیں طے کرنے لگے، جب اس طرح کئی دن گذر گئے تو اس طالب علم تصوف نے کہا کہ مولانا آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے کچھ علم تصوف سکھائیں گے اور اس امید پر میں گھربار چھوڑ کر آپ کے ساتھ لگ گیا ہوں مگر آج اتنے دن ہوگئے آپ نے ایک بات بھی نہیں سکھائی، مولانا فرمانے لگے کہ میاں علم تصوف "قال" نہیں ہے "حال" ہے جیسے میں عبادت کر رہا ہوں اور عام لوگوں سے برتاؤ کر رہا ہوں بس ویسے ہی تم بھی کئے جاؤ، یہی علم تصوف کہلاتا ہے۔[1]

---

[1] سرور الصدور و نور البدور (قلمی) نسخہ حبیب گنج علی گڑھ

مولانا صغانی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور محدث ہوئے ہیں، اس دور کے جید علماء اُن کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے، لیکن وہ بھی یہ نکتہ اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے کہ یہ معقولی اور منقولی بحثیں، یہ مناظرے اور مکابرے، یہ فلسفہ اور منطق یہ مسئلے اور تاویلیں صرف اسلام کے ظاہر کو پیش کرسکتی ہیں، اس کی روح کو اور بھی خفی اور بے اثر بنا دیتی ہیں، اسلام کی اصلی تعلیم وہی ہے جسے صوفیا اپنے عمل سے پیش کر رہے ہیں اور اسی نے ہندوستان میں اسلام کو فروغ دیا اور دلوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے، چنانچہ مولانا صغانی بھی جب غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں جاتے ہیں تو صوفیا کا لباس زیب تن کر لیتے ہیں اور اپنا جوغا تہ کرکے رکھ دیتے ہیں۔

اس مقدمے میں دو باتیں واضح ہوگئیں، ایک تو یہ کہ سہروردی سلسلے کے بزرگوں نے تصوف کی نظری سطح پر تشریح و تفسیر کی اور اس کے علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر کتابیں تصنیف کیں جن سے دوسرے سلسلے والوں نے بھی فائدہ اٹھایا مگر اپنے خانقاہی نظام عمل میں انھوں نے دین اور دنیا کے جام و سندان کو ایک توازن کے ساتھ یکجا رکھنا چاہا اور حاکمانِ وقت پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی، اس لئے ان کی خانقاہیں زمان و مکان کے اعتبار سے محدود ہو کر رہ گئیں جب کہ چشتیوں کی خانقاہیں چھوٹے چھوٹے دیہات و قصبات تک میں پہنچ گئیں اور عوام کے دلوں میں ان کے لئے گھر بن گئے، اس دین و دنیا کی آمیزش سے پیدا ہونے والے تضاد کو ابتدا ہی میں محسوس کرکے چشتی صوفیا نے "ترک" کے فلسفے پر زور دیا اور اپنے مریدوں کو اس کی تربیت دینے کے لئے "چہار ترکی" کلاہ پہنانی شروع کر دی، ان کا کہنا تھا کہ

"مرد عالی ہمت نشود تا ترکِ دنیا نگیرد"

اور اس "ترک" کا پھل یہ تھا کہ جب دہلی کے "شیخ الاسلام" کو حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی سے حسد ہونے لگا اور اس کی شکایت پر حضرت خواجہ غریب نواز نے یہ فرمایا کہ،

"قطب الدین تم میرے ساتھ اجمیر چلو میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی جانشین کی وجہ سے کسی کو تکلیف پہونچے"

اور حضرت بختیار کاکیؒ اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں دہلی کو خیر باد کہہ کر جانے لگے تو آپ کو رخصت کرنے کیلئے ہزار ہا مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے گریہ وزاری کرتے ہوئے آپ کے پیچھے پیچھے شہر پناہ سے باہر تک نکل آئے، اس ہجوم میں بوڑھا بادشاہ التمش بھی موجود تھا سب کی یہ حالت دیکھ کر حضرت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا ارادہ فسخ کر دیا۔

یہ واقعہ بہت ہی مشہور ہے اور کتب تواریخ میں چشتی حضرات کے عوام سے براہ راست رابطے کی سب سے قدیم اور بدیہی مثال یہی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ بزرگ خانقاہوں میں بیٹھ کر محض انفرادی نجات کے حصول کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی مسائل سے خود کو بہت گہرائی تک وابستہ کر لیا تھا، انھوں نے ملوک وسلاطین اور سرکار دربار کو کبھی منھ نہیں لگایا، نہ کبھی دنیا کی دولت حاصل کرنے کی کوشش کی اور وہ آئی تو اسے جمع کر کے نہیں رکھا، اس طرح اپنی عملی زندگی سے یہ ثابت کر دیا کہ دراصل فقر بھی ایک عظیم دولت ہے

وہ غریبوں مسکینوں، درماندہ حال اور پسماندہ طبقے کے انسانوں کی نمائندگی کرتے تھے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی متابعت کرتے تھے۔ ان کی دعا یہ ہوتی تھی اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَ اَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ۔ غریبوں اور مسکینوں سے سچی محبت کی مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اپنی زندگی اور موت اور حشر ونشر بھی ان کے ساتھ طلب کیا جائے۔ چشتی بزرگوں کی خانقاہوں میں ہمیشہ مفلسوں اور مسکینوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے

حضرت نظام الدین اولیاءؒ جب بارہ تیرہ برس کے ہی تھے اور بدایوں میں علم لغت پڑھ رہے تھے اس وقت ایک قوال نے جس کا نام ابوبکر خراط تھا۔ ان کے استاد کے سامنے بہت سی ان خانقاہوں اور درویشوں کا تذکرہ کیا جہاں وہ حاضری دے چکا تھا، اس نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ کی خانقاہ کا تذکرہ کیا تو اس کے ساتھ ان کی دولت مندی اور خدم و حشم کا ذکر ہونا لازمی تھا حضرت نظام الدینؒ نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا مگر حضرت بابا فریدؒ کے فقر محض کا حال سنکر انھیں خاص کیفیت کا احساس ہوا اور انھوں نے اسی وقت یہ طے کر لیا تھا کہ کبھی نہ کبھی شیخ کی خانقاہ میں حاضری ضرور دیں گے۔ ان کی یہ طبعی کشش بھی دراصل چشتی فقر کی طرف تھی جس کی ترویج کے لئے آگے چل کر آپ کو اپنی زندگی وقف کرنا تھی، بقول خود ان کے

پیر و مرشد حضرت بابا فرید" کا یہ حال تھا کہ" دونوں عالم نظر میں ہیچ تھے"۔

ایک بار عصائے کر چل رہے تھے اس پر تکیہ کرنے کا خیال آیا تو فوراً ہاتھ سے پھینک دیا اور ان کے یہ مرید بھی ایسے تھے کہ جب انھوں نے کسی سے سُنا کہ حضرت بہاء الدین زکریا رح نے اپنے بیٹے شیخ رکن الدین کو کوئی خاص وظیفہ تعلیم کیا تھا تو آپ کو بہت دنوں تک یہ فکر رہی کہ کسی طرح وہ وظیفہ معلوم ہوجائے ۔ بارے جب شیخ رکن الدین ملتانی رح سے ملاقات ہوئی تو آپ نے وہ وظیفہ حضرت نظام الدین رح کو بھی بتادیا ۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں ایک جگہ لفظ — " یَا مُسَبِّبُ الاسباب " بھی آتا ہے ، بس یہ " اسباب " کا نام دیکھ کر طبیعت نے إبا کیا اور جس دُعا کے حصول کے لیے آپ برسوں منتظر رہے تھے ، جب وہ مل گئی تو اسے کبھی ایک بار بھی نہیں پڑھا۔

چشتی سلسلے کے ممتاز بزرگوں میں حضرت بابا فرید" اور حضرت نظام الدین اولیاء کے کچھ حالات اور واقعات ہمیں مل جاتے ہیں جن سے چشتی خانقاہوں کے نظام اور بزرگوں کی تعلیمات کا اندازہ ہوتا ہے ، لیکن حضرت خواجہ بزرگ کے بارے میں تاریخ اور تذکرے ہمیں بہت ہی کم معلومات فراہم کرتے ہیں اور بعد کے زمانے میں کچھ روایات کے اضافوں نے اس تھوڑے سے تاریخی مواد کو بھی مبہم بنادیا ہے ۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خواجہ صاحب کے حالات میں قدیم ترین کتاب سیرالاولیاء ہے جو حضرت خواجہ اجمیری رح کے وصال سے تقریباً سوا سو برس کے بعد مرتب ہوئی ہے ، اس میں جو معلومات درج ہیں ان پر کچھ اضافہ شیخ جمالی دہلوی مؤلف سیرالعارفین نے کیا ہے جو سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے اور عہد ہمایوں بادشاہ میں سیر و سیاحت کرنے بھی نکلے تھے ، وہ خواجہ بزرگ کے وطن اصلی سیستان بھی پہونچے تھے اور انھوں نے حضرت خواجہ اور آپ کے خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ مواد وہاں کی مقامی روایتوں سے بھی فراہم کیا ہوگا ۔ لیکن بہ حیثیت مؤرخ پروفیسر محمد حبیب کا یہ خیال صحیح ہے کہ خواجہ بزرگ اور شیخ جمالی دہلوی کے عہد میں تقریباً تین صدیاں حائل ہیں ، اور یہ بات بہت ہی مستبعد اور مشتبہ ہے کہ شیخ جمالی کو اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی سیستان

میں کچھ ایسے معتبر رُواۃ مل سکے ہوں جو خواجہ بزرگؒ کے بارے میں کچھ مستند معلومات فراہم کرسکتے ہوں
خواجہ بزرگ کے جو حالات اب ہمیں معلوم ہیں اور متداول تذکروں میں ملتے ہیں ان میں شیخ
جمالی کے سفر سیستان وغیرہ کی "رہ آورد" کیا ہے؟ اور اس کا استناد کس درجے کا ہے؟
یہ ایک علیحدہ تحقیق کا موضوع ہے، لیکن مجھے سر دست صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پروفیسر
محمد حبیب کی اس رائے میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے، جہاں تک خواجہ صاحب کے
بارے میں تاریخی شہادتوں کا سوال ہے، عہد وسطیٰ کے بعض مورخوں کی رائے میں آپ کا تذکرہ
سب سے پہلے طبقات ناصری میں پایا جاتا ہے جو ۶۵۸ھ (۱۲۶۰ء) کی تصنیف ہے،
اس کے مصنف قاضی منہاج سراج جوزجانی ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں پیدا ہوئے تھے، اور
اجمیر، سوالک، ہانسی، سرسی وغیرہ علاقے رائے پتھورا کی شکست کے بعد ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء)
میں فتح ہوئے تھے اس سے اگلے سال ۵۸۹ھ میں قطب الدین ایبک نے پہلے میرٹھ
پھر دہلی کو فتح کیا تھا، ۶۲۱ھ (۱۲۲۴ء) میں وہ ایک سفارت لے کر قہستان گئے تھے، اور
وہاں سے واپس آنے کے بعد ۶۲۴ھ میں مدرسہ فیروزی اوچھ کے نگراں مدرس بنادئے گئے
تھے، وہ ۶۲۵ھ میں التمش کے لشکر کے ساتھ دہلی آگئے تھے اس لئے اگر خواجہ بزرگ سے
ان کی ملاقات ہوئی تو اس کا زمانہ ۶۲۵ھ اور ۶۳۳ھ کے درمیان آٹھ سال کا عرصہ ہوسکتا
ہے جب وہ لشکر شاہی میں شامل ہوکر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم رہے تھے
مگر انھوں نے خواجہ بزرگ سے اپنی ملاقات کا حال واضح اور راست انداز میں کہیں نہیں
لکھا ہے۔ جہاں رائے پتھورا کی شکست کا ذکر ہے اس موقعے پر کہتے ہیں:

> "ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارفِ جبالِ بلادِ تولک بود، لقبِ او معین الدین
> اوشی گفت کہ من دراں لشکر با سلطان غازی بودم عدد سوارِ لشکرِ اسلام دراں وقت
> صد و بست ہزار برگستواں بود" [1]

طبقات ناصری کے اس حوالے کا بھی گہرا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، مجھے یہ ماننے میں
بہت تامل ہے کہ یہ بیان حضرت خواجہ بزرگ کے بارے میں ہوسکتا ہے، یہ درست

---

[1] طبقات ناصری، ص ۱۹

ہے کہ اکثر فاتحین نے اپنے لشکر کے ساتھ چشتی بزرگوں کو برائے حصولِ برکت شریک سفر رکھا ہے اور یہ بزرگ زمین یا خزانوں کے لالچ میں نہیں بلکہ تبلیغ دین اور حمایت شرع مبین کے جذبے کے ساتھ اس لشکر کشی میں شامل ہوتے تھے، خواجہ بزرگ بھی اس وقت ہندوستان میں تھے اور شہاب الدین غوری اپنی ہر مہم میں کچھ درویشوں، بزرگوں اور عالموں کو ساتھ لیکر نکلتا تھا، چنانچہ علی گڑھ کی مہم میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے نورالدین مبارک غزنوی اور ان کے بھانجے حضرت نظام الدین ابوالمؤید اس کے ساتھ تھے اور فتح کے بعد اس علاقے کی قضا ان کے خاندان کے حوالے کی گئی تھی، اجمیر کی مہم میں خواجہ بزرگ کی روحانیت نے جو مدد کی اس کا حوالہ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات میں بھی آتا ہے لیکن یہاں منہاج سراج نے جس انداز سے تذکرہ کیا ہے اسے دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ خواجۂ بزرگ کی سی عظیم شخصیت کا ایسا سرسری حوالہ نہیں ہوسکتا کہ صرف۔ از ثقہ شنیدم، کہہ کر گذر جائیں۔

اگر طبقات ناصری کے اس بیان کو خواجہ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو پھر آپ کا قدیم ترین حوالہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں ملتا ہے، فوائد الفواد میں حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی علیہ الرحمۃ کا نام مبارک صرف تین مقامات پر آیا ہے وہ بھی براہِ راست نہیں ہے بلکہ ضمناً ہے۔

۱۵ ارمحرم ۷۱۰ھ کی مجلس میں یہ تذکرہ تھا کہ سلامتی ایمان کی کیا علامت ہے، حضرت نظام الدین اولیاء نے حاضرین سے فرمایا کہ نگاہ داشتِ ایمان کے لئے نماز مغرب کے بعد دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں، پھر ان کی ترکیب بیان فرما کر یہ واقعہ سنایا کہ:

"میں نے شیخ معین الدین حسن سجزی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے پوتے خواجہ احمد کی زبانی سُنا اور یہ خواجہ احمد بہت ہی صالح تھے انھوں نے کہا کہ میرا ایک ساتھی تھا سپاہی، وہ ہمیشہ دو نفل حفظ ایمان کے لئے پڑھا کرتا تھا حتیٰ کہ ایک بار ہم لوگ ناوقت حدود اجمیر میں تھے، مغرب کی نماز کا وقت آگیا اُس علاقے میں رہزنوں کا بہت اندیشہ تھا اور ڈاکو دور سے نظر بھی آنے لگے ہم نے جلدی جلدی تین فرض اور دو سنتیں پڑھیں اور شہر کی طرف آگئے وہ ساتھی باوجود

اس کے کر رہزن نمودار ہوگئے تھے، یہ نفل پڑھنے میں مشغول ہوگیا، پھر جب اس دوست کے انتقال کا وقت آیا تو میں تحقیق حال کیلئے اس کی تربت پر آیا تو دیکھا کہ جس شان سے اسے دنیا سے جانا چاہئے تھا اسی طرح گیا ہے، حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ خواجہ احمد تو اس جوان کے انتقال کا قصہ سنا کر یہ کہتے تھے کہ اگر مجھے گواہی کے لئے کسی قضا کے سامنے لے جائیں تو میں گواہی دوں گا کہ وہ باایمان گیا ہے"[1]

دوسرے موقع پر ۲۱ ذی قعدہ ۷۱۸ھ کی مجلس میں شیخ حمید الدین سوالی کے بیان میں یہ فرمایا کہ۔

: مرید شیخ معین الدین بود ہم خرقہ شیخ قطب الدین"[2]

تیسرا حوالہ ۵ رمضان ۷۲۰ھ کی مجلس میں اس طرح ہے کہ

"حضرت شیخ معین الدین سجزی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے خواجہ وحید الدین اجودھن میں حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں آئے اور ان سے بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی، بابا صاحب نے فرمایا کہ مجھے یہ نعمت آپ کے ہی خاندان سے ملی ہے میرے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ کو بیعت کروں مگر انھوں نے بہت اصرار و الحاح کیا کہ مجھے تو آپ سے ہی مرید ہونا ہے تو بابا صاحب نے دست بیعت بڑھا دیا"[3]

ان تین حوالوں کے سوا خواجہ بزرگ کے نام فوائد الفواد میں اور کہیں نہیں آیا اور ان میں بھی آپ کے دو پوتوں خواجہ احمد اور خواجہ وحید الدین علیہما الرحمۃ کا تذکرہ ہے خود خواجہ صاحبؒ کا نہیں، اگر منہاج سراج والے حوالے کو خواجۂ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو فوائد الفواد وہ قدیم ترین کتاب ہے جس میں خواجۂ بزرگ کا اسم مبارک پہلی بار ۷۱۰ھ کی مجلس میں ملتا ہے، اگر فوائد الفواد کے ان حوالوں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ حضرت خواجہؒ سے براہ راست متعلق نہیں ہیں بلکہ آپ کے پوتوں کے تذکرے میں ضمناً آپ کا نام مبارک آیا

---

[1] فوائد الفواد: ص ۷۷، ۷۸، [2] ایضاً: ص ۳۲۶ - [3] ایضاً، ص ۴۰۵ -

ہے تو پھر ہمارے معلوم اور موجود ماخذ میں سیرالاولیا ہی وہ قدیم ترین کتاب رہ جاتی ہے جس میں حضرت خواجہ بزرگ کا تذکرہ ملتا ہے، سیرالاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجۂ بزرگ بیس سال تک سفر وحضر میں اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے ساتھ رہے تھے، اس کتاب سے آپ کا بغداد اور حجاز کا سفر کرنا اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونا بھی دریافت ہوتا ہے حالانکہ حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ میں سے کسی نے حج نہیں کیا، مؤلف سیرالاولیاء نے حضرت خواجہ بزرگ کی چند کرامتیں بھی لکھی ہیں جن کا دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں بھی اعادہ ہوا ہے، لیکن امیر خورد نے سب سے اہم بات یہ لکھی ہے کہ۔

• آپ کی کرامات اور علوے درجات کے ثبوت میں اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے کہ خواجہ بزرگ کے سلسلے سے وابستہ ہونے والے ایسے عظیم المرتبت انسان ہوئے ہیں اور انھوں نے بندگان خدا کی ایسی دستگیری کی ہے اور انھیں دنیا کے مکروفریب سے بچایا ہے کہ قیام قیامت تک ان کی عظمت کا غلغلہ فلک وملک کے کانوں میں گونجتا رہے گا، اور ان سے محبت کرنے والی مخلوق کو اس محبت کے طفیل "مقعد صدق" میں جگہ ملتی رہے گی، پھر مؤلف کہتا ہے کہ اس آفتاب اہل یقین نے ہندوستان کو نور اسلام سے ایسا منور کردیا ہے کہ آپ کی تعلیم وتبلیغ کی بدولت جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی اولاد میں جب تک سلسلۂ ایمان واسلام کا جاری رہے گا اس کا اجر وثواب آپ کی بارگاہ باجاہ میں پہونچتا رہے گا۔

سیرالاولیاء نے آپ کے کچھ ملفوظات بھی درج کئے ہیں، خواجۂ بزرگ نے فرمایا کہ حق کو پہچاننے کی علامت خلق سے کنارہ کشی ہے اور معرفت میں خاموش رہنا ہے، اور فرمایا کہ جب ہم نے عالم ظاہر سے نکل کر نگاہ کی تو عاشق ومعشوق وعشق کو ایک ہی پایا یعنی عالم توحید میں وحدت ہی وحدت ہے۔

اور فرمایا کہ حاجی اپنے جسم (قالب) سے خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں مگر جو عارف ہیں وہ اپنے دِل (قلب) سے عرش اور حجاب عظمت کے گرد طواف کرتے ہیں اور ربّ کعبہ کی

رویت کے طالب ہوتے ہیں۔

اور فرمایا شقاوت کی نشانی یہ ہے کہ گناہ کرے اور پھر بھی مقبولیت کی امید رکھے، فرمایا کہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ فرشتوں کو فرمان دے گا کہ دوزخ کو دہانِ مار سے باہر نکالیں، پھر اسے دہکایا جائے گا پھر وہ ایک پھونک مارے گا تو سارا میدانِ حشر دھوئیں سے اٹ جائیگا اس دن کے عذاب سے جو اپنے تئیں بچانا چاہے اسے وہ عبادت کرنی چاہیئے جس سے بہتر عبادت اللہ کے نزدیک اور کوئی نہ ہو، لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ عبادت ہے، بے کسوں کی فریاد سننا، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا اور بھوکے کو کھانا کھلانا۔

اور فرمایا جس میں یہ تین خصلتیں ہوں سمجھ لو کہ وہ بے شک اللہ کا دوست ہے ایک دریا کی سی سخاوت دوسرے آفتاب کی سی شفقت تیسرے زمین کی سی تواضع۔

سیرالاولیاء کی تالیف فیروز تغلق کے زمانے میں ہوئی ہے اور اس کے آخر میں جو ایک تاریخ درج ہے جس سے فیروز شاہ تغلق کی تاریخ وفات ۷۹۰ھ برآمد ہوتی ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ امیر خورد اس وقت تک زندہ تھے اور انھوں نے کتاب کی تالیف سے فارغ ہونے کے بعد بھی ۲۵، ۳۰ برس تک اس پر نظر ثانی و اضافے کا کام جاری رکھا ہے، اس پر نگاہ کیجئے تو سیرالاولیاء میں جو کچھ ہے وہ بھی ہم عصر بیان نہیں ہے اور خواجہ بزرگ کے وصال سے تقریباً سوا سو برس کے بعد لکھا گیا ہے۔

میری تحقیق کے مطابق حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و ملفوظات میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم مآخذ سرور الصدور ونور البدور ہے جو آج تک نہیں چھپی ہے اور جس کے قلمی نسخے بھی اب ساری دنیا میں صرف دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں

حضرت خواجہ بزرگ سے لاکھوں انسانوں کو فیض پہونچا اور آج بھی اسی طرح جاری ہے اور آپ کی حیاتِ ظاہری کے زمانہ میں ہزارہا انسان بیعت ارادت کے شرف سے سعادت اندوز ہوتے مگر آپ کے خلفاء میں صرف تین نام ملتے ہیں، خلیفۂ اول حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ ہیں، جن کا انتقال اپنے پیر و مرشد کی حیات ہی میں ہوگیا تھا، دوسرا

خلافت خواجہ بزرگ اور قطب صاحب دونوں نے مل کر حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کو دی تھی، لیکن باباصاحب کو خلافت اولیٰ حضرت قطب صاحب سے پہونچی تھی اسلئے آپ ان کے ہی جانشین اور خلیفہ مانے جاتے ہیں تیسری خلافت سلطان التارکین ابواحمد شیخ حمیدالدین بن محمد سوالی ناگوری علیہ الرحمۃ کو ملی، یہ میدان ترک وتجرید کے ایسے یکہ تاز تھے کہ خود خواجہ بزرگ نے انھیں "سلطان التارکین لقب مرحمت فرمایا تھا، آپ نے طویل عمر پائی اور ۹ر ربیع الآخر ۶۷۳ھ میں وصال ہوا، مزار مبارک ناگور میں مصدر فیوض ومرجع خلائق ہے

شیخ حمیدالدین ناگوری فرمایا کرتے تھے کہ،

"اوّل مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانۂ مسلماناں آمد منم"

اور جیسا کہ ہم نے ابتدار میں ذکر کیا کہ دہلی کی فتح قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں ہوئی، اور یہی شیخ ناگوری کی ولادت کا سنہ ہے، اس حساب سے انھوں نے تقریباً ۸۴ سال کی عمر پائی، شیخ ناگوری عالم اور صاحب تصانیف بزرگ تھے، ان کی کتابیں حضرت نظام الدین اولیار کے زیر مطالعہ رہتی تھیں، اور انھوں نے کتابوں کے بعض اقتباسات اپنے قلم مبارک سے نقل کر رکھے تھے۔ جنھیں مؤلف سیرالاولیاء نے بھی اخذ کیا ہے ۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبارالاخیار میں شیخ ناگوری کی تصانیف کے بعض اقتباسات درج کئے ہیں اور یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سے ان کی ملاقات ہوئی ہوگی، شیخ ناگوری کے پاس دو طناب زمین تھی جس میں اپنے ہاتھ سے تخم ریزی کرتے تھے اور اس کی پیداوار سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے، ان کے فرزند شیخ عزیز الدین تھے جن کے تین بیٹے ہوئے، شیخ وحیدالدین ۶۲۲ھ (۱۲۲۴ء) میں انتقال فرماگئے تھے، دوسرے شیخ نجیب الدین ابراہیم تھے، انھوں نے دہلی جاکر حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں بھی کچھ وقت گذارا تھا، اور ان سے استفادہ کیا تھا، کہتے تھے :

: ایک دن میں شیخ نظام الدین کی خدمت میں گیا ہوا تھا ایک بوڑھے مولوی

صاحب بڑی سی پگڑی باندھے ہوئے آئے اور شیخ کی خدمت میں بیٹھ گئے، کہنے لگے حضرت! آخر قاضی عالم کو یہ قبولیت کہاں سے نصیب ہوئی ہے ہم یہاں سرائے میں پڑے رہتے ہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں اور وہ جیسے ہی آتے ہیں لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اعزاز و اکرام بھی کرتے ہیں آج ہی ایسا ہوا کہ فوراً انھیں آگے آگے لے گئے خوب نذریں ملیں اور اعزاز و اکرام الگ رہا:

حضرت نظام الدین، خاموشی سے مولوی صاحب کی گفتگو سنتے رہے اور کچھ نہیں فرمایا پھر وہ مولوی صاحب خود ہی کہنے لگے، میں نے سنا ہے کہ ناگور میں کوئی پیر تھے، ان کا نام شیخ حمید الدینؒ تھا، یہ قاضی عالم ان کے نظر یافتہ ہیں، جب مولوی صاحب نے یہ جملہ کہا تو حضرت نظام الدین، نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ صاحب انھیں کے پوتے ہیں، مولوی صاحب نے اٹھ کر میرے قدموں میں سر رکھ دیا۔

شیخ عزیز الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ فرید الدین چاک پران بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے ہم عصر تھے انھوں نے ایک بار صفر ۲۹، ھ (دسمبر ۱۳۲۸ء) کی ایک مجلس میں فرمایا کہ میں ،، سال سے وعظ کہہ رہا ہوں اور پہلی بار سات سال کی عمر میں منبر پر قدم رکھا تھا اس حساب سے ۲۹، ھ میں آپ کی عمر ۸۴ سال کی ہوئی اور ولادت کا سنہ ۶۴۵ ھ (۱۲۴۷ء) تسلیم کیا جائیگا ان کے والد شیخ عزیز الدین کا انتقال ۶۶۶ ھ اور ۶۷۷ ھ کے درمیان کسی وقت ہوا

شیخ فرید الدین ناگوری دہلی آتے رہتے تھے اور آخر عمر میں یہیں آکر بس گئے تھے ان کا انتقال ۴۴، ھ (۱۳۴۳ء) میں حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال سے نو سال کے بعد ہوا، آپ کی زندگی کے آخری ایام میں ۲۹، ھ اور ۴۴، ھ کے مابین آپ کی مجالس اور ملفوظات قلم بند کئے گئے جس میں آپ نے اپنے دادا شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات بھی بیان فرمائے ہیں اور اسی کا نام " سرور الصدور و نور البدور" ہے اس کا ایک قلمی نسخہ جھنجھنوں کے حضرت شاہ نجم الدین صوفی کی خانقاہ میں تھا جس کی ایک نقل ۱۳۰۱ھ میں تیار کی گئی اور وہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں محفوظ کر دیا گیا ہے، یہ ۳۵۹ اوراق کا نسخہ ہے اور اس کا ایک تہائی حصہ "سرور الصدور" پر مشتمل ہے باقی دو تہائی کتاب میں شیخ حمید الدین صوفی، شیخ عزیز الدین اور شیخ فرید الدین ناگوری علیہم الرحمۃ کے مکتوبات اور رسائل وغیرہ ہیں اور ان میں بھی بہت کار آمد مواد موجود ہے۔

ان مکتوبات و رسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین صوفی پہلی بار صفر ۶۸۱ھ (اپریل ۱۲۸۲ء) میں دہلی آئے تھے، اور یہاں سے انھوں نے اپنے بھائی شیخ نجیب الدین ابراہیم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ حضرت نظام الدین شیخ وقت ہیں، تم جب بھی مجھے خط لکھو، اپنی اور تمام اعزا کی جانب سے ان کی خدمت میں سلام ضرور لکھنا، اس میں ہرگز کوتاہی نہ ہو۔

در مکتوبات کہ ایں طرف بفرستند برائے شیخ الوقت شیخ نظام الملۃ والدین سلام بنویسند واز زبان یاران جملہ بجانب او سلام بنویسند تقصیر نکنند، مرد صاحب درد، در جملۂ دہلی جز او را نیافتم او صَلَّی اللّٰہُ بَرَکَاتِ اَنْفَاسِہٖ اِلٰی کَافَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ۔

حضرت نظام الدین اولیاء ان سے ملاقات کرنے کے لئے دوبارہ بنفس نفیس تشریف لے گئے اور ان کا وعظ سننے کا اشتیاق بھی ظاہر کیا، جس حجرے میں یہ ٹھہرے ہوئے تھے اُسے دیکھ کر بہت حیرت کا اظہار فرمایا کہ آپ اس تنگ و تاریک حجرے میں کیسے رہتے ہیں؟ پھر غیاث پور جاکر اپنے ایک خادم محمد صوفی کو بھیجا کہ وہ شیخ فرید الدین کا سامان لے آئے اور ان سے کہے کہ میرے حجرے کے اوپر اتنی جگہ ہے کہ آپ وہاں آرام سے ٹھہر سکتے ہیں، شہر میں جہاں کہیں حضرت نظام الدینؒ کو بلایا جاتا تھا آپ کہلا بھیجتے تھے کہ شیخ فرید ناگوری بھی میرے ساتھ آئیں گے، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالیٰ بسیار تقاضائے تذکیر می کند و این ضعیف چو الطاف و کرم او از جملہ گذشتہ است دفع نمی تواند گفت ان شاء اللہ تعالیٰ باحسن الاحوال میسر گردد

شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالیٰ وعظ کا بہت تقاضا کرتے ہیں اور چونکہ ان کا الطاف و کرم سب سے زیادہ ہے اس لئے یہ ضعیف انکار بھی نہیں کر سکتا، ان شاء اللہ تعالیٰ بہت اچھی طرح میسر ہوگا، شیخ نظام الدین نے فرمایا

شیخ نظام الدین فرمودہ بود ودو بار بریں ضعیف آمدہ بود، بغایت تعجب کرد کہ دریں حجرہ چہ گونہ می باشید؟ بعدازاں بدست حاجی محمد پیغام کرد کہ ایں جا موضع است بربالائے حجرۂ من اگر بیایند کرم کردہ باشند ودعاگوئے چوں ایں جا مسجد جمعہ نزدیک بود، بخدمت مولانا شرف الدین موضحی سلمہ اللہ رفتہ می باشد، عذرگفت، دریں مدت بخانہ مراجعت خواہد افتاد و زحمت دادہ نمی آید مع ہذا ہر کجا بدعوتے اورا بطلبند ایں ضعیف را بطلبند وانچہ ازکرم طبع ایشاں سزد از اکرام دریغ نداشت۔ حق سبحانہ وتعالیٰ توفیق حق گذاری الطاف ایشاں کرامت کناد۔"

تھا اور دو بار اس ضعیف کے پاس تشریف بھی لائے تھے، بہت تعجب کیا کہ تم اس کوٹھری میں کس طرح رہ رہے ہو؟ پھر حاجی محمد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ یہاں میرے حجرے کے اوپر ایک جگہ موجود ہے، اگر آپ یہاں آجائیں تو کرم ہوگا، مگر اس دعاگو نے اس لئے معذرت کرلی کہ یہاں سے جامع مسجد قریب ہے اور مولانا شرف الدین موضحی سلمہ اللہ کی خدمت میں بھی جانا ہوتا رہتا ہے، اس مدت میں گھر کو واپسی ہوجائے گی اور زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، علاوہ ازیں جہاں کہیں انھیں دعوت میں بلایا جاتا ہے اس ضعیف کو بھی بلا لیتے ہیں اور جو ان کی طبیعت کے شایانِ شان ہے عزت واکرام میں دریغ نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے الطاف وکرم کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسری بار شیخ فرید صوفی دہلی کب آئے اس کا علم نہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اس بار دہلی سے واپسی محرم ۶۸۷ھ (فروری ۱۲۸۸ء) میں ہوئی تھی، آخری سفر میں زن وفرزند کے ساتھ دوشنبہ ۱۲ رمضان ۷۳۰ھ کو دہلی پہونچے تھے، اس وقت دہلی بالکل اجڑ چکی تھی، سلطان محمد بن تغلق نے ساری آبادی کو یہاں سے دولت آباد منتقل کردیا تھا مگر ۷۲۹ھ میں ملتان میں کچھ شورش ہوئی، اسے دفع کرنے کی نیت سے محمد تغلق دہلی آیا ہوا تھا، اس نے شیخ فریدالدین صوفی کو بھی دولت آباد جانے کا حکم دیا اور یہ ۷۳۱ھ کے آخر میں وہاں تشریف لے گئے، اُس وقت حضرت برہان الدین غریبؒ اور امیر حسن علاء سجزی دہلویؒ

دونوں دولت آباد میں موجود تھے، اس لئے یقین ہے کہ ان بزرگوں سے بھی ملاقات رہی ہوگی۔

ملتان میں غیاث الدین تغلق کے متبنیٰ ملک ابراہیم کی بغاوت کو دبانے کے لئے محمد بن تغلق کو جو پاپڑ بیلنے پڑے اس سے یہ سبق ضرور مل گیا کہ دولت آباد میں بیٹھ کر شمالی ہندوستان پر حکومت کرنا آسان نہیں ہوگا، اس لئے پھر دہلی واپس جانے کا حکم جاری کر دیا گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فریدالدین ناگوری بھی شعبان ۷۳۲ھ (اپریل ۱۳۳۲ء) میں پھر دہلی واپس تشریف لے آئے، دہلی میں بجے منڈل سے مشرق کی جانب ان کا مکان تھا اور اب اسی جگہ مزار مبارک ہے۔ انتقال ہفتے کے دن یکم جمادی الاولیٰ ۷۳۴ھ (۸ رجنوری ۱۳۳۴ء) کو ہوا تھا۔

سرورالصدور میں حضرت شیخ حمیدالدین ناگوری علیہ الرحمۃ کے بارے میں ان کے فرزند شیخ عزیزالدین کی روایات بھی ہیں اور خود شیخ فریدالدین نے بھی اپنے مشاہدات ومعلومات درج کئے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حمیدالدین سوالی نے حج بھی کیا تھا اور وہ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین غریب نواز قدس سرہ کی خانقاہ میں امامت سے مشرف تھے، خواجہ بزرگ ان کی اقتدار میں نماز ادا فرماتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شخص کچھ پوچھنے یا وضاحت طلب کرنے کے لئے آجاتا تھا اور خواجہ بزرگ اسے شیخ حمیدالدین ناگوری کی طرف بھیج دیتے تھے، ایک بار خواجہ بزرگ اجمیر کے قلعے میں تشریف فرما تھے، ایک درویش آئے اور انھوں نے پوچھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو ایک تارک دنیا میں پائی جانی چاہئیں، حضرت خواجۂ خواجگان نے فرمایا کہ "شریعت میں تو صرف یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے کرنے کا حکم دیا ہے اسے کرے اور جن باتوں سے باز رہنے کو کہا ہے ان کے پاس نہ پھٹکے، ایسے شخص کو اگر کوئی تارک دنیا کہے تو بے جا نہ ہوگا مگر طریقت میں نو باتیں اور ہیں جب تک وہ پوری نہ ہوں کسی کو تارک دنیا نہیں کہا جا سکتا"۔ پھر آپ نے حضرت شیخ حمیدالدین صوفی ناگوری کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تم ان درویش کو "ترک" کے بارے میں تفصیل بتا دو، اور لکھ کر بھی دے دو تاکہ یہ کسی 'عالم خدا' کو دکھائیں اور پھر بہت سے مسلمانوں کو نفع پہونچائیں"

اب ان درویش کو شیخ ناگوری ؒ نے بتایا کہ صوفیائے چشت کے نزدیک 'ترک' کیا ہے۔ اوّل یہ کہ کسب نہ کرے، دوسرے قرض نہ مانگے، تیسرے یہ کہ اگر سات روز کا فاقہ ہو

تب بھی کسی کے سامنے اپنا راز فاش نہ کرے اور اس سے مدد طلب نہ کرے، چوتھے یہ کہ اگر بہت سا کھانا یا روپیہ یا غلہ یا کپڑا اسے مل جائے تو اگلے روز کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھے، پانچویں یہ کہ کسی کے حق میں دعائے بد نہ کرے، اگر کوئی بہت ستائے تو بس اتنا کہے کہ یا اللہ اپنے اس بندے کو راہِ راست دکھادے، چھٹے یہ کہ اگر کوئی اچھا کام بن پڑے تو اسے اپنے پیر کی شفقت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور حق تعالیٰ کی رحمت جانے۔ ساتویں یہ کہ اگر کوئی بُرا فعل سرزد ہو تو اسے اپنے نفس کی شومی سمجھے، خود کو برے اعمال سے بچائے رکھے اور اللہ سے ڈرتا رہے تاکہ آئندہ وہ خطا پھر سرزد نہ ہو، جب اس منزل تک پہنچ جائے تو آٹھواں مرحلہ یہ ہے کہ دن میں روزہ رکھے اور رات کو قیام کرے، نویں یہ کہ خاموش رہے اور صرف اسی وقت کلام کرے جب حاجت اصلی ہو، چنانچہ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہی ہے کہ بولنا حرام ہے، اور خاموش رہنا بھی حرام ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بات بولے جس کا مقصد خوشنودی حق تعالیٰ کا حصول ہو"

اس مختصر تقریر میں جو نو نکات پر مشتمل ہے، شیخ ناگوری نے اپنے پیر و مرشد کی ایما سے سلوکِ طریقت کا خلاصہ پیش کردیا ہے، باقی جو کچھ ہے وہ سب اس کی تفسیر ہے، یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ "ترک" پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں "ترک دنیا" صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اوامر و نواہی کا خیال رکھیں اور خدا نے اور اس کے رسول نے جن باتوں کو چھوڑنے کیلئے کہا ہے ان کے پاس نہ پھٹکیں۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی بھی اپنے مریدوں سے یہی فرمایا کرتے تھے کہ

"وصیت ہمین است کہ انچہ خدا و رسولِ خدا منع کردہ است آں نکنی"

شیخ ناگوری نے فرمایا کہ کل خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تم ہمارے لئے کیا لے کر آئے؟ یہ پوچھے گا کہ بتاؤ ہماری خاطر تم نے کیا چیز ترک کی تھی؟

یہ "الدین یسر" کے مصداق وہ فلسفہ ہے جس کا عام مسلمان کو مکلف کیا گیا ہے، اس کے بعد نو مرحلے اپنے شیخ کی نیابت میں حضرت ناگوری نے بیان فرمائے، وہ دراصل ایک درویش سے مطالبہ ہے یعنی ان شرائط کی تکمیل کی توقع ان خواص سے کی جائے گی جو روح شریعت تک

پہونچنے کے آرزومند ہیں۔

طبقہ علماء ہی میں نہیں اس وقت صوفیا میں بھی ایسے بزرگ تھے جنھوں نے دنیا جمع کر رکھی تھی اور اس کی بدولت ان پر وہ آفتیں آرہی تھیں جو دولت کے ساتھ آنی چاہئیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالم اسلام میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ غنا افضل ہے یا فقر، شیخ سعدی نے بھی گلستاں میں ۔ جدالِ سعدی با مدّعی ، کے عنوان سے پورا معرکہ فقر و غنا کے موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا، اور اس بارے میں وہ دوسرے درویشوں سے مراسلت بھی رکھتے تھے چنانچہ ناگور میں ایک تاجر تھا وہ ہر سال تل لے کر ملتان کی منڈی میں بیچنے جاتا تھا اور وہاں سے روئی لے کر ناگور آتا تھا، وہ شیخ حمید سوالی کے خطوط حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے نام لے جاتا تھا اور ان کا جواب لاکر حضرت کو دیا کرتا تھا، ان خطوط میں شیخ ناگوری رہ نے حضرت ملتانی کی دولت مندی پر اعتراضات کئے تھے، انھوں نے جواب میں لکھا کہ خدا نے متاع دُنیا کو متاع قلیل فرمایا ہے " قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ" اور میرے پاس اس کا اقلِ قلیل ہے، اس پر شیخ ناگوری نے پھر کچھ لکھا تو حضرت ملتانی نے جواب نہیں دیا۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب شیخ نجم الدین صغریٰ نے شیخ جلال تبریزیؒ پر اتہام لگایا اور التمش کے دربار میں ان کے خلاف محضر مقرر ہوا اور انھوں نے شیخ بہاء الدین ملتانی کو اپنا گواہ بنا کر پیش کیا تو اس محفل میں صوفی حمید الدین ناگوری رہ بھی موجود تھے، انھوں نے شیخ ملتانی سے کہا کہ جہاں کہیں مال ہوتا ہے وہاں مار (سانپ) بھی رہتا ہے، اس میں کیا حکمت ہے ؟ چنانچہ کہاوت بھی ہے کہ " گنج با مار و گل با خار" مال اور مار میں کچھ صوری مناسبت بھی ہے مگر معنوی مناسبت کیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آیا، شیخ ملتانی نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں میں کوئی صوری مناسبت نہیں ہے البتہ معنوی مناسبت موجود ہے اور وہ یہ کہ اپنے زہر کی وجہ سے مار (سانپ) مہلک ہے اور مال بھی اکثر لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، شیخ ناگوری نے فرمایا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مال اور مار ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں تو جو مال جمع کرتا ہے، وہ گویا مار جمع کر رہا ہے۔ شیخ ملتانی سمجھ گئے کہ یہ میری دولت کی طرف اشارہ ہے، فرمانے لگے کہ اگر کسی کو سانپ کا منتر یاد ہو تو اسے سانپ کا زہر کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا

شیخ ناگوری نے کہا کہ ایک پلید، زہردار اور پُرخار جانور کو پالنا اور پھر اس کا منتر یاد رکھنے کے جھنجھٹ میں پھنسنا کون سی دانائی ہے؟ جب شیخ ملتانی نے دیکھا کہ ان کی دلیل قوی ہوتی جارہی ہے تو کہنے لگے کہ یہ الزام تو مجھ پر ہی نہیں، میرے پیر و مرشد پر بھی عائد ہوتا ہے، اسی وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کی روح پرفتوح حاضر ہوئی اور کہا کہ بہاء الدین ان سے یہ کہدو کہ تمھاری درویشی میں ایسا حسن و جمال نہیں ہے جسے نظر لگنے کا اندیشہ ہو اور ہماری درویشی میں اتنا جمال کمال ہے کہ اسے نظر گذر سے بچانے کے لئے ٹیکا بھی درکار ہے، اس لئے ہم نے "وسمۂ سیاہی دنیا" اسکے چہرے پر لگا دیا ہے، جب شیخ ملتانی نے حضرت ناگوری سے یہی بات کہی تو انھوں نے فرمایا:

"سبحان اللہ آپ کی درویشی میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی درویشی سے زیادہ تو حسن و جمال نہیں ہے۔" آنحضرت ﷺ نے غنا پر فقر کو ترجیح دی ہے اور فرمایا "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَ الْفَقْرُ مِنِّیْ"؛ اس پر شیخ ملتانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ملتانی کے ایک صاحبزادے ناگور تشریف لائے تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ حمید الدین ناگوری جمعہ کی نماز میں موجود نہیں تھے، اس پر انھوں نے خاصا ہنگامہ کیا تو شیخ ناگوری رح نے فرمایا کہ ناگور مصر کے حکم میں نہیں ہے اس لئے یہاں جمعہ کا وجوب بھی نہیں ہے۔ مگر انھوں نے علماء کو ساتھ لاکر خاصی بحث کی، شیخ نے فرمایا کہ تم نے خواہ مخواہ ہمارے اوقات میں خلل ڈالا ہے۔ اتنی دیر کے لئے۔ "ماترا ہمیں درویشاں دادیم"

شیخ حمید کے انتقال کے بعد حضرت ملتانی کے یہ فرزند کہیں جارہے تھے، راستے میں ایک ڈاکو نے انھیں گرفتار کرلیا اور کہا کہ تمھیں اپنے والد ماجد کی چھوڑی ہوئی جائداد سے اتنا مال ملا ہے وہ سب لاؤ جب رہا کروں گا، انھوں نے اپنے بھائی شیخ صدرالدین ملتانی کو قید کا ماجرا اور رہائی کی شرط لکھی وہاں سے مال آیا تب انھیں نجات ملی۔

حضرت ملتانی رح کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ملتانی علیہ الرحمۃ ۲۰ ۷ ھ میں سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی دعوت پر دہلی آئے تھے جس نے انھیں حضرت نظام الدین اولیاء کا اثر و رسوخ ختم کرنے کی نیت سے بلوایا تھا مگر اسی سال خسرو خاں نے سلطان کو قتل کردیا

اور خود بادشاہ بن بیٹھا، حضرت شیخ رکن الدین پھر بھی چار سال تک دہلی میں رہے، انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی اور اس وقت یہ فرمایا تھا کہ:

"امروز مرا تحقیق شد کہ چہار سال کہ مرا در دہلی داشتند مقصود ایں بود کہ بہ شرف امامت نماز جنازہ سلطان المشائخ مشرف شوم۔" (سیر الاولیاء)

لیکن دہلی میں ان کے طویل قیام کا سبب معلوم ہوا کہ حضرت شیخ رکن الدین ملتانی خسرو خاں کے محل کے زینے سے گر پڑے تھے جس سے چہرۂ مبارک پر بہت چوٹ لگی تھی اور پاؤں کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی یہ ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) کا واقعہ ہوگا کیونکہ اسی سال چار ماہ اور چند روز کے لئے برسر اقتدار رہ کر غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں خسرو خاں مارا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس مجبوری کی وجہ سے آپ کو ایک طویل عرصے تک دہلی میں قیام کرنا پڑا ہوگا۔

شیخ فریدالدینؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے سنا ہے حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے ؎

ہاں اے دلِ گرم، بادمِ سرد بساز   با دیدۂ لعل و بارُخِ زرد بساز
فریاد رسے چو نیست فریاد مکن   درماں چو نمی بینی، با درد بساز

اور فرمایا کہ شیخ جیو نے یہ اشعار بھی اکثر، خواجہ جیو، کو پڑھتے سنا ہے ؎

اے دل غمِ آں مخور کہ فردا چہ شود   زیرا کہ ہمہ خوشی دراں پئے بشود
حکمے کہ بکرداست خداوندِ جہاں   دانم چہ شود واگر ندانم یہ شود!

۵ رجمادی الثانی ۷۲۶ھ کی مجلس میں شیخ فرید ناگوری نے فرمایا:-

شیخ بزرگ قدس اللہ روحہ العزیز امامت خواجہ جیو ہم کردے، چوں خواجہ جیو اجمیر فرود آمد ملکے کہ دراں وقت بود خواجہ جیو را مرید شد و دختر کے بخدمت خواجہ فرستاد و خواجہ جیو دراں وقت معمر شدہ بود میگویند عمر ایشاں بنود سال رسیدہ بود، خواجہ جیو را ازاں دختر دو فرزنداں شدند تا وقتیکہ شیخ بزرگ را گفت: حمید چیست اینکہ ہرگاہ کہ مارا دراں جوانی کہ مجرد بودہ ایم حاجتے بشدے دعا میکردیم و درحال اجابت شدے و ایں ساعت کہ پیر شدیم و فرزندان آمدند ہرگاہ کہ حاجتے می شود بسیار می باید دعا ہم کردہ شود ولیکن بعد از دیر تر باجابت

می رسد و حاجت بر می آید ایں حکمت چیست ؟ شیخ بزرگ فرمود گفتم یا شیخ شمارا بہتر روشن است از قصۂ مریم، دراں وقت کہ مجرّد بود بے خواست او میوۂ زمستانی بتابستان می رسید و میوۂ تابستان بزمستان می آمد کہ دلش بخدا یکتا بود، چوں عیسیٰ علیہ السلام بزاد، مریم علیہا السلام منتظر بود کہ ہم چناں خواہد رسید فرمان آمد وَهُزِّيْ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ چوں دلت باو یکتا بود ــ نخواستیم کہ برائے نان دود لہ مانی "

از شیخ خواجہ چیو چوں ایں بشنید ند پسندیدند"

سرور الصدور سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں (۶۲۳ھ۔ ۶۰۷ھ) چالیس یاروں کا قافلہ ایک ساتھ دہلی میں آیا تھا، ان میں سے ہر ایک کو سلطان نے جائزہ گراں دیا تھا، ان میں شیخ نجیب الدین نخشبی بھی تھے، انھوں نے اپنا حصہ کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کردیا اور کچھ دوستوں کی ضیافت میں، التمش نے انھیں اپنا منھ بولا باپ بنا لیا تھا اور دہلی کی شیخ الاسلامی ان کو تفویض کی، اس لئے دہلی میں رہنے لگے، دوسرے احباب مختلف شہروں میں جاکر بس گئے، حضرت شیخ معین الدین اجمیر میں تشریف لے آئے، جب شیخ نجیب الدین دہلی کے شیخ الاسلام تھے، خواجہ بزرگ ان سے ملاقات کے لئے دہلی تشریف لائے تھے اور شیخ حمید الدین ناگوری بھی دہلی آیا کرتے تھے، ایک بار کہیں دعوت میں یہ سب بزرگ موجود تھے، شیخ نجیب الدین نخشبی، شیخ معین الدین، شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ قطب الدین بختیاری، اور شیخ حمید الدین صوفی ناگوری، اس وقت موضوع گفتگو یہ تھا کہ اس زمانے میں "شیخ وقت" کون ہوسکتا ہے؟ اور کون ہے؟، سب اپنی اپنی رائے ظاہر کررہے تھے، شیخ حمید الدین ناگوری نے کہا کہ اس زمانے میں شیخ وقت "جیتل" (پیسہ) ہے، سب حضرات کہنے لگے کہ شیخ! ہم سنجیدگی سے بات کررہے ہیں، اور تم مذاق میں جواب دے رہے ہو، شیخ ناگوری نے کہا کہ میں بھی سنجیدگی سے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس زمانے میں جس کے پاس جیتل زیادہ ہوں ، وہی "شیخ وقت،، مانا جاتا ہے۔ ان کا یہ پُرمعنی فقرہ سن کر سب خاموش ہوگئے۔

شیخ حمید الدین صوفی نے ایک بار ۵/ جمادی الاولیٰ ۶۶۲ھ کو فرمایا کہ میرے

تین پیر ہیں۔ ایک پیر ارادت حضرت شیخ معین الدین اجمیری، دوسرے پیر صحبت مولانا شمس الدین حلوائی۔ تیسرے پیر خرقہ شیخ حمید الدین محمد جوئنی۔

لیکن انھیں حضرت خواجہ بزرگ غریب نواز سے بھی خرقہ ارادت ملا تھا اور وہ تبرکات ان کے پوتے شیخ فرید الدین صوفی کے پاس محفوظ تھے، جمال الدین کلدنی متصرف ناگور کو انھوں نے ایک کلاہ بھیجی اور اسکے ساتھ خط لکھا تھا:

"کلاہے کہ ایں ضعیف را از شیخ رسیدہ است و شیخ را از خدمت اجل شیخ معین الدین سجزی قدس اللہ روحہ رسیدہ است فرستادہ شد باید کہ بحرمت و تعظیم تمام بر سر نہند و دوگانہ بگذارند و مرادے کہ پیش دل آید بخواہد یقین است کہ بیابد بفضل اللہ۔

حضرت خواجہ بزرگ کا خرقہ بھی شیخ فرید الدین صوفی تک پہنچا تھا، انھیں بیعت کرتے وقت یہ اقرار لیا تھا کہ

"درویشی را دوست دارم و درویشاں را خدمت کنم"

پھر اپنا جبہ اتار کر پہنایا اور کہا۔

"ایں خرقہ شیخ است کہ بمن رسیدہ بود ترا می پوشانم و ایں ضعیف را پوشانیدند"

غرض یہ کتاب حضرت خواجہ بزرگ اور ان کے ایک جلیل القدر خلیفہ کے حالات و ملفوظات کا سب سے اہم اور قابل قدر ماخذ ہے، اس میں ایک کتاب شرف الانوار کا حوالہ بھی آیا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات پر مشتمل تھی اور فصل اور نوع کے عنوان سے مختلف فصول و ابواب میں تقسیم کر کے لکھی گئی، اب یہ ناپید ہو چکی ہے۔ اگر کہیں اس کا نسخہ دستیاب ہو جائے تو اس میں بھی حضرت خواجہ اجمیریؒ کے بارے میں بہت قیمتی معلومات ملیں گی، اور یہ حضرت کے حالات میں سرور الصدور سے بھی قدیم ماخذ ہوگی۔